روحِ نگارش

علمی، ادبی اور تاریخی مقالات کا مجموعہ

مُصنّفہ

پیام شاہجہان پوری

شائع کردہ

عشرت پبلشنگ ہاؤس عقب پان والی گلی ہسپتال روڈ انارکلی لاہور

وہ کتابیں

اور

رسائل و اخبارات جو اس کتاب کی تصنیف کے دوران میں زیر مطالعہ رہے

تاریخ سلطنت خداداد میسور (محمود بنگلوری)، سیرت سید احمد شہید (سید ابو الحسن علی ندوی)، آثار جمال الدین افغانی (قاضی عبد الغفار، مقالات جمال الدین (مبارز الدین رفعت)، حیات جاوید (مولانا حالی)، حیات محمد علی جناح (سردار محمد خاں)، حیات قائد اعظم (رئیس احمد جعفری) حسرت موہانی (عبد الشکور ایم اے)، حسرت سیاست داں اور حسرت شاعر (حبیب الرحمن پیام) "نگار" کا حسرت نمبر، سیرت محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق (مولانا عبد الماجد دریاآبادی) روزنامہ "امروز" کا لیاقت نمبر، تاریخ ادب اردو مترجمہ (مرزا محمد عسکری)، مضامین چکبست دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی)، میسور میں اردو (محمد سعید عبد الخالق)، مدراس میں اردو (نصیر الدین ہاشمی)، پنجاب میں اردو (حافظ محمود شیرانی)، داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری)، ناول کی تاریخ اور تنقید (علی عباس حسینی)، ہمارے افسانے (وقار عظیم)، "تنقیدی اشارے" (آل احمد سرور) نئے اور پرانے چراغ (آل احمد سرور) اردو شاعری پر ایک سرسری نظر (پروفیسر کلیم الدین)، تنقیدی جائزے (احتشام حسین) تنقیدی حاشئے (مجنوں گورکھپوری)، تنقیدی زاویئے (عبادت بریلوی)، اردوئے قدیم (شمس اللہ قادری)، اردو ڈرامہ (سید بادشاہ حسین)، شعراء کے مختلف دواوین اور کلیات۔ افسانوں کے متعدد مجموعے اور ناول۔

(مطبوعہ:- نامی پریس لاہور)

فہرست مضامین

انتساب

اپنے محسن

اپنے مشفق

اپنے پیارے

رشید اختر ندوی

کے نام

از

پیام شاہجہانپوری

حرفِ اوّل

میرے وہ دوست جو مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، جب میرے مضامین کا یہ مجموعہ دیکھیں گے تو انہیں تعجب ہوگا ممکن ہے انہیں سے بعض ناراض بھی ہوں کیونکہ اسطرح اُنکی توقعات کو ٹھیس پہونچے گی۔ مگر کاش میں انہیں سمجھا سکتا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قدرت اس قسم کی ستم ظریفیاں کرتی ہی رہتی ہے۔ انسان کی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں جنہیں صرف شاعری پورا نہیں کرسکتی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے شاعر بھی انسان ہوتا ہے جو اس پست معاشرے میں مرنے کے لئے زندہ رہتا ہے اُس کی بھی کچھ ضروریات ہوتی ہیں جنہیں صرف شاعری پورا نہیں کرسکتی۔ اسلئے مجبوراً وہ کچھ اور میدان بھی تلاش کرتا ہے۔

اب مختصراً اس کتاب کی رودادِ تصنیف بھی سُن لیجیے۔ ستمبر ۱۹۵۲ء میں جب میں ہفت روزہ "برق" کا ایڈیٹر تھا۔ رسالہ مذکور کے سلسلے میں مکرم محمد یعقوب خاں صاحب پروپرائٹر "عشرت پبلشنگ ہاؤس" سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو میں تاریخ کی بات چل نکلی۔ جب خانصاحب کو معلوم ہوا کہ مجھے تاریخ سے جنون کی حد تک شغف ہے تو انہوں نے فرمایا کہ میں اُن کے ادارہ کے لئے تاریخ پر کچھ لکھوں۔ میں نے اُن کے مقرر کردہ موضوع پر دو کتابیں لکھ کر پیش کیں۔ جو آپ میں سے بعض حضرات تک پہونچ چکی ہوں گی۔

ابھی میں تاریخ کی دوسری کتاب لکھ رہا تھا کہ موصوف نے فرمائش کی۔ میں اُن کے لئے علمی و ادبی اور تاریخی مضامین کا ایک مجموعہ بھی تصنیف کردوں۔ تاریخ کی دوسری کتاب لکھ کر اُن کے اس ارشاد کی تعمیل میں مصروف ہوگیا۔ دو ماہ کے قلیل عرصے میں کتاب

لکھ کر "روح نگارش" کے نام سے انہیں پیش کردی جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے
میں نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب کی زبان زیادہ سے زیادہ صاف سُلجھی ہوئی
اور عام فہم ہو۔ ہر موضوع کے صرف وہی حصے بیان کئے جائیں جو موضوع سے قریبی
تعلق رکھتے ہوں۔ تاکہ تھوڑے وقت میں کام کی تقریباً ساری باتیں بیان ہو جائیں۔
میں نے حتی الامکان عالمانہ اصطلاحوں سے گریز کیا ہے لیکن پھر بھی بعض مقامات پر
خصوصاً شعر و ادب کے حصے میں بعض علمی و ادبی اصطلاحیں استعمال کرنی پڑیں۔ مگر
اُن کے لئے میں مجبور تھا کیونکہ اُن سے زیادہ آسان اور عام فہم الفاظ جو مفہوم کا پورا
طرح احاطہ کرتے ہوں مجھے نہیں مل سکے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں ذرا اور کُھل کر لکھوں اور ہر موضوع کی جزئیات تک
بیان کردوں مگر ناشر صاحب نے سطروں بلکہ صفحات تک کی قید لگادی تھی اور میں
اُس قید میں گرفتار تھا۔ لیکن پھر بھی اس کتاب میں آپ کو ہر موضوع سے متعلق ضروری
اور مستند معلومات ملے گی۔ جس سے طالبانِ علم کے علاوہ عام لوگ بھی استفادہ
کرسکیں گے ؛

پیام شاہجہانپوری
۴ر جنوری ۱۹۵۵ء

۲۷۔ میکلوڈ روڈ
لاہور

سلطان ٹیپو شہید

ابتدائی حالات

سلطان ٹیپو کے جدِامجد شیخ ولی محمد سرزمین عرب سے ہندوستان آئے تھے اور گلبرگہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ سلطان ٹیپو انہیں شیخ ولی محمد کے پڑپوتے نواب حیدر علی والئی میسور کے بیٹے تھے۔ سلطان ٹیپو کی پیدائش کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ نواب حیدر علی کے یہاں اولاد نہیں ہوتی تھی چنانچہ انہوں نے ارکاٹ میں مدفون ایک بزرگ حضرت ٹیپو مستانؒ کے مزارِ مقدس پر دُعا مانگی کہ خدا مجھے اولاد عطا فرمائے۔ نواب کی دُعا بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہوئی اور ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۰ء کو شنبہ کے روز اُن کے یہاں ایک بچّہ پیدا ہوا۔ جس کا نام حضرت ٹیپو مستانؒ کے نام کی نسبت سے ابوالفتح فتح علی ٹیپو سلطان رکھا گیا۔

تعلیم و تربیت

جب ٹیپو سلطان نے اپنی عمر کے پانچویں سال میں قدم رکھا تو نواب حیدر علی نے اُن کی تعلیم کیلئے لائق اُستادوں کو مامور کیا۔ جنہوں نے سلطان کو عربی و فارسی کی تعلیم دی۔ فنونِ سپہ گری، شہ سواری اور تیر اندازی کی تعلیم کے لئے بھی ان فنون کے ماہروں کو سلطان کا اُستاد مقرر کیا گیا۔ سلطان کی خداداد صلاحیتوں بے مثل ذہانت اور قابل اُستادوں کی توجہ نے انہیں پندرہ سال کی عمر میں فنِ سپہ گری کا ماہر اور عدیم النظیر جرنیل بنا دیا۔

جب سلطان کی عمر پندرہ سال کی ہو گئی اور اُنہوں نے سپہ گری سے متعلق تمام

فنون میں مہارت حاصل کرلی تو نواب حیدر علی نے انہیں اپنی نگرانی میں لے کر رموزِ جہان بانی اور فنونِ جنگ کی عملی تربیت دی اور متعدد لڑائیوں میں اپنے ساتھ رکھ کر میدانِ جنگ کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔

جنگ میں پہلی بار شرکت

نواب حیدر علی کی آرزوؤں کا مرکز اور اُمیدوں کا سہارا اب پروان چڑھ چکا تھا۔ نواب نے جس محبت اور توجہ سے اُس کی پرورش کی تھی سلطان نے اُسی قدر محنت اور توجہ سے اپنے آپ کو اپنے قابل اور عالی حوصلہ باپ کا حقیقی وارث ثابت کر دکھایا تھا۔ جہاں دیدہ باپ ہونہار بیٹے کے تیور دیکھ کر اندازہ کر چکا تھا کہ اس کا تدبر و فراست اور بازوؤں کی صلابت دشمنوں سے لوہا منوا کر چھوڑے گی اور اب یہ اس قابل ہو چکا ہے کہ دشمن کی فوجوں کو روئی کے گالوں کی طرح دُھنک کر اُڑا دے گا۔ چنانچہ نواب حیدر علی نے ۱۷۶۷ء میں انہیں فوجوں کا باقاعدہ کپتان بنا کر میدانِ جنگ میں بھیج دیا۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب نواب مرہٹوں سے نبرد آزما تھا۔ اُن کے سردار ترمک راؤ نے میسور کی حدودِ سلطنت پر حملے کر کے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ چنانچہ نواب حیدر علی نے سلطان ٹیپوؒ کو آٹھ ہزار سوار اور بائیس توپیں دے کر ترمک راؤ کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ سلطان پائین گھاٹ پہنچ کر میدان کاویری میں خیمہ زن ہو گیا۔ اُس وقت مرہٹہ فوجیں دھرپوری کو تاراج کر رہی تھیں۔ سلطان بھی مرہٹہ لباس پہن کر لوٹ مار میں شریک ہو گیا۔ مگر جب مرہٹے مالِ غنیمت لے کر واپس جانے لگے تو سلطان نے اپنی فوجوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس حملے میں مرہٹوں کا بے حد جانی نقصان ہوا۔ اور وہ شکست کھا کر میدان سے بھاگ نکلے۔ اس فتح میں چار ہزار گھوڑے، سینکڑوں بیل، اونٹ، ہاتھی اور بے شمار اسباب سلطان کے ہاتھ لگا جسے لے کر وہ مارگڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایک اور معرکہ

سلطان ٹیپو ابھی مارگڑی ہی میں مقیم تھا کہ مرہٹی فوج کے لئے سامانِ رسد لے جانے والا ایک قافلہ مارگڑی میں آترا۔ اس قافلے میں ہزاروں ہاتھی، اونٹ، غلہ اور خزانہ بھی تھا اور دس ہزار مسلح سوار اس کی حفاظت کے لئے ساتھ تھے۔ سلطان نے ایک رات شب خون مار کر مرہٹہ فوجوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔ تھوڑے سے سپاہی مرہٹہ جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوسکے اس قافلہ کا بھی سارا مال و اسباب سلطان کے ہاتھ لگا۔

انگریزوں سے پہلی جنگ

ٹیپو سلطان کی ان فتوحات نے اُس کا حوصلہ بلند کر دیا۔ ادھر نواب حیدر علی نے بھی اُس کی شجاعت اور مردانگی دیکھ کر اب اسے اہم مہمات پر بھیجنے کا فیصلہ کیا اور انگریزوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ نظام، مرہٹہ اور انگریز تینوں نواب حیدر علی سے خائف تھے۔ چنانچہ ان تینوں نے متحد ہو کر ۱۷۶۷ء میں نواب حیدر علی کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ نواب نے سلطان ٹیپو کو سات ہزار سپاہی دے کر دیکر نگو کی طرف بھیجا۔ سلطان نے قلعہ پر اس بے جگری سے حملہ کیا کہ انگریز حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلے۔ انگریزی فوج کا سپہ سالار اپنی فوج کو اُسکے حال پر چھوڑ کر بھاگا اور جہاز میں سوار ہو گیا۔ اس کامیابی کے بعد نواب حیدر علی نے سلطان کو مدراس پر حملہ کرنے کا حکم دیا جو انگریزی فوج کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔ سلطان نے مدراس پر حملہ کر کے وہاں کی انگریزی فوجوں کا بھی قافیہ تنگ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جب ٹیپو سلطان مدراس کے قریب دجوار کے علاقوں کو تاراج کرتا ہوا مدراس پہونچا اور اُس نے قلعہ سینٹ جارج پر حملہ کیا تو انگریز دہشت زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ گورنر مدراس تو اس قدر حواس باختہ ہوا کہ گھبراہٹ کے عالم میں اپنی ٹوپی اور تلوار میز پر چھوڑ کر ہی بھاگ کھڑا ہوا جہاں بیٹھا ہوا وہ محمد علی والا جاہ نواب کرناٹک کے ساتھ نواب حیدر علی کو شکست دینے کے منصوبے پر غور کر رہا تھا۔ آخر

انگریزوں نے نواب حیدر علی کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا اور نواب کی پیش کردہ شرائط قبول کر کے صلح کر لی - انگریزوں کے ساتھ میسور کی پہلی جنگ میں نواب حیدر علی کی فتح بہت کچھ سلطان ٹیپو کی جرأت و مردانگی کی رہین منت تھی -

شادی

نواب حیدر علی کے تینوں دشمن یعنی نظام، مرہٹے اور انگریز شکست کھا کر گرد جھاڑتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے - ادھر ٹیپو بھی سن بلوغت کو پہونچ چکا تھا - اس لئے نواب نے موقع مناسب دیکھ کر سنہ ۱۷۷۴ء میں امام صاحب بخش نائطہ کی لڑکی سے سلطان کی شادی کر دی -

انگریزوں سے دوسری جنگ

سنہ ۱۷۷۴ء میں سلطان کی شادی ہوئی اور تین سال کے بعد سنہ ۱۷۸۰ء میں انگریزوں سے دوسری بار جنگ شروع ہو گئی - اس جنگ میں فوجوں کا افسر اعلیٰ گو نواب حیدر علی ہی تھا مگر انگریزوں کی پے در پے شکستوں اور خصوصاً کرنل بیلی اور سر آئر کوٹ کی عبرتناک شکست سلطان ٹیپو ہی کی شجاعت اور شمشیر زنی کا کارنامہ ہے - اس دوسری جنگ کے سلسلے میں جتنی چھوٹی اور بڑی جنگیں ہوئیں تقریباً ان سب میں سلطان ٹیپو نواب حیدر علی کے دست راست کی حیثیت سے شریک رہا اور ہر معرکہ میں انگریزوں کو شکست پر شکست دیتا رہا - اسلئے یہ کہنا بے جا نہیں - کہ اگر لڑائیوں میں سلطان ٹیپو نواب حیدر علی کے ساتھ شریک نہ ہوتا تو نواب موصوف کی کامیابی میں شبہ تھا -

سلطان کی تخت نشینی

ابھی یہ جنگ جاری تھی کہ نواب حیدر علی سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے - اور ۲۰ محرم سنہ ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۲ء کو سلطان ٹیپو مسند آرائے حکومت ہوئے - سلطان نے میر صادق کو اپنا دیوان اور پورنیہ کو وزیر مال مقرر کیا - نواب حیدر علی کی وفات کی خبر

سُن کر امرائے سلطنت نے سازشیں اور بغاوتیں شروع کر دیں اور نواب حیدر علی کے بے باک ایاز خاں نے ملیبار میں علم بغاوت بلند کر کے کوڑیال بندر اور نگر کے علاقے انگریزی فوجوں کو دیدیئے۔ سلطان ٹیپو کے عزم وہمت اور اُس کے تدبر کے امتحان کے لئے یہ بہت نازک گھڑی تھی۔ ایک طرف نظام دوسری طرف مرہٹے تیسری طرف انگریز اُس کے خلاف برسرپیکار تھے۔ اُس پر ستم یہ کہ اندرونِ ملک میں امرائے سلطنت سازشیں اور بغاوت کر کے سلطان کے خلاف فضا ہموار کر رہے تھے اور حالات کو انتہائی ناساز گار بنا رہے تھے مگر واقعات شاہد ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ سلطان ٹیپو نے غیر معمولی عزم وہمت اور تدبر و فراست سے کام لے کر ایک ایک بغاوت کو فرو کر دیا۔ تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا اور فوج لے کر بنفس نفیس ہر مورچہ پر انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے پہلے چندر نگر اور پھر کوڑیال بندر کے راستے میں انگریزی فوج سے نبرد آزما ہو کر ان کی پیش قدمی کا دندان شکن جواب دیا۔ ان جنگوں میں انگریزوں کی بے شمار فوج کٹ گئی۔ بکثرت گرفتار کر لی گئی اور باقی شکست کھا کر میدان جنگ سے بھاگ نکلی۔ آگے بڑھ کر سلطان نے کوڑیال بندر پر جو انگریزی فوج کے قبضے میں تھا پوری شدت سے حملہ کیا باوجودیکہ اُس وقت غضبناک بارش ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی سلطان نے اپنی فوجوں کو آگے بڑھا دیا اور چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ انگریزی فوج کا سپہ سالار جنرل میتھون گرفتار ہو گیا۔ اس طرح کرناٹک کا تمام علاقہ سلطان ٹیپو کے قبضے میں آگیا۔ یہ دیکھ کر انگریز گھبرا گئے اور اُنہوں نے سلطان سے صلح کی درخواست کر دی جسے اُس نے منظور کر لیا۔

نظام اور مرہٹوں سے معرکہ

حیدر آباد کے نواب نظام الملک اور مرہٹے شب و روز اسی دھن میں

رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اپنا اقتدار بڑھائیں۔ اُن کے راستے میں پہلے نواب حیدر علی اور پھر اُن کا مدبّر اور شیر دل بیٹا سلطان ٹیپو بہت بڑی رُکاوٹ تھا۔ وہ دونوں تمام عمر نواب حیدر علی سے لڑتے رہے مگر انجام کار ذلت ناک شکستیں اُٹھانی پڑیں۔ اب وہ سلطان ٹیپو کو مٹانے پر کمربستہ ہو گئے۔ گو انگریزوں کے ساتھ مل کر نظام اور مرہٹہ دونوں سلطان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے تھے اور داغِ ناکامی لیکر میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کے بہت سے علاقے سلطان کے قبضے میں آچکے تھے۔ اس فتح کے بعد دُور دُور تک سلطان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اُن کی آرزوؤں کے برعکس سلطنتِ خداداد میسور حیرت انگیز ترقی کر رہی تھی۔ مرہٹے جو اسلامی سلطنت کو مٹا کر ہندو راج کے خواب دیکھ رہے تھے۔ انہیں سلطان ٹیپو کا عروج کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نظام علی خاں سے ساز باز کر کے سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اگر قلعہ دھاڑواڑ کے کمانڈر عیدر بخش سلطان سے غداری کر کے دھاڑواڑ کے علاوہ گولکنڈہ، نرکنڈہ اور دریائے بھدرہ کے اس پار کا تمام علاقہ نظام اور مرہٹوں کے حوالے نہ کر دیتا تو سلطان کے ان متحدہ دشمنوں کو قدم قدم پر خون ریز جنگوں کا سامنا کرنا پڑتا اور شاید وہ پہلی منزل ہی پر شکست کھا کر فرار ہو جاتے۔ مگر ان علاقوں کے نکل جانے کے باوجود سلطان کے عزم و حوصلہ میں ذرہ بھر فرق نہ آیا اور وہ نظام و مرہٹوں کی فوجوں کی سرکوبی کے لئے لشکر جرار لے کر اس شدت سے حملہ آور ہوا کہ دونوں کی فوجیں دُم دبا کر میدان سے بھاگ نکلیں۔ سلطان نے جس طرف رُخ کیا متحدہ دشمن کے ٹڈی دل لشکر تابِ مقابلہ نہ پا کر راہِ فرار اختیار کرتے گئے۔ سب سے زیادہ خون ریز جنگ شاہنور میں ہوئی۔ جہاں ہزیمت خوردہ اور تازہ دم فوجیں سلطان سے جنگ آزما ہونے کے لئے جمع ہو رہی تھیں۔

مرہٹوں کے آزمودہ کار جرنیل اور خود نظام علی خاں میدان جنگ میں موجود تھے۔ مگر یہاں بھی سلطانی فوج نے اس بے جگری سے حملہ کیا کہ مرہٹوں اور حیدر آبادی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن تین میل جاکر مرہٹہ فوجیں پھر جمع ہو گئیں اور سلطانی فوجوں کو اپنے توپ خانے کی زد میں لاکر بری طرح نقصان پہونچانے لگیں۔ یہ دیکھ کر سلطان نے اپنی فوج کے ایک حصے کو مرہٹوں کا توپ خانہ چھیننے کے لئے بھیجا اس دستہ نے مرہٹوں کے سر پر پہونچ کر اس قدر شدت سے گولیاں برسائیں کہ مرہٹے اپنا توپ خانہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سلطانی فوجوں نے اُن کے توپ خانے اور دیگر مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اور شاہنور سلطان کے قبضہ میں آگیا۔ قلعہ رد ہونی کنچن گڑھ اور سانڈور پر پہلے ہی سلطان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ قلعہ دھاڑواڑ بھی ایک خون ریز جنگ کے بعد فتح ہو چکا تھا۔ بلکہ یہاں تو مرہٹہ سرداروں پر سلطان کی اتنی ہیبت طاری ہو گئی تھی کہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں تک کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ سلطان حیدر آباد اور مرہٹوں کی آئے دن کی شرارت سے بہت تنگ آچکا تھا۔ اور ان کی سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا تہیہ کر چکا۔ چنانچہ اُس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصّہ کو حیدر آباد کی طرف اور دوسری کو پونا کی طرف مرہٹوں کا نام و نشان مٹا دینے کے لئے بھیجدیا۔ ان فوجوں نے حیدر آباد اور مرہٹی سلطنتوں کی حدود میں داخل ہو کر تخت و تاراج شروع کر دی اور کئی شہروں پر قبضہ بھی کر لیا اور آگے بڑھ کر اس کیمپ پر شب خون مارا جہاں مرہٹوں کا مہاراجہ ہلکر فوجوں کی کمان کرنے کے لئے مقیم تھا۔ اس اچانک حملہ سے ہلکر سراسیمہ ہو گیا اور اپنی رانیوں اور بچوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہلکر کے بھاگ جانے سے اُس کی فوج کی کمر ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ ان پے در پے شکستوں اور سلطان کے عزائم دیکھ کر مرہٹوں اور نظام نے خیریت اسی میں دیکھی کہ سلطان

سے صلح کرلیں۔ چنانچہ مہاراجہ ہلکر نے سلطان سے صلح کی درخواست کی جسے
اُس نے منظور کرلیا۔ اور فتح و ظفر کے پرچم اڑاتا ہوا دارالسلطنت سرنگا پٹم
کو واپس ہوگیا۔

انگریزوں سے تیسری جنگ

۱۷۸۹ء میں کالی کٹ کے نائروں نے
علم بغاوت بلند کردیا۔ جب سلطان
بغاوت فرو کرچکا تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ بغاوت راجہ کوچن اور راجہ ٹراونکور کے اشارے
پر ہوئی تھی اور وہ باغیوں کی امداد بھی کر رہے تھے۔ یہ سُن کر سلطان نے صرف دو پلٹنوں
اور دو ہزار سواروں کی معیت میں کوچن پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔ انگریز جو سلطان کے
ہاتھوں بار بار ذلت ناک شکستیں اُٹھانے پر بھی چین سے نہیں بیٹھے تھے اور اپنے اس
توانا دشمن کو مٹانے کے درپے تھے۔ اس موقع پر پھر اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ بہانا تراش
لیا کہ ٹراونکور حکومتِ مدراس کی حلیف ریاست ہے اور سلطان ٹیپو نے اُس کی
سرحد پر جنگ آزمائی کرکے مجبور کردیا ہے کہ انگریز اپنے معاہدہ کا پاس کرتے ہوئے
اپنی دوست ریاست کی امداد کریں۔ چنانچہ جنرل میڈوز نے انگریزی فوجوں کو سلطان
کی سرحدوں پر بھیج دیا۔ جب سلطان کو انگریزی فوجوں کی آمد کی خبر ہوئی تو
وہ بھی فوجیں لے کر بڑھا۔ کوئمبتور اور ستی منگل کے مضافات میں سلطان کا
انگریزی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ مگر انگریزی فوجیں میدان سے بھاگ نکلیں۔
اُن کے خیمے تک لوٹ لئے گئے اور بہت سے مرد اور عورتیں قید کرلی گئیں۔ خود
جنرل میڈوز اپنی جان بچا کر بھاگا۔ ادھر حکومت بنگال نے کرنل میکسویل کو ایک
تازہ دم فوج دے کر بھیجا تاکہ وہ جنرل میڈوز کی افواج کی مدد کریں۔ ان فوجوں
نے آکر "تریاتور" اور "دانمباڑی" پر قبضہ کرلیا۔ مگر سلطان کا سالار افواج میر برہان الدین
سپہ سالار سید غفار اور خود سلطان بجلی کی سرعت سے دشمن کے سر پر پہونچا اور

اس قدر شدت سے حملے کئے کہ کرنل میکسویل میدان سے بھاگ نکلا اُس کے ڈیڑھ سو سوار اور دو سو سپاہی گرفتار ہو گئے لیکن جلد ہی ہزیمت خوردہ انگریز جنرل میڈوز اور کرنل میکسویل نے پتور گھاٹ میں مل کر اپنی متحدہ فوجوں کے ذریعے اُس کے علاقے کو پھر نقصان پہونچانا شروع کر دیا۔ مگر سلطان ٹیپو اپنے رسالے اور توپخانے کو لے کر انگریزی فوجوں کی سرکوبی کے لئے پہونچ گیا اس جنگ میں بھی سلطان فتحیاب ہوا اور انگریزی فوجیں سخت نقصان اُٹھا کر پسپا ہو گئیں۔

انگریزوں کی اس مسلسل پسپائی نے لارڈ کارنوالس گورنر جنرل ہندوستان کو بہت چراغ پا کر دیا۔ وہ عرصے سے سلطان ٹیپو کو مٹانے کے منصوبے بنا رہا تھا مگر اب تک کامیابی نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے اُس نے سلطان کے ہاتھوں انگریزی فوجوں کے نقصان کو بہانہ بنا کر جنگ کا اعلان کر دیا۔ تاریخ کو خوب معلوم ہے کہ سلطان ٹیپو نے انگریزوں پر حملہ کرنے میں پہل نہیں کی تھی اُس کی اور ٹراونکور کی جنگ تھی اور ٹراونکور کے راجہ کی سازش اور شرارت آشکارا ہو چکی تھی۔ ان حالات میں سلطان کی جگہ اگر انگریز ہوتے اور اُن میں غیرت اور شجاعت و ہمت بھی ہوتی تو وہ شریر راجہ کی شرارت کا جواب دینے کے لئے وہی کچھ کرتے جو سلطان ٹیپو نے کیا۔ مگر انگریز جو پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے اُن کے نزدیک جائز و ناجائز اور اصول و بے اصولی میں کیا فرق ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے موقع تلاش کر لیا مگر چونکہ وہ کئی بار دیکھ چکے تھے کہ انگریز اور مرہٹے مل کر بھی سلطان کو شکست دینے میں ناکام رہے تھے اس لئے انہوں نے مرہٹوں اور نظام کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد سلطان کے امرائے سلطنت اور فوجی سرداروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ سازشوں کا جال بچھا دیا گیا۔ قلعہ داروں کو بڑی بڑی رقوم بطور رشوت دی گئیں اور وسیع جاگیریں دینے کے وعدے کئے گئے۔ غرض اس

طرح میدان ہموار کر کے اُنہوں نے سلطان پر حملہ کر دیا۔ سلطان کے امراء نمک حرام ہو کر انگریزوں سے مل چکے تھے انتہا یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی افواج کی آمد کو سلطان سے یہاں تک پوشیدہ رکھا کہ سلطان کو اس وقت خبر ہوئی جب انگریزی افواج بنگلور میں داخل ہو گئیں۔ اُس وقت سلطان سرنگاپٹم کے نواحی علاقے میں مقیم تھا۔ کرنل فلائڈ نے آگے بڑھ کر سلطان پر حملہ کیا۔ مگر اُس نے اسے ایسا دنداں شکن جواب دیا کہ کرنل فلائڈ زخمی ہو گیا اور انگریزی فوج میدان سے بھاگ نکلی۔ چار سو انگریزی سپاہی سلطان کی فوجوں نے گرفتار کر لئے جس بہادری اور بے جگری سے سلطان اور اس کے ماتحت فوجوں نے انگریزوں پر حملہ کیا تھا اگر سلطان کی افواج کے سردار اور قلعہ دار ہر محاذ پر اسی جوش و خروش اور بہادری سے مدافعت کرتے تو انگریز ہر جگہ ناکام ہو کر پسپا ہو جاتے مگر بدقسمتی سے سلطان کے سرداروں اور امراء نے غداری کی، سلطان کا معتمد خاص کشن راؤ انگریزوں سے مل گیا اور اُس نے بنگلور کا قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ دیون ہلی کا قلعہ دار بھی انگریزوں سے مل گیا اور یہ اہم مقام بھی انگریزی فوجوں کے قبضے میں آگیا۔ ادھر مرہٹوں اور نظام کی فوجوں نے سلطانی علاقوں کو تاراج کرنا شروع کر دیا اور متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا۔ مگر تاریخ شہادت دیتی ہے کہ جن مورچوں پر سلطان نے بنفسِ نفیس انگریزوں کا مقابلہ کیا وہاں انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور انگریزی فوجیں بُری طرح پسپا ہوئیں۔ سرنگاپٹم کے محاصرے میں بھی انگریزوں مرہٹوں اور حیدرآباد کی متحدہ فوج کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا اور میر قمر الدین کی سپاہ نے اُن کے لئے رسد پہونچنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے۔ انگریزی فوج بھوک کی شدت سے اس قدر تنگ آچکی تھی کہ اُس نے توپیں کھینچنے والے بیل تک کھا لئے تھے۔ ادھر سلطانی فوجیں شبخون مار مار کر انگریزوں اور اُن کے حلیفوں کی فوجوں

کا ناطقہ بند کر رہی تھیں۔ آخر لارڈ کارنوالس گھبرا گیا اور بھاری توپوں کو زمین میں دفن کروا کر اور آلاتِ جنگ کو آگ لگوا کر میدان سے فرار ہو گیا۔ مگر موسم برسات ختم ہوتے ہی انگریز مرہٹوں اور نظام کی افواج جن کی مجموعی تعداد اکیاسی ہزار تھی سرنگا پٹم پر حملہ کرنے کے لئے پھر روانہ ہو گئیں اُس وقت سلطان کے پاس صرف پینتالیس ہزار فوج تھی۔ اتحادی فوجوں نے آگے بڑھنا شروع کیا سلطان کے قلعہ دار اُن سے مل چکے تھے اس لئے انہیں راستے میں کسی مقام پر جنگ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور نہ کسی نے مدافعت کی۔ جب یہ فوجیں سرنگا پٹم کے سامنے پہونچیں تو سلطان کو معلوم ہُوا کہ میرے امراء اور سردارانِ فوج اتحادی فوجوں سے سازش کر چکے ہیں۔ مگر پھر بھی سلطان نے ہمت نہ ہاری اور اپنی فوج کے ساتھ جو اتحادی افواج کے مقابلے میں نصف تھی اس زور سے حملہ کیا کہ اتحادی فوجیں پسپا ہو گئیں۔ مگر شام ہو جانے کی وجہ سے سلطان کی فوجوں نے اتحادی فوجوں کا زیادہ دُور تک پیچھا نہ کیا۔ اگر سلطانی فوجیں اُس وقت اتحادیوں کا پیچھا کرتی رہتیں تو لارڈ کارنوالس کے میر منشی حمید خاں کے بقول "افواجِ متحدہ (انگریز، نظام، مرہٹے) کا اُسی شب خاتمہ ہو جاتا"۔ آخر سلطان اور اتحادیوں کے مابین صلح ہو گئی جس کی تین شرائط تھیں (۱) سلطان اتحادیوں کو تین کروڑ روپیوں کا ملک دے (۲) تین کروڑ روپیہ نقد دے (۳) یہ روپیہ وصول ہونے تک اپنے دو شہزادوں کو یرغمال کے طور پر انگریزوں کے پاس رکھے۔

سلطان نے ان شرائط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ امرائے سلطنت اور سردارانِ فوج زور دے رہے ہیں کہ یہ شرائط قبول کرلی جائیں تو وہ سمجھ گیا کہ میرے ہاتھ کمزور ہو چکے ہیں۔ یعنی وہی لوگ جن کی اعانت اور زورِ بازو سے فتح حاصل ہو سکتی ہے اتحادیوں سے ملے ہوئے ہیں۔ تو

ہ یہ شرائط قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

انگریزوں سے چوتھی جنگ

انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کی متحدہ فوجوں کی یلغار اور امرائے سلطنت کی نمک حرامی کی وجہ سے سلطان کو وقتی طور پر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ مگر اس ناکامی کا اُس کے غیور دل پر بے انتہا اثر ہوا اور اُس نے عہد کر لیا کہ جب تک انگریزوں اور اُن کے حلیفوں کو شکست دے کر اپنی ناکامی کا بدلہ نہ لے لوں گا چارپائی پر نہ سوؤں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ۔ اُس نے مصر، ترکی، افغانستان اور فرانس وغیرہ کی طرف دوستی کے ہاتھ بڑھائے اور اپنی سفارتیں بھیج کر انہیں اپنی امداد پر آمادہ کیا۔ فوج کی از سرِ نو تنظیم اور سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصے میں سلطنتِ خداداد میسور حیرت انگیز ترقی کرنے لگی، جب انگریزوں کو سلطان کے نامہ و پیام اور اُس کی سلطنت کی غیر معمولی ترقی کا علم ہوا تو بہت گھبرائے۔ چنانچہ اُنہوں نے مرہٹوں اور نظام کے ساتھ پھر سلسلہ جنبانی شروع کی۔ سلطان کے امرا اور فوجی سرداروں کو رشوتیں دینی شروع کیں۔ میر صادق سلطان کے چیف سیکرٹری اور وزیر سلطنت کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ میر غلام علی لنگڑا، میر معین الدین اور پورنیہ جیسے معتمدین سلطانی نے بھی غداری کی۔ قلعہ داروں نے انگریزوں کی دولت کی چمک دیکھ کر اُن کا ساتھ دیا۔ غرض جب سارے انتظامات مکمل ہو گئے تو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہندوستان ۳۱ر دسمبر ۱۷۹۸ء کو خود مدراس پہونچا اور سارے انتظامات کا معائنہ کر کے ۲۲ر فروری ۱۷۹۹ء کو سلطان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ انگریزی فوجوں نے مرہٹہ اور نظام کی فوجوں کے ساتھ میسور کی طرف بڑھنا شروع کیا اور قلعہ داروں کی غداری کی وجہ سے بغیر کسی مدافعت کے بڑھتی چلی گئیں۔ اُدھر انگریزوں اور اُن کے حلیفوں کی فوجیں سلطنت میسور

کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لئے نہایت برق رفتاری سے بڑھ رہی تھیں اور ادھر سلطان کے معتمد میر صادق اور پورنیہ انہیں دھوکے دے رہے تھے اور ہر موقع پر یہی کہتے تھے کہ "سلطان کے اقبال سے کس کی مجال ہے جو حضور کی حدودِ سلطنت میں قدم بھی رکھے" مگر جب فوجیں سرنگاپٹم کے قریب پہونچ گئیں تو سلطان کو خبر ہوئی۔ باوجودیکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس سازش میں بڑے بڑے امراء اور فوجی سرداروں کے ہاتھ ہیں مگر پھر بھی وہ انگریزوں اور اُن کے حریفوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں آگیا۔ سدا سیر کے مقام پر سلطان کا اتحادی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں سلطان اور اس کے سپاہیوں نے اس قدر جوش وخروش اور مردانگی کے جوہر دکھائے کہ اتحادی فوجیں میدان چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔ سلطان کا اتحادی فوجوں سے دوسرا مقابلہ گلشن آباد کی سرحد پر ہوا۔ یہاں سلطانی فوجوں نے اتحادیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ لیکن میر معین الدین اور پورنیہ نے عین وقت پر غداری کی اور سلطان کی فوجوں کو لے جا کر ایسی جگہ کھڑا کر دیا جو انگریزی توپ خانے کی زد میں تھی۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے سلطان کی فوج کا بہت بڑا حصہ انگریزی توپ خانے نے تباہ و برباد کر دیا۔ اسی اثناء میں سلطان کو معلوم ہوا کہ اتحادی فوجیں سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ چنانچہ وہ فوراً سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرنگاپٹم کا محاصرہ

سرنگاپٹم پہونچ کر سلطان نے قلعہ اور شہر کی حفاظت کا بندوبست کیا۔ مگر یہ سارے انتظامات بے سود تھے، کیونکہ راستے کے سارے قلعہ دار انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور انگریزوں مرہٹوں اور نظام کی متحدہ فوجوں کا سیلاب سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہا تھا جسے روکنا انسانی طاقت سے باہر تھا۔ پھر میر قاسم اور میر صادق جیسے لوگ ان فوجوں

کے ساتھ تھے۔ بلکہ سلطان کا معتمد قاسم ہی وہ شخص تھا جس نے جنرل ہارس کو ایک محفوظ راستہ دکھا کر اُس کی فوج کو قلعہ کی فصیل کے قریب پہونچنے میں امداد دی۔ جب شہر اور قلعہ کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا تو انگریزی توپ خانے نے گولہ باری شروع کر دی۔ ۴ مئی کا دن تھا۔ سلطان قلعہ کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ابھی دوسرا لقمہ ہاتھ ہی میں تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ انگریزی فوج کی گولہ باری سے بہت نقصان ہو رہا ہے اور سلطان کا جانباز سردار سید غفار شہید ہو گیا ہے۔ روایت ہے کہ سلطان نے لقمہ ہاتھ سے رکھدیا اور اُن امرائے سلطنت اور سرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے جو وہاں موجود تھے کہا کہ

"اس غداری کا نتیجہ تمہیں اس وقت معلوم ہوگا جب تم اور تمہاری آئندہ نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہو کر ایک ایک دانہ چاول اور پیاز کی ایک ایک گرہ کے لئے ترسیں گے"

اپنی تلوار اور دو خالی بندوق لے کر آگے بڑھا۔ اسی اثناء میں پورینہ نے سلطانی فوجوں کو اطلاع دی کہ آکر اپنی تنخواہیں وصول کر لیں۔ سلطانی فوجوں کے ہٹتے ہی مورچہ خالی ہو گیا اور انگریزی فوجیں آگے بڑھ کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئیں۔ کہتے ہیں کہ میر قاسم علی ان فوجوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یہی شخص تھا جو سب سے پہلے قلعہ کی فصیل پر چڑھا۔ اس کے پیچھے انگریزی فوج کا جنرل بیرڈ اور پھر ساری فوج فصیل پر چڑھ کر قلعہ میں داخل ہو گئی۔ سلطان نے مختصر سی جمعیت کے ساتھ انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ مختلف مورچوں پر لڑ رہا تھا اور انگریزی فوج کے حملے شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ اُس کی فوج کے ایک سردار نے سلطان کو مشورہ دیا کہ یہ بہت نازک وقت ہے آپ اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ یہ سُن کر خود دار اور غیرت مند سلطان غضبناک ہو گیا اور

اُس نے جواب دیا کہ :-

"گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے"!

سلطان کی شہادت

اور یہ کہہ کر انگریزی حملوں کا جواب دیتا ہُوا شہر کے بڑے دروازے کے قریب پہنچ گیا یہاں انگریزی فوجیں پوری شدت سے حملہ کر رہی تھیں۔ سلطان کے غدار اور نمک حرام امراء و وزراء انگریزی فوجوں کو سلطان کی قلعہ میں موجودگی کی اطلاع دے چکے تھے۔ اس لیئے انگریزی فوج کی ساری طاقت اسی جگہ جمع ہو گئی تھی۔ آخر انگریزی فوج کی طرف سے ایک گولی آئی اور سلطان کے دل کے قریب لگی۔ زخم بہت کاری تھا۔ اس لئے سلطان اس کی تاب نہ لا کر گر پڑے اور کچھ دیر کے بعد ہندوستان کا یہ عدیم النظیر جرنیل اولوالعزم فاتح۔ اسلامی جوش و حمیت کا مجسمہ انگریزوں اور مرہٹوں کا سب سے بڑا دشمن اپنے امرا اور وزرا ہی کی غداریوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ اِنَّ لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

یہ واقعہ ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو شام کے قریب پیش آیا۔

سلطان کا نظامِ سلطنت

سلطان نے انتظامِ سلطنت کے پیشِ نظر ملک کو بہت سے تعلقوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ہر تعلقہ کے اندرونی انتظام کے لئے ایک عامل، ایک سررشتہ دار، تین محرر، چار طرفدار، چھے چپراسی اور پولیس کا معقول عملہ رہتا تھا۔ ہر بیس سے تیس تعلقوں پر ایک ایک افسر مقرر ہوتا تھا جسے آصف کہتے تھے۔ کئی تعلقوں کو ملا کر ایک ضلع بنا دیا گیا تھا۔ پولیس کا انتظام نہایت اعلیٰ اور تسلی بخش تھا۔ پولیس کو اپنے علاقے کے امن و امان کا ذمہ دار بنا دیا گیا تھا۔ ایسے علاقوں کے عوام کو جہاں ڈاکوؤں کا اندیشہ رہتا تھا ہتھیار رکھنے کی بھی اجازت تھی۔ پولیس کو باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی سلطان

عدل و انصاف کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ ہر شہر اور گاؤں میں پنچائتیں مقرر تھیں جو معمولی مقدمات کا فیصلہ کرتی تھیں۔ بڑے اور سنگین مقدمات کے فیصلے تعلقوں اور ضلعوں کے حاکم عامل اور آصف کرتے تھے۔ اپیل کے لئے پہلے صدر عدالت اور پھر سلطان سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے شرعی مقدمات کے فیصلے کے لئے صدر عدالت میں دو حاکم رہتے تھے۔ ایک ہندو اور دوسرا مسلمان۔ ہر شخص کو قانونی چارہ جوئی کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ آسانیاں دی گئی تھیں اور کورٹ فیس کی قسم کے اخراجات کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس طرح غرباء اور انتہائی مفلوک الحال لوگ بھی بغیر ایک پائی خرچ کئے انصاف کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے۔ فوجوں کا انتظام نہایت اچھا تھا۔ ایک انگریز کیپٹن لٹل جو میسور کی تیسری جنگ میں شریک تھا، سلطان کے فوجی انتظام اور اُس کی فوجی طاقت کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"فوج کی تنظیم اور اُس کے ہتھیاروں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے کسی مہذب ملک کی فوج سے کسی حالت میں پیچھے نہیں ہے۔"

سلطان کی فوج دو حصوں میں تقسیم تھی ایک بری اور ایک بحری۔ بری فوج کے بھی دو حصے تھے پیادہ اور سوار۔ پیادہ فوج کو سلطان نے پانچ ڈویژنوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر ڈویژن میں ستائیس رجمنٹیں تھیں اور ہر رجمنٹ میں تیرہ سو بانوے سپاہی تھے۔ سوار فوج تین ڈویژنوں میں تقسیم تھی۔ ہر ڈویژن میں چھ رجمنٹیں اور ہر رجمنٹ میں تین سو چھہتر سوار ہوتے تھے۔ سوار فوج میں نو سو ہاتھی، چھ سو اونٹ، تیس ہزار گھوڑے اور بار برداری کے لئے چھ لاکھ بیل تھے۔ سلطان کی فوج قدیم اور جدید ہر قسم اسلحہ جنگ سے مسلح تھی۔ ملک میں اسلحہ تیار کرنے کے بڑے کارخانے تھے۔ فوجی افسروں کی تربیت کے لئے سرنگاپٹم میں ایک بہت بڑی تربیت گاہ تھی۔ بری فوجوں کے

استحکام کے ساتھ ساتھ سلطان نے بحری فوج کی طرف بھی توجہ کی اُس کے بحری بیڑے میں کم و بیش ڈیڑھ سو جنگی جہاز اور دس ہزار پانچ سو ملاح تھے جو ساحلوں کی حفاظت کرتے تھے سلطان کے عہد حکومت میں تجارت اور صنعت و حرفت نے بھی بہت ترقی کی۔ غیر ممالک سے تجارت کرنے کے لئے سترہ کوٹھیاں کھولی گئیں۔ ملکی مصنوعات کو ترقی دینے کے لئے تیس کارخانے قائم کئے گئے۔ زراعت نے بھی ترقی کی اور ہر طرف سرسبز و شاداب اور لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آنے لگے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عوام خوشحال اور فارغ البال تھے۔ چوریاں اور دوسرے جرائم برائے نام ہوتے تھے۔ ملک میں ہر طرف امن و امان اور سکون و اطمینان کی فضا تھی۔

عادات و خصائل

سلطان ٹیپو بہت نیک، شریف النفس، عبادت گذار اور نہایت حیادار انسان تھا۔ بہت نرمی سے گفتگو کرتا تھا۔ بہت متین سنجیدہ اور باوقار تھا۔ گفتگو کے وقت بہت احتیاط برتتا تھا۔ اُس کی زبان سے کبھی فحش کلمہ نہیں نکلتا تھا۔ اسلامی غیرت اور حمیّت اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ عیش و عشرت سے اُسے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اُس وقت کے مسلمان بادشاہوں کے طریق کے برعکس اُس کی حرم سرا لونڈیوں اور بیشمار بیگمات سے خالی تھی۔ اپنے وقت کا زیادہ حصّہ استحکامِ سلطنت اور عوام کی فلاح و بہبود پر صرف کرتا تھا۔ علی الصبح بیدار ہوتا تھا۔ نماز پڑھ کر ایک گھنٹہ تک قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ پھر سیر کو جاتا تھا۔ سیر سے واپسی پر ناشتہ کرتا تھا۔ ناشتہ کرکے فوج کا معائنہ کرتا تھا۔ واپسی پر باہر سے آئے ہوئے خطوط کے جوابات دیتا تھا اور انتظام سلطنت سے متعلق احکامات جاری کرتا تھا۔ شام کا کھانا کھا کر چہل قدمی کرتا تھا۔ پھر بستر پر لیٹ کر اُس وقت تک مطالعہ کرتا رہتا تھا جب تک نیند نہیں آجاتی تھی۔ غرض یہ کہ بہت

محنتی تھا اور وقت کی پابندی کرتا تھا۔

علمی قابلیّت

سلطان ٹیپو عظیم جرنیل بہت بڑا فاتح اور شمشیر زن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت علم دوست بھی تھا۔ کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ عربی، فارسی، کنڑی اور دکنی زبانوں میں بہت بے تکلفی سے گفتگو کر سکتا تھا۔ فارسی زبان کا قادر الکلام شاعر اور بہت اچھا نثر نگار بھی تھا۔ اسکے علاوہ طب، تجارت اور مذہبی اُمور میں بھی صاحب الرائے تھا۔ سلطان کی ذاتی لائبریری بے شمار قیمتی اور نایاب کتابوں سے پُر تھی۔ مگر افسوس کہ اُس کی شہادت کے بعد اس قیمتی کتب خانے کا بہت بڑا حصّہ انگریزی فوجوں کی لوٹ مار کی نذر ہو گیا ؛

حضرت سید احمد شہید رح

ابتدائی حالات

حضرت سیّد احمد صاحب شہید یوپی کے شہر رائے بریلی میں صفر ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام سیّد محمد عرفان صاحب تھا۔ سید صاحب کے جدِ امجد شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد الحسنی ۶۲۲ھ میں بغرض جہاد ہندوستان تشریف لائے اُس وقت سلطان قطب الدین ایبک سر براہ آرائے سلطنت تھا۔ سیّد قطب الدین محمد الحسنی نے کڑا کے علاقے پر حملہ کیا اور اُسے فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر دیا اور یہیں مقیم ہو گئے۔ سیّد احمد صاحب کے بزرگوں میں تقریباً تمام افراد بہت معزز صاحب علم و فضل اور بعض صاحب سیف بھی تھے۔ زہد و تقویٰ اس خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔

تعلیم و تربیت

جب سیّد احمد صاحب شہید کی عمر چار سال کی ہوئی تو آپ کو محلے کے ایک مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ مگر یہ دیکھ کر لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ اپنے خاندان کے دوسرے بزرگوں کے برعکس آپ حصولِ علم میں بالکل دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ تین سال میں قرآن شریف کی چند سورتیں یاد کرنے اور کچھ مرکب و مفرد الفاظ سیکھنے کے سوا آپ نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ سیّد صاحب کے بڑے بھائیوں کو اُنکی تعلیم کا بہت خیال رہتا تھا حصولِ علم کی طرف سے سید صاحب کی غفلت دیکھ کر انہوں نے اپنے والد سے شکایت کی۔ والد نے فرمایا کہ

میاں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ غرض سید صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اور انہوں سے پڑھنے لکھنے کی بجائے کھیل کود میں دلچسپی لینی شروع کر دی کہتے ہیں کہ آپ کو مردانہ کھیلوں میں کبڈی کھیلنے کا بڑا شوق تھا اپنے ساتھ کھیلنے والے لڑکوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتے تھے اور پھر ایک جماعت دوسری جماعت کے قلعہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیتی تھی۔ حالات نے پلٹا کھایا سید صاحب کے والد ماجد فوت ہوگئے اور آپ تلاش معاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے پھرتے پھراتے دہلی پہونچ گئے اور مشہور محدّث بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب شاہ صاحب کو معلوم ہوا کہ آپ اس بزرگ اور نجیب خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ تو انہوں نے سید صاحب کی بہت قدر ومنزلت کی اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کر دیا۔ یہاں رہ کر انہوں نے حضرت شاہ صاحب سے کسبِ فیض کیا اور حصولِ تعلیم کا سلسلہ از سرِ نو جاری ہوگیا۔ تصوف شیخ۔ اور سلوک کی تعلیم انہوں نے شاہ عبدالقادرؒ صاحب سے ہی حاصل کی۔ قرآن شریف کے معنی اور اس کی باریکیوں پر غور وخوض شروع کیا۔ بڑے بڑے علماء ومفسرین، محدثین وفقہا کی صحبت نے طبیعت میں اور بھی جلا پیدا کی اور رفتہ رفتہ سید صاحب پر ظاہری وباطنی علوم کے اسرار منکشف ہونے لگے تکمیل علم کے بعد آپ وطن تشریف لے گئے اور دو سال تک مقیم رہے۔ اسی دوران میں شادی کی اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئی۔

پھر دہلی کی طرف

اس وقت ہندوستان کے مسلمان سخت کس مپرسی کی زندگی گذار رہے تھے۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ سکھ، مرہٹے اور راجپوت طوائف الملوکی پھیلا رہے تھے۔ انگریز اس افراتفری اور بدانتظامی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے

سکھوں کی دراز دستیاں اپنی انتہا کو پہونچ چکی تھیں اور اُن کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ اُن کی جان و مال عزت و آبرو اور مذہب کوئی چیز محفوظ نہیں تھی سید صاحب کا غیرت مند دل مسلمانوں کی مظلومیت، غلامی اور پریشان حالی دیکھ کر بیتاب ہو گیا اور انہوں نے عہد کر لیا کہ جب تک مسلمانوں کو اُن کی عظمت رفتہ واپس نہ دلا دونگا آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ پہلے دہلی اور پھر نواب امیر احمد خاں کے پاس چلے گئے۔ نواب موصوف اُس وقت وسط ہند میں انگریزوں اور ہندو راجاؤں سے نبرد آزما تھے۔ سید صاحب یہاں چھے سال مقیم رہے اور فنون جنگ کی تربیت حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ دہلی واپس آئے اور ایک عظیم الشان تحریک کی بنیاد رکھی۔

سید صاحب کی تحریک کا اجراء

سید صاحب کے دہلی پہونچتے ہی خواص و عوام کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علماء و فقہا نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شہرت اور مقبولیت نے دامن پھیلایا۔ سید صاحب کی نیکی، بزرگی اور فیض علوم ظاہر و باطن کا شہرہ ہوا خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے لگے اور رفتہ رفتہ معتقدین کی بہت بڑی جماعت آپ کے گرد جمع ہو گئی اب سید صاحب کی شہرت دہلی اور اُسکے نواح سے نکل کر ہندوستان کے اطراف و اکناف میں پھیلنے لگی اور مختلف اضلاع و قصبات سے دعوتیں دی جانے لگیں کہ یہاں تشریف لائیے۔ مسلمانوں کی اصلاح کیجئے اور انہیں منظم کیجئے۔ سید صاحب جو خود اس وقت کے منتظر تھے دلی سے نکل کھڑے ہوئے۔

سید صاحب کی باطنی آنکھ مسلمانوں کے تنزل کی اصل وجہ کو بھانپ چکی تھی

انہوں نے اس لیے گور مریض کے مرض کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں کی ذلت و خواری کا سبب اُن کی بداعمالی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کی اصلاح قرار دیا۔ وہ جن شہروں میں گئے وہاں کے مسلمانوں کو جمع کر کے فسق و فجور اور عیش و عشرت کو ترک کرنے کی تلقین کی۔ اسلامی اُصولوں اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کی۔ سید صاحب کی پُر کشش شخصیت اور موثر اندازِ بیان کا کرشمہ تھا کہ لاتعداد لوگ اپنا قابلِ نفرین طرزِ زندگی ترک کر کے سید صاحب کے رنگ میں رنگے گئے۔ وہ لوگ جن کی زندگی کا مشغلہ دادِ عیش دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ بدبخت جو مسلمان کہلا کر اپنے اعمال سے اسلامی تعلیمات کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ نہایت صالح، پرہیزگار اور شعائرِ اسلام کے پابند ہو گئے مسجدیں آباد ہو گئیں۔ بداعمالیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمانوں کا باہمی نفاق اور بغض و عداوت دُور ہو گئی۔ اُن میں خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں جیسی خدا و رسول کی محبت اور اسلام کی سچی تڑپ پیدا ہو گئی۔ سید صاحب نے سہارنپور سے لے کر کلکتہ تک طوفانی دورہ کئے اور اپنے رفقاءِ کار سید اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحئی کی معیّت میں اپنی تقریروں حسنِ اخلاق اور ظاہری و باطنی فیوض و برکات سے مسلمانوں میں نئی روح پھونک دی۔ بلا مبالغہ لاکھوں مسلمان اُن کی بیعت کر کے حقیقی اسلام کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ جب سید صاحب نے دیکھ لیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نیک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اور سب نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور میری آواز پر لبیک کہنے والے جمع ہو گئے ہیں۔ تو انہوں نے اپنا اصل مقصد ظاہر کیا اور مسلمانوں کے سامنے جہاد کی ضرورت اور اہمیت بیان کی۔ پنجاب کے مسلمانوں پر سکھوں کے انسانیت سوز مظالم کی داستانیں سُنا سُنا کر مسلمانوں کی غیرتِ قومی کو اُبھارا اور پھر اُن کے حلقۂ ارادت کے وہ لوگ جو مسجدوں میں بیٹھ کر خدا اور رسول کے ذکر

اذکار کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے عیش و عشرت اور لہو و لعب کی زندگی کو ٹھوکر مار کر درویشی اور فقر کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔ یکایک بوریہ سے اٹھ کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ تسبیح کے منکے پھیرنے والے تلوار چلانے کی پریکٹس کرنے لگے۔ اور ہر طرف نشانہ بازی، شہ سواری اور تیر اندازی کی مشق ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصے میں سید صاحب کے معتقدین خدا کی راہ میں جہاد کرنے اور پنجاب کے مظلوم مسلمانوں کو سکھوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے کے لئے منظم ہو گئے۔ اسی دوران میں آپ کو سفرِ حج پیش آیا۔ دورانِ سفر میں آپ جن بندرگاہوں پر اُترے وہاں کے مسلمانوں کو بھی اسلام کے حقیقی راستے پر گامزن ہونے کی تلقین کی۔ جب آپ حجاز مقدس کی سرزمین پر پہنچے تو آپ کے ساتھ بکثرت مسلمانوں کا ہجوم اور سب کو ایک خاص رنگ میں رنگا ہوا دیکھ کر اہلِ حجاز نے آپ کی بڑی قدر و منزلت کی۔ بڑے بڑے شیوخ و مفتی اور علماء و فقہاء سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کے حُسنِ اخلاق اور ظاہری و باطنی فیوض و برکات سے متاثر ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سید صاحب نے اُن میں سے ذی علم اور با اثر لوگوں کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے اُن کے علاقوں میں متعین کر دیا۔ اور ہدایت کر دی کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کام جاری کر دیں۔ حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہو کر آپ ہندوستان واپس تشریف لے آئے اور پھر اپنے کام میں معروف ہو گئے۔ سید اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحئیؒ صاحب کو ہندوستان کے اطراف و اکناف میں جہاد کی تلقین کے لئے روانہ کیا اور خود اپنے متبعین کے ساتھ جہاد کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔

جہاد کو روانگی

غرض ۱۲۴۱ھ کے اوائل میں سید صاحب مجاہدین کے قافلے کے ساتھ اپنے آبائی وطن رائے بریلی سے ہجرت کر کے جہاد

کے لئے روانہ ہو گئے اور راجپوتانہ، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد سے گذرتے ہوئے افغانستان پہونچے۔ راستے میں ہر جگہ سید صاحب کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے نوابوں، امراء اور حکام نے شہر سے باہر نکل نکل کر استقبال کیا۔ شہروں اور دیہاتوں کے لوگوں نے اُن کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ ہزاروں لوگ اُن کے دیدار اور حُسنِ بیان سے متاثر ہو کر حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے بہت سے روٴسا و امراء نے روپیہ اسلحہ جنگ اور گھوڑوں سے اُن کی امداد کی اور بعض سے اُنہوں نے بوقت ضرورت امداد کا وعدہ لیا۔ سرحد کے خوانین نے سید صاحب اور اُن کے قافلے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کی اور اُن کے اشارے پر کٹ مرنے کا وعدہ کیا۔ اس سفر میں سید صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کو طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ دورانِ سفر میں میل ہا میل تک لق و دق میدان خطرناک جنگل وسیع و عریض اور ہیبتناک صحرا طے کرنے پڑے۔ دھوپ، لو، بھوک اور پیاس کی شدتیں برداشت کیں مگر کیا مجال کہ کسی کی جبین پر معمولی سی شکن یا دل پر ذرہ برابر میل تو آیا ہو، ہر شخص، خدا اور اُس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ دلوں میں شوقِ شہادت موجزن تھا اور گردنیں راہِ حق میں کٹنے کے لئے بے چین تھیں۔ سید صاحب صوبۂ سرحد سے قندھار وہاں سے غزنی اور غزنی سے کابل پہونچے۔ اور ان میں سے ہر مقام کے افغان سرداروں اور ان علاقوں کے حاکموں کو خطوط لکھ لکھ کر جہاد کے لئے اُبھارا۔ ہزاروں پٹھان تیغ و تفنگ کے ساتھ سید صاحب کے ہمراہ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ جنہیں لے کر سید صاحب پشاور تشریف لائے یہاں کے لوگوں نے بھی سید صاحب کا شاندار استقبال کیا اور سینکڑوں آدمی اُن کے ساتھ جہاد پر جانے کے لئے رضامند ہو گئے۔ پشاور سے چل کر سید صاحب نوشہرہ پہونچے۔ اب وہ وقت آچکا تھا جس کی سید صاحب

برسوں سے تیاری کر رہے تھے اور جس کے لئے اپنا وطن، گھر بار اور عیش و آرام تج کر سفر کی ہوش ربا صعوبتیں برداشت کی تھیں۔

سکھ حکومت کے نام خط

نوشہرہ پہونچ کر سید صاحب نے حکومت لاہور کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہاری حکومت میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ اُن کی جان و مال عزت و آبرو اور انتہا یہ ہے کہ مذہبی حقوق بھی محفوظ نہیں ہیں۔ پیشتر اس سے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد کے لئے تم سے برسرِ پیکار ہوں تمہارے سامنے تین شرائط پیش کرتے ہیں اور تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک قبول کر لو۔

(۱) یا تو اسلام قبول کرو، اُس وقت ہمارے بھائی ہو جاؤ گے۔ مگر اس پر ہم جبر نہیں کرتے ہیں (۲) یا ہماری اطاعت قبول کر کے جزیہ دینا قبول کرو۔ اس صورت میں ہم تمہاری جان و مال کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنی جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں (۳) اور اگر تمہیں یہ دونوں شرائط منظور نہ ہوں تو پھر ہم سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سید صاحب کے اس خط کے جواب میں پنجاب کی سکھ حکومت نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چچازاد بھائی سردار بدھ سنگھ کو دس ہزار فوج کے ساتھ بھیجا۔ سردار بدھ سنگھ نوشہرہ سے سات آٹھ کوس کے فاصلے پر مقامِ اکوڑہ میں مقیم خیمہ زن ہو گیا۔

پہلی جنگ

سکھ لشکر کی آمد کی خبر سُن کر سید صاحب نے اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیا اور یہ طے ہوا کہ پیشتر اس سے کہ سکھ فوج مجاہدین پر حملہ آور ہو مجاہدین شب خون مار کر اسے تباہ کر دیں۔ چنانچہ ۲۰ر جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کی نصف شب کو نو سو مجاہدین نے دس ہزار کے ٹڈی دل لشکر پر حملہ کر دیا۔ جب مجاہدین کی اس مختصر سی جمعیت نے نعرۂ تکبیر بلند کر کے سکھ فوج پر یورش کی تو روایت

ہے کہ سکھوں میں بھاگڑ مچ گئی خود سردار بدھ سنگھ اپنے خیمہ سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ دور جاکر اُس نے اپنی منتشر فوج کو پھر جمع کیا اور مجاہدین پر ہلّہ بول دیا مگر خدا کے شیروں کی جماعت اس قدر بے جگری سے لڑی کہ سکھوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ اپنا توپ خانہ تک چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس جنگ میں سات سو سکھ مقتول ہوئے اور ہزاروں زخمی ہوگئے۔ مجاہدین کے صرف سینتیس ۳۷ آدمی شہید اور پینتیس ۳۵ زخمی ہوئے۔

اعلانِ خلافت

اس جنگ کے دوران میں سرحد کے پٹھانوں نے لوٹ مار کرکے افراتفری مچادی تھی اور مجاہدین کے نظم و نسق میں ابتری پیدا ہوگئی تھی۔ اس لئے نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ مجاہدین متفقہ طور پر کسی کو اپنا امیر تسلیم کرلیں اور پھر بے چون و چرا اُس کی اطاعت کریں اور مالِ غنیمت کی تقسیم بھی احکامِ شریعت کے مطابق طے پائے تاکہ بعد میں کوئی بدمزگی نہ پیدا ہوسکے۔ یوں بھی اُمتِ مُسلم کیلئے امام کی ضرورت اور اُس کا وجود احکامِ شریعت میں شامل ہے چنانچہ تمام مجاہدین نے سید صاحب کو اپنا خلیفہ اور امیر المومنین تسلیم کرلیا۔ علماء نے اُن کے حق میں فتوے دیئے۔ عوام اور سرحد کے رؤساء نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور مسجدوں میں اُن کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا جس میں اُنہیں امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

سکھ فوج اور فرانسیسی جنرل سے جنگ

سرحد کے ایک رئیس خادی خاں کے پاس مان یری نام کا ایک قصبہ تھا۔ یہ قصبہ اُس کے اصل مالکوں کو جبراً بیدخل کر کے حاصل کیا گیا تھا۔ جب سید صاحب کی نیکی و پرہیزگاری اور اُن کے اثر و رسوخ کا صوبۂ سرحد اور اس کے نواح میں شہرہ ہوا تو موضع مان یری کے جائز وارث سید صاحب کے پاس آئے اور اُن سے درخواست کی ہمارا حق ہمیں دلوایا جائے۔ سید صاحب نے معاملے کی تحقیق کر کے خادی خاں کو مجبور کیا

کہ وہ موضع مان پری اُسکے اصل مالکوں کو واپس کرے۔ اُسوقت تو خادی خاں نے سید صاحب کی مقبولیت اور جمعیت کی وجہ سے موضع مان پری اُسکے اصل مالکوں کو واپس کر دیا۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد جب تیس ہزار سکھوں کی فوج اہل پشاور سے مالیہ وصول کرنے کے لئے پشاور میں آئی تو خادی خاں نے جو موضع مان پری چھن جانے کی وجہ سے سید صاحب کا مخالف ہو گیا تھا اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر سکھ فوج کو سید صاحب کے خلاف بھڑکایا اور اُس سے درخواست کی کہ اگر آپ لوگ ہمیں موضع مان پری کا قبضہ دلادیں تو ہم آپ کو خراج کے علاوہ بیس گھوڑے بھی بطور نذر دیں گے۔ چنانچہ سکھوں کی فوج کثیر اور خادی خاں کے لشکر متحد ہو کر مان پری پر حملہ کر دیا۔ ادھر مان پری کے لوگوں نے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ساری کیفیت بیان کی۔ سید صاحب نے سید اسماعیل شہید کی سرکردگی میں مجاہدین کی ایک جمعیت روانہ کی تاکہ سکھوں اور خادی خاں کی متحدہ فوج کا مقابلہ کریں۔ مگر پیشتر اس سے کہ مجاہدین کی جماعت اہل مان پری کی امداد کے لئے پہونچتی، مان پری کے پٹھانوں نے متحدہ فوج کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اس جنگ میں متحدہ فوج کے چند آدمی زخمی ہو گئے ادھر انہیں مجاہدین کے آنے کی اطلاع ملی، اس لئے ان کے حوصلے پست ہو گئے لہذا انہوں نے میدان جنگ سے راہِ فرار اختیار کی۔ مگر وہاں سے جا کر انہوں نے سید صاحب پر حملہ کر کے اُن کا خاتمہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور پنجتار پر حملہ کرنے کی نیت سے جہاں سید صاحب اور آپ کا لشکر مقیم تھا ڈیرے ڈال دیئے۔ جب سید صاحب کو اُن کے عزائم کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اہل لشکر سے مشورہ کر کے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ سکھ فوج کی تعداد تیس ہزار تھی ایک تجربہ کار فرانسیسی جرنیل بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اسلحہ جنگ اور توپ خانہ بھی تھا اور خادی خاں کا لشکر علیحدہ اُن کی امداد کے لئے موجود تھا۔ ادھر سید صاحب کی کل فوج دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی جس میں ہندوستانی اور پٹھان سب شامل

تھے۔ اسلحہ جنگ بھی سکھ فوج کے مقابلہ میں بہت کم تھا۔ لیکن فوج کی کمی اور اسلحہ جنگ کی قلت سید صاحب اور مجاہدین کے عزائم کو متزلزل نہ کر سکی اور انہوں نے ہر قیمت پر جنگ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ مگر سکھوں اور فرانسیسی جرنیل پر مجاہدین کے عزم و حوصلہ کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ انہوں نے سید صاحب پر حملہ کرنے میں پس و پیش سے کام لینا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں خادی خاں نے سکھوں کی ایک جمعیت کے ہمراہ درے میں داخل ہو کر پنجتار کی طرف پیش قدمی شروع کر دی مگر پہلے مقابلہ ہی میں ایک سکھ اور سکھ لشکر کا ایک مسلمان ہلاک ہو گیا۔ مجاہدین نے ایسی شدت سے حملہ کیا تھا کہ دشمن تاب نہ لا کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا اور پھر آخر تک مقابلہ پر نہ آیا۔ سکھ فوجیں اپنے سردار شیر سنگھ کو لانے کا بہانہ کر کے میدان سے فرار ہو گئیں۔ اس واقعہ سے دور دور تک مجاہدین کے رعب و دبدبہ کا سکہ بیٹھ گیا۔

پشاور فتح ہو گیا

اسے مسلمانوں کی بدبختی کہئے یا کوئی اور نام دیجئے کہ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ خوانین سرحد میں ایسے لوگ بھی تھے جو اسلام کی سربلندی اور جوشِ جہاد میں مخمور تھے مگر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اپنے دور افتادہ ہندوستانی بھائیوں کی تباہی کے درپے تھے جو ہزاروں میل سے پاپیادہ چل کر مسلمانوں کو ظلم و ستم کے شکنجے سے نجات دلوانے کے لئے آئے تھے۔ ان لوگوں میں خادی خاں اور پشاور کے سردار پیش پیش تھے خادی خاں تو ایک معرکہ میں مجاہدین کے ہاتھوں اپنے کیفر کردار کو پہونچ چکا تھا مگر سردارانِ پشاور ابھی تک شرارت پر آمادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو سید صاحب کو نوشہرہ میں تشریف لانے کی دعوت دی اور سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کا متحدہ منصوبہ بنایا اور در پردہ اُن کو زک پہونچانے کی سازشیں کرتے رہے چنانچہ ایک بار تو انہوں نے اپنے کسی آدمی کے ذریعہ سید صاحب کے کھانے میں زہر ملا دیا مگر حسنِ اتفاق

بکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُن کی جان بچ گئی۔ اس کے بعد جب سکھوں اور مجاہدین کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو عین وقت پر انہوں نے مجاہدین کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو عین وقت پر اُنہوں نے مجاہدین کو دھوکا دیا اور سکھ فوج سے مل گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس جنگ میں مجاہدین کو کامیابی نہ ہوسکی۔

اب اُن کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے اور انہوں نے مٹھی بھر مجاہدین کو مٹا دینے کے لئے پوری جدوجہد شروع کردی۔ چنانچہ بارہ ہزار درّانی سامانِ جنگ سے آراستہ ہوکر مجاہدین کے مقابلے کے لئے نکل آئے۔ اس وقت مجاہدین کی تعداد صرف ساڑھے تین ہزار تھی۔ مگر اُنہوں نے ایسی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ کہ میدانِ جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ مجاہدین نے ہمت کرکے درّانیوں پہ ایک بھرپور حملہ کیا اور اُن کی توپوں پر قبضہ کرلیا۔ توپیں چھن جانے سے اُن کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اور وہ بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان اُٹھا کر پسپا ہوگئے۔ اس جنگ میں کامیابی کے بعد پشاور مجاہدین کے قبضے میں آگیا۔ سیّد صاحب نے شہر میں داخل ہوکر عام معافی کا اعلان کردیا۔ اہلِ شہر نے اُن کا نہایت پرتپاک خیرمقدم کیا۔ سیّد صاحب کے شہر میں داخل ہوتے ہی عظیم الشان انقلاب آگیا۔ فسق و فجور اور ظلم و ستم کا خاتمہ ہوگیا۔ شراب کی دُکانیں بند ہوگئیں۔ طوائفیں اور فاحشہ عورتیں اپنا ناپاک روزگار ختم کرکے شریفانہ زندگی بسر کرنے لگیں۔ ہر شخص اسلامی رنگ میں رنگا گیا۔ سارے کاروبار شریعتِ اسلام کے مطابق جاری ہوگئے۔

سردارانِ پشاور کی غدّاری

سیّد صاحب کے ذریعہ سے پشاور میں جو نیک تبدیلی پیدا ہوگئی تھی وہ سردارانِ پشاور کو بہت ناگوار گذری۔ وہ لوگ اپنی سرشت کے اعتبار سے ظالم خونخوار اور سرکش تھے

مگر سید صاحب کے نظام میں ان چیزوں کو قطعاً دخل نہیں تھا۔ نئے نظام میں اُن کے ظلم وستم، لہو ولعب اور غیر اسلامی حرکات کی مطلق گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے کچھ دن تو اسے برداشت کرتے رہے مگر آخر اپنی فطرت سے مجبور ہو کر سرکشی پر آمادہ ہو گئے اور ایک سردار سلطان محمد خاں نے سازش کر کے سید صاحب کے مقرر کردہ افسروں اور آپ کے بہت سے ہندوستانی ساتھیوں کو قتل کروا دیا۔ یہ لوگ اپنی نیکی پرہیزگاری اور علم وفضل میں یگانۂ روزگار تھے اپنے ساتھیوں کی اتنی کثیر تعداد کا قتل اور سرداران پشاور کی غداری سے سید صاحب کو بہت صدمہ ہوا اور وہ دل برداشتہ ہو کر پشاور سے نکل کھڑے ہوئے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ کشمیر جا کر کسی مناسب مقام کو مرکز بنائیں گے اور لشکر کو از سرِ نو مرتب کر کے خدا اور اُس کے رسول کی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کا آغاز کریں گے۔

اسی دوران میں سردارانِ پشاور کے ایماء سے سرحد کے علماء نے سید صاحب کے خلاف فتوی جاری کرنے شروع کر دیئے۔ اُن کو مسلمانوں دشمن، لامذہب، جاہ وثروت کا بھوکا اور مسلمانوں کا خون بہانے والا ثابت کر کر کے لوگوں کو اُن کے خلاف بھڑکانے لگے علمائے سرحد کی مخالفت نے بھی سید صاحب کو مجبور کیا کہ مرکز تبدیل کر دیں۔

بالاکوٹ کو روانگی اور شہادت

چنانچہ سید صاحب مجاہدین کا قافلے کو رجب ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پہونچ کر پکھلی کے پہاڑوں میں مقیم ہو گئے یہاں کے لوگوں نے سید صاحب کی بڑی خاطر مدارات کی اور حسب ضرورت امداد کرنے کا وعدہ کیا۔ ادھر سکھوں کو بھی سید صاحب کی روانگی اور بالاکوٹ کے قیام کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ راجہ شیر سنگھ نے اپنے ٹڈی دل لشکر اور توپخانوں کو سید صاحب

کے مقابلہ کے لئے بھیج دیا جس نے سید صاحب کے لشکر سے تین چار کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ سید صاحب نے حفاظت کے خیال سے بالاکوٹ جانے والے راستہ پر پہرہ بٹھا دیا۔ مگر اس راستہ کے علاوہ ایک اور راستہ بھی تھا جسے گھانس اور درختوں نے اس طرح ڈھانپ لیا تھا کہ سوائے چند اہل شہر کے اور کسی کو علم نہیں تھا۔ راجہ شیر سنگھ کامیابی کی توقع سے ناامید ہو کر واپس جانے ہی والا تھا کہ اہل بالاکوٹ میں سے کسی نے اُسے وہ راستہ دکھا دیا۔ اور اُس نے ایک رات موقع دیکھ کر اُس راستے سے داخل ہو کر حملہ کر دیا۔ سکھ فوج سامانِ جنگ اور تعداد کے لحاظ سے مٹھی بھر بے سر و سامان مجاہدین کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ مگر اسکے باوجود اُنہوں نے سکھوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ ہر مجاہد نے دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دادِ شجاعت دی بعض بعض موقعوں پر تو سکھ سراسیمہ ہو ہو کر پسپا ہو جاتے تھے مگر مٹھی بھر آدمی ٹڈی دل کا کب تک مقابلہ کرتے آخر ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ سید اسماعیل صاحب اور سید احمد صاحب نے شیر کی طرح جھپٹ کر دشمن پر حملہ کر دیا اُن کی تلواریں دشمن کو مولی گاجر کی طرح کاٹتی چلی جا رہی تھیں۔ اس ہنگامۂ کارزار میں آپ دونوں دشمن کے نرغے میں آگئے اور اُس نے شریعتِ محمدیہ کے ان آخری جانباز اور سرفروش محافظوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس طرح ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کی خاک ان شہیدوں کے پاکیزہ اور معصوم خون سے لالہ زار بن گئی۔ جہاں آج تک یہ شیر مرد آرام کی نیند سو رہے ہیں اور اُن کی روحیں بارگاہِ ایزدی میں سرخرو ہو کر اُس کی حمد و تسبیح کر رہی ہیں۔

سید صاحب کے عادات و خصائل

سید صاحب بہت نیک، پاکباز، عبادت گذار، خدا اور اُسکے رسول کے سچے عاشق، علم و فضل میں باکمال اور اپنے زمانے کے مجدد تھے۔ رات دن عبادت و

ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ خدا کے حضور گڑگڑا کر اسلام کی سربلندی اور عالمِ اسلام کی ترقی کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ جایا کرتی تھیں۔ شرک، بدعت اور قبر پرستی سے سخت نفرت تھی۔ بہت خلیق اور ملنسار تھے ہر شخص سے نہایت خندہ پیشانی اور تواضع سے پیش آتے۔ بہت منکسر المزاج تھے۔ طبیعت میں استغنا تھا۔ دنیوی عیش و عشرت اور دولت و وجاہت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بہت محنتی اور بلا کے جفاکش تھے۔ اُن کی جفاکشی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں جب سفر انتہائی دشوار اور خطرات سے پُر ہوتا تھا وہ رائے بریلی سے چل کر جنگلوں بیابانوں، ریگستانوں اور خوفناک پہاڑوں سے ہوتے ہوئے غزنی اور کابل تک پہونچے۔ موجودہ زمانے میں اُس عہد کے ہولناک سفر کا تصور کر کے بھی انسان کی روح کانپ جاتی ہے۔

انہیں خدا کے راستہ میں کسی کام سے عار نہیں تھا۔ مٹی کی ٹوکری اُٹھاتے تھے۔ مجاہدوں کے ساتھ مل کر دیواریں بناتے تھے۔ چکی پیستے تھے اور کپڑے خود دھوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ کئی سو سال میں اُن جیسی خصوصیات رکھنے والا خدا اور رسولؐ کا سچا عاشق اور اسلام کا ایسا فدائی جو صاحب سیف بھی ہو۔ اور اہل قلم بھی سرزمین ہندوستان میں اور کوئی نہیں گذرا۔

علامہ جمال الدین افغانی

ابتدائی حالات

علامہ سید جمال الدین افغانی ۱۲۵۴ھ میں افغانستان کے علاقہ کنز کے ایک گاؤں "اسعد آباد" میں پیدا ہوئے آپ کے والد بزرگوار کا نام سید صفدر تھا۔ آپ حسینی سید تھے موصوف افغانستان کے خواص و عوام دونوں میں بہت عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کا خاندان افغانستان کے چند ممتاز خاندانوں میں سے تھا۔

تعلیم

آٹھ سال کی عمر میں سید صاحب کی تعلیم کا آغاز ہوا اور دس سال کی مدت میں علوم صرف، نحو، حدیث و فقہ، منطق و ریاضی، ہیئت و ہندسہ، کلام و بیان، فلسفہ، تاریخ، طب، الہیات وغیرہ میں مکمل دستگاہ حاصل کر لی۔ تقریباً انیس سال کی عمر میں بغرض سیاحت ہندوستان تشریف لائے اور یہاں ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک مقیم رہے۔ قیام ہندوستان کے دوران میں آپ نے یورپ کے علوم جدید اور خاص طور پر علم فلسفہ و سائنس کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ یہیں رہ کر انگریزی کی تحصیل بھی کی۔

ہندوستان سے آپ پاپیادہ حج کیلئے روانہ ہوئے اور مختلف ممالک اور اُن کے شہروں کی سیر کرتے اور وہاں کے باشندوں کے حالات معلوم کرتے ہوئے ۱۲۷۳ھ میں حجاز مقدس پہونچ گئے۔ حج کے مقدس فریضہ کی ادائیگی کے بعد آپ افغانستان واپس آگئے۔

سید صاحب کی تحریک

اٹھارھویں صدی عیسوی صرف ہندوستان ہی کے مسلمانوں کیلئے نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کیلئے

نہایت ہی منحوس صدی تھی۔ افغانستان، ایران، ترکی، عرب، مصر اور اُن کے ملحقات میں سے کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں تھا جو اپنے نالائق اور خود غرض حکمرانوں کے ہاتھوں بد نظمی، انتشار اور افلاس کے راستوں سے گذرتا ہوا غلامی کے وسیع و عریض غار کی طرف نہ جا رہا ہو۔ اسلامی ممالک کا یہ وسیع و عریض سلسلہ جو اسلامی اتحاد و اخوت کی بدولت دوسرا ہمالیہ پہاڑ بن سکتا تھا۔ ریت کے تودوں کی طرح مسمار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عالم اسلام پر ادبار و غلامی کی گھٹائیں منڈلاتی دیکھ کر ہر حساس اور غیرت مند مسلمان خون کے آنسو رو رہا تھا اور تقریباً ہر اسلامی ملک میں ایسے لوگ میدانِ عمل میں آگئے تھے جو اس عظیم الشان قوم کو اس کے بزرگوں کی میراث واپس دلانے کیلئے کوشاں تھے مگر افغانستان کی سنگلاخ سرزمین ایک ایسے جلیل القدر اور اولوالعزم انسان کو جنم دینے کا فخر حاصل کر چکی تھی۔ جو رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود سے آگے نکل کر پوری اسلامی دُنیا کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرنے والا تھا۔

سید جمال الدین افغانی کی یہی وہ خصوصیت ہے جو انہیں دوسرے ممالک کے اسلامی رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے ان کا نظریۂ آزادی صرف اپنے وطن کی ترقی و آزادی تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ اُن کا پیغام ہر اُس خطے کے لئے تھا جس میں بسنے والے اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔

سید صاحب کی اصلاحات اور اُن کی تحریک ٹھوس تجربہ اور وسیع مشاہدے پر مبنی تھیں۔ انہوں نے اپنی تحریک جاری کرنے سے پہلے تمام اسلامی ممالک کا سفر کیا اور اپنی آنکھوں سے وہاں کی حکومتوں پر مغربی طاقتوں کا اثر و نفوذ دیکھا اور سارے نقائص کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ اگر سید صاحب کی تحریک و اصلاحات کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے چار بنیادی عنصر نظر آئیں گے۔ اوّل نظم و نسق کی اصلاح۔ دوم بادشاہوں کی مطلق العنانی کا خاتمہ۔ سوم تمام اسلامی ممالک کا مضبوط اتحاد۔ چہارم

اسلامی ممالک پر سے مغربی اقوام کے اقتدار کا خاتمہ۔ یہی وہ چار بنیادی عناصر تھے جن پر سید صاحب نے اپنی تحریک آزادی کی عمارت تعمیر کی تھی۔

افغانستان میں

اُنہوں نے اپنی اصلاحات کا سلسلہ افغانستان سے شروع کیا تھا۔ کچھ تو اس لئے کہ اس سرزمین سے انہیں نسبت خاص تھی اور مادرِ وطن کے اُن پر کچھ حقوق تھے۔ دوسرے اس لئے کہ افغانستان کا محلِ وقوع جغرافیائی اعتبار سے بہت اہم تھا۔ ایک طرف ہندوستان کی جانب سے انگریز اُسے اپنے دامِ فریب میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری جانب سے روس اُسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور ان دونوں عیار دشمنوں کے درمیان سادہ لوح افغانی عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ ادھر افغانستان کے سرداروں اور شہزادوں کی باہمی چپقلش اور حصولِ اقتدار کیلئے رسہ کشی جہاں افغانستان کے عوام کو مفلوک الحال بنا کر ملک میں انتشار پیدا کر رہی تھی وہاں بیرونی طاقتوں کو بھی دست درازی کی دعوت دے رہی تھی۔

ان حالات میں سید صاحب کے فرائض بہت ہی ناخوش گوار اور حوصلہ شکن تھے اُنہوں نے کئی بار اپنی اصلاحی تحریک چلانے کی کوشش کی مگر افغانی قوم کی افتادِ مزاج کی وجہ سے انہیں پوری طرح کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور متعدد بار ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے افغانستان میں حقیقی انقلاب کی بنیادیں ضرور رکھ دیں اور افغانوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف جذبۂ نفرت کو اور بھڑکا دیا۔ افغانستان کی آخری جنگوں میں انگریزوں کی پسپائی اور بہت بڑے پیمانے پر جانی نقصان سیّد صاحب ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔

اپنی اصلاحات کے نفاذ کے بارے میں بھی وہ کسی قدر ضرور کامیاب ہوئے اور وہ افغانستان جو اپنی پس ماندگی اور بد انتظامی کی وجہ سے تاریخِ عالم میں بُری طرح

بدنام تھا۔ سید صاحب کے ہاتھوں ترقی کے راستے پر گامزن ہوگیا۔ سرکاری ہسپتالوں کا قیام اور ڈاک و رسل و رسائل میں باقاعدگی سید صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ بادشاہوں کی مطلق العنانی ختم کرنے اور انہیں ملکی معاملات میں مفید مشورے دینے کے لئے اُنہوں نے معززین ملک کی ایک مجلس شوریٰ قائم کی اس طرح اُنہوں نے افغانستان کی حکومت کو پہلی بار عوامی حکومت بنایا۔ ممالکِ غیر سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے اُنہوں نے دوسرے ممالک میں افغانستان کے سفارت خانے قائم کئے۔

یہ تھیں وہ اصلاحات جن سے افغانستان اس سے پہلے تقریباً بالکل ناآشنا تھا اور جو قطعی طور پر سید صاحب ہی کی مساعی کی رہینِ منت ہیں۔ افغانستان کا موجودہ نظم و نسق بھی بہت کچھ سید صاحب ہی کے بنائے ہوئے اصولوں پر چل رہا ہے۔

سیاح جمال الدین

افغانستان کے بعد سید صاحب کی اس عملی جدوجہد کا آغاز ہوا جس کی بناء پر انہیں عظیم سیاح کہنا پڑتا ہے اب اُن کا پیغام نسل و وطن کی قیود توڑ کر تمام عالمِ اسلام تک پہونچنے لگا۔ سید صاحب کی سیاحت کا یہ دوسرا دور تھا۔ اُن کی پہلی سیاحت جو اُنہوں نے اپنی تحریکِ آزادی جاری کرنے سے پہلے شروع کی تھی محض ایک طالب علم کی سی تھی۔

ہر سیاح کے عموماً دو ہی مقصد ہوتے ہیں اوّل کسی نئے ملک کی دریافت و دوم ممالکِ غیر کی سیر اور معلومات کی فراہمی۔ اس نقطۂ نگاہ سے سیاحوں کی صف میں سید صاحب کا کوئی بلند مقام نہیں ہے۔ کیونکہ نہ تو اُنہوں نے کوئی نیا ملک دریافت کیا اور نہ کوئی ایسا سفرنامہ چھوڑا جسے عجیب و غریب معلومات کا خزینہ قرار دیا جاسکے مگر اسکے باوجود وہ عظیم سیاح تھے۔ ان کی سیاحت کا مقصد نئے ممالک کی دریافت اور عجائباتِ روزگار کا مشاہدہ کرنے کی بجائے "دریافت شدہ" ممالک کی بدحالی

اور اسلامی سلطنتوں کے نقائص کا مشاہدہ کرتا تھا۔ دُنیا کا کوئی سیاح ایسا نہیں
ہے جو رختِ سفر باندھنے سے پہلے زادِ راہ کی فکر نہ کرتا ہو۔ جسے بڑی بڑی حکومتوں
کی امداد اور سرپرستی حاصل نہ ہوتی ہو۔ مگر مؤرخ یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا
ہے کہ سیّد صاحب کا سفر ہمیشہ خدا کے بھروسہ پر شروع ہوتا تھا اور بعض اوقات
تو اُن کی جیب ایک وقت کے کھانے کی بھی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔ جب کبھی بادشاہوں
یا سفیروں نے راستہ کے اخراجات کے لئے اُن کی خدمت میں نذرانہ پیش کئے۔ تو اُن کے
فقر نے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ ــــ "شیر جہاں جاتا ہے اپنے لئے روزی
تلاش کر لیتا ہے" ــــ

سیّد صاحب کی سیاحت کا دور افغانستان سے شروع ہو کر ہندوستان
مصر، عرب، ٹرکی، ایران، روس، لنڈن اور پیرس ختم ہوتا ہے۔ بعض تذکروں سے
اُن کا امریکہ جانا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے سفر میں اپنی آتش نوائی سے
مسلمانوں کے دلوں میں وہی آگ بھڑکا دی جس کے شعلے ساڑھے تیرہ سو برس
سے پہلے بلند ہوئے تھے۔ وہ جس ملک میں گئے وہاں کے رہنے والوں پر ایسا مستقل
اثر چھوڑ گئے جس نے کئی عظیم المرتبت رہنماؤں کو جنم دیا۔

ہندوستان میں

افغانستان سے نکل سید صاحب ہندوستان آئے یہ اُن کا
ہندوستان میں دوسری بار ورود تھا۔ ہندوستان کی
انگریزی حکومت نے اُن کا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اور بہت اعزاز و اکرام سے
پیش آئی مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کی نقل و حرکت کی نگرانی بھی کرتی رہی آخر کار ایک مہینہ
کے بعد اُنہیں اپنے ایک جہاز پر سوار کرا کر سوئیز بھیج دیا۔

دوسری بار سیّد صاحب ہندوستان آ کر دکن میں مقیم ہوئے۔ اس دوران
میں اُنہوں نے سر سید احمد خاں کے سیاسی و مذہبی عقائد کی تُند و تیز مخالفت کی ٹھان کر

مشہور رسالہ "ردِ نیچریت" حیدر آباد دکن ہی میں تصنیف ہوا تھا مگر جب انگریزوں نے مصر پر فوج کشی کی تو سید صاحب کو حیدر آباد دکن سے کلکتہ منتقل کر کے نظر بند کر دیا کہ مبادا وہ مصریوں کے حق میں پروپیگنڈا شروع کر دیں۔

مصر میں

سید صاحب کا مصر میں پہلی بار قیام بہت مختصر تھا یعنی صرف چالیس روز. مگر اس مختصر ترین عرصہ میں اُن کے لکچروں سے متاثر ہو کر جامعہ ازہر کے بیشمار طلبہ اُن کے گرویدہ ہو گئے اور مصر کے مشہور رہنما مفتی محمد عبدہٗ نے انہیں کے زیرِ اثر مصر کے نوجوانوں میں حریت کی ایسی رُوح پھونکدی جس کا ہلکا سا پرتو آج وادیٔ نیل کے اتحاد اور مصر کی آزادی میں نظر آرہا ہے مصر میں اُن کا دوسری بار قیام مصری قوم کیلئے بہت ہی حیات آفرین ثابت ہوا۔

باوجودیکہ انگریز اور اُن کے کارخدیو مصر اور اُس کے ہواخواہ سید صاحب کے شدید مخالف تھے۔ مگر اُن کی آتش بیانی اور ٹھوس تعمیری پروگرام نے نوجوان طبقے کی وابستگی کو اُن سے برقرار رکھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دیا۔ مصر میں سید صاحب کے اثر و نفوذ کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ مصر کے مشہور ترین رہنما سعد زاغلول، اعرابی اور سوڈان کے محمد احمد مہدی سید صاحب ہی کے حلقۂ تربیت و اثر سے اُٹھے تھے۔ ان لوگوں کے ذریعہ مصر نے جس قدر جدوجہد کی اور جنگِ آزادی میں جو اہم کردار کیئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ مصر میں سید صاحب کی اصلاحات کا کہاں تک خیر مقدم کیا گیا اور انہیں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی نیز حصولِ مقصد کے لئے انہوں نے کون کون سے ذرائع اختیار کیئے؟ ان سوالوں میں سے اوّل الذکر دو سوالوں کا جواب تو مصر کے حریت پسند عوام نے گذشتہ چند سالوں میں دے دیا ہے۔

حصولِ مقصد کے لئے انہوں نے جو ذرائع اختیار کیئے ان میں سے تین خاص

طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اوّل۔ نوجوانوں کی تعلیم اور اصلاح۔ دوم۔ اخلاقی انجمنوں کا قیام۔ سوم۔ تعمیری اخبارات کا اجراء۔

نوجوانوں کے تعلیمی مسائل کو سدھارنے اور اُن میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اُنہوں نے جامعہ ازہر کو اپنی سرگرمیوں اور جدوجہد کا مرکز بنایا اور نظامِ تعلیم کو نئے اصولوں پر منضبط کیا۔ جامعہ ازہر اور جامعہ کے باہر خود اُن کی قیام گاہ طلبہ کی کثرت کی وجہ سے ایک بہت بڑے تعلیمی ادارہ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ سید صاحب کے لکچروں میں اُس زمانے کے طریقِ تعلیم کے برعکس علم سے زیادہ عمل کی روح ہوتی تھی۔ وہ فلسفہ، منطق اور تاریخ کے درس میں اُس زمانے کی سیاست پر نہایت پُر از معلومات تقریریں کرتے تھے اور طلبہ کے ذہنوں کو ایسے رنگ میں تربیت دیتے تھے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اہم قومی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

مصریوں کے عام اخلاق کی اصلاح کے لئے اُن کی مشہور انجمن "محفلِ وطن" نے بھی بہت اہم فرائض انجام دیئے۔ اس محفل کے اراکین کی کوششوں اور سید صاحب کی مساعی سے سینکڑوں عیاش امراء نے شراب نوشی اور عیاشی سے کنارہ کشی کر لی۔ ہزاروں غرباء کو چوپایوں کی سی زندگی سے نکال کر انسانی سطح پر لایا گیا۔ جرائم کی رفتار میں حیرت انگیز طور پر کمی ہو گئی۔

صحافی جمال الدین

سید صاحب کی تحریک کا ایک اہم جزو اسلامی ممالک میں اخبارات کا اجراء اور اُن کا صحت مند ارتقا بھی تھا۔ وہ ان چند اسلامی رہنماؤں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے اس نکتے پر غور کیا تھا کہ اخبارات کے بکثرت اجراء کے بغیر مسلمان حقیقی طور پر آزاد نہیں ہو سکتے

کیونکہ اٹھارھویں صدی عیسوی مغربی اقتدار کے عروج کی صدی تھی اور مغربی اقتدار کے عروج میں تجارت، علوم جدیدہ اور اخبارات کو بہت بڑا دخل تھا اسلامی سلطنتوں کے انتشار اور بے خبری کو دُور کرنے اور اپنے پیغام کو دُنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ تک پہونچانے کے لئے سید صاحب کی نظر میں اخبارات سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے افغانستان میں جہاں ایک اخبار بھی نہیں نکلتا تھا اس "بدعت" کا آغاز کیا۔ "شمس النہار" وہ پہلا اخبار ہے جس نے افغانستان کے بیسیوں دُور اُفتادہ قبائل کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا اور شمال کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا افغانی جنوب کے دوسرے گوشہ میں بیٹھے ہوئے افغانی کی حالت سے باخبر ہونے لگا۔ اس اخبار کے ذریعہ سے سید صاحب نے اپنی تحریک واصلاحات کی اشاعت کی اور افغانوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا جو اُن کی آزادی غصب کرنے کے لئے اُن کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔

سید صاحب نے افغانستان سے مصر جا کر اہل مصر پر بھی اس نکتہ کو واضح کیا کہ اخبارات قوم کی سیاسی زندگی میں عظیم الشان انقلاب برپا کرتے ہیں اور موجودہ دور میں خاص طور پر صحت مندانہ تنقید کرنے والے اخبارات کا وجود نہایت ضروری ہے۔ اُس وقت مصر میں ایک دو چھوٹے چھوٹے اخبار تھے جو بعض لوگوں نے اپنے مفاد کے لئے جاری کئے تھے۔ ان کی اشاعت بھی بہت معمولی تھی اور ان اخباروں میں ملک و قوم کی فلاح و بہبود اور عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے کوئی معمولی سی بات بھی نہیں ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اُس وقت مصر میں ایسا کوئی اخبار نہیں تھا۔ جو وہاں کے ارباب حکومت پر صحت مندانہ تنقید کرتا اور عوام کو اُن کے اصل فرائض سے آگاہ کرتا۔

سید صاحب نے مصری صحافت کو اُس کی ٹھوس اور تعمیری بنیادوں پر پہلی بار استوار کیا اور اپنے دورانِ قیام میں کئی اخبار نکالے جن میں "مصر" سب سے زیادہ کثیرالاشاعت اخبار تھا جو سید صاحب کے ایک تربیت یافتہ شامی نوجوان اسحٰق ادیب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس اخبار نے خدیو مصر کے مظالم، اُس کی عیش پرستی اور انگریزوں کے ساتھ سازباز کو بے نقاب کر کے مصریوں کے سامنے اُس کے اصلی خدوخال ظاہر کر دیئے۔

افغانستان اور مصر کے علاوہ سید صاحب نے پیرس کے دورانِ قیام میں وہاں سے بھی ایک ہفتہ وار اخبار "العروۃ الوثقیٰ" جاری کیا اس کا پہلا پرچہ ۲۵ر جمادی الاوّل ۱۳۰۱ھ کو نکلا تھا۔ مصر کے مفتی محمد عبدہٗ اور مرزا باقر سید صاحب کے معاونین میں سے تھے۔ یہ رسالہ سید صاحب کے مسلک اور اُن کی تحریک کا ترجمان تھا عالم اسلام کی بیداری اور مغربی طاقتوں کی ہوسِ اقتدار کا تدارک اسکے اہم موضوع تھے۔ اس رسالہ کے مضامین اور خصوصاً سید صاحب کے مقالات اس قدر آتش بار ہوتے تھے کہ حکومت برطانیہ اور مصر دونوں بلبلا اُٹھے۔ پہلے تو ہندوستان اور مصر میں اسکا داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا اور پھر حکومت فرانس نے اسے بند کر دیا۔

روس میں

"العروۃ الوثقیٰ" بند ہو جانے کے بعد سید صاحب روس تشریف لے گئے اور "سینٹ پیٹرسبرگ" میں تقریباً چار سال مقیم رہے روس کی حکومت اور زار روس نے سید صاحب کی بڑی قدرو منزلت کی اور اُن کے اعزاز و اکرام کا بے حد خیال رکھا۔ اُس وقت روس کے مسلمان حکومت کے معتوب تھے۔ اُنہیں سخت اذیت دی جارہی تھی۔ کوئی ظلم ایسا نہیں تھا جو اُن پر روا نہ رکھا جاتا ہو۔ انتہا یہ ہے کہ انہیں اپنی مذہبی کتابیں تک چھاپنے کی اجازت نہیں تھی۔ سید صاحب روس کے مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر تڑپ اُٹھے اور اُن کی امداد پر کمر بستہ

ہو گئے۔ چنانچہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اُنہوں نے روسی حکام اور وزراء کو سمجھایا اور اتنا دباؤ ڈالا کہ اُنہوں نے مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے دی۔ اور وہ تشددِ بے جا سے نجات پا گئے۔ تمام عالمِ اسلام عموماً اور روس کے مسلمان خصوصاً سید صاحب کے اس عظیم کارنامے پر اُن کی روح کو جتنا بھی خراجِ عقیدت پیش کریں کم ہے۔

سید صاحب ابھی روس ہی میں مقیم تھے کہ ایران کا بادشاہ ناصر الدین قاچار سیر و سیاحت کے لئے واردِ روس ہوا۔ اور سید صاحب کے کمالِ علم و فضل کے پیشِ نظر اُن کی بڑی قدر افزائی کی اور بڑے اصرار سے اپنے ساتھ ایران چلنے پر رضامند کر لیا۔ اور وعدہ کیا کہ میں آپ کو ایران کا صدرِ اعظم مقرر کردوں گا۔

ایران میں

کچھ عرصے تک تو سید صاحب اور شاہِ ایران میں خوشگوار مراسم قائم رہے۔ مگر رفتہ رفتہ معاملات بگڑنے لگے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ناصر الدین قاچار ایک ظالم اور عیش پرست بادشاہ تھا اور سید صاحب بادشاہوں کی مطلق العنانی اور استبداد کے سخت مخالف تھے۔ طبائع کا یہ اختلاف رنگ لایا اور دونوں ایک دوسرے سے کبیدہ خاطر رہنے لگے۔ یہ دیکھ کر سید صاحب نے شاہ سے یورپ جانے کی اجازت مانگی مگر ناصر الدین نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ سید صاحب نے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر شاہ عبدالعظیمؒ کی درگاہ کا رُخ کیا اور وہاں مقیم ہو گئے۔ یہ درگاہ ایران میں دارالامان سمجھی جاتی تھی۔ اگر خطرناک سے خطرناک مجرم بھی اس درگاہ میں پناہ لے لے تو اس سے تعرض نہیں کیا جاتا تھا مگر ناصر الدین سید صاحب سے اس قدر برگشتہ ہو چکا تھا۔ کہ اُس نے پانچ سو مسلح سواروں کو بھجوا کر سید صاحب کو بیماری کی حالت میں گرفتار کروا لیا۔ سواروں نے اُن کے ساتھ نہایت ذلت آمیز سلوک کیا اور انہیں پابندِ سلاسل کر کے

ترکی کی سرحد پر چھوڑ دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۹۰ء کے آخر کا ہے۔

سید صاحب ایران سے نکل کر تقریباً ڈیڑھ سال تک یورپ میں پھرتے رہے اور پھر ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ چلے گئے۔

ترکی میں

سید صاحب اس سے پہلے بھی ایک بار تقریباً چھ ماہ تک قسطنطنیہ میں مقیم رہے تھے مگر وہاں کے شیخ الاسلام کے ساتھ مذہبی نظریات میں اُن کا کچھ اختلاف ہو گیا تھا اسلئے وہاں کے حکام نے مصلحتاً انہیں ترکی سے چلے جانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ ترکی سے مصر چلے گئے تھے۔ مگر اس بار جب وہ ترکی گئے تو وہاں کے عوام و خواص اور اعیانِ حکومت نے اُن کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور سلطان عبد الحمید خاں والی ترکی نے انہیں اپنے مقربین خاص میں داخل کر لیا۔
مگر انہیں دنوں مرزا رضا کرمانی نے جو سید صاحب کا بڑا معتقد تھا شاہ ایران ناصر الدین قاچار کو قتل کر دیا۔ مرزا رضا کرمانی کو تو پھانسی دے دی گئی مگر حکومتِ ایران نے تحقیق و تفتیش کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ رضا کرمانی کے علاوہ سید جمال الدین افغانی اور اُن کے رفقاء مرزا آقا خاں، شیخ احمد کرمانی اور حاجی مرزا حسن خاں بھی اس قتل کی سازش میں شریک ہیں یہ سب لوگ ان دنوں ترکی میں مقیم تھے چنانچہ ایران حکومت کے مطالبہ پر سید صاحب کے تینوں رفقاء کو تو ایران کی حکومت کے حوالے کر دیا گیا مگر سید صاحب کو صرف گرفتار کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ چنانچہ ۵ مئی ۱۸۹۶ء کو حکومت ترکی کے حکم سے انہیں قسطنطنیہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ایک خاص عدالت کے سامنے پیش کیا گیا جہاں اُن کے بیانات ہوئے۔ مگر عدالت کی نظر میں اُن کا جرم ثابت نہیں ہوا۔ اس لئے اُنہیں بری کر دیا گیا۔

وفات

رہائی کے کچھ عرصے بعد سید صاحب کی گردن پر پھوڑا نکلا۔ ڈاکٹروں نے اسے سرطان تجویز کیا۔ سلطان عبد الحمید خاں نے اپنے طبیبِ خاص

اسکندر پاشا کو علاج پر مامور کیا مگر مرض شدت اختیار کرتا گیا اور ۹ مارچ ۱۸۹۷ء
کو دنیائے اسلام کا یہ آتش بیان مقرر، جید عالم اور عظیم المرتبت رہنما عالم جاودانی
کی طرف روانہ ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ سید صاحب کی موت میں سلطان عبدالحمید خاں کا بھی
ہاتھ تھا کیونکہ سلطان موصوف اُن سے بہت خائف رہتا تھا اور جب سے اُنکے ایک
عقیدتمند رضا کرمانی نے ناصرالدین قاچار کو قتل کیا تھا وہ اُن کی نسبت مشکوک ہو گیا تھا
اور اُن کے وجود کو اپنے اور اپنے ملک کیلئے مضر خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اسکندر پاشا
سے کہہ کر زخم کو بگڑوا دیا تھا جس نے آخر کار اُن کی جان ہی لے لی۔ واللہ اعلم۔

عادات و خصائل

سید صاحب بہت خود دار، راستباز اور حق گوئی و بیباکی کا مجسمہ تھے۔ صبر و قناعت اور استغنا اُن کی
سیرت کے نمایاں جوہر تھے، مزاج میں غصہ تھا بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بہت مغلوب
الغضب انسان تھے۔ نہایت جذباتی اور بہت جلدی مشتعل ہو جانے والے۔ مگر اسکے
باوجود بہت خلیق اور ملنسار، تمکنت کے باوصف بہت منکسر المزاج۔ ادنی و اعلیٰ ہر ایک
سے بہت شفقت اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ بہت رات گئے سوتے تھے۔ اور
علی الصبح بیدار ہو جاتے تھے۔ لکھنا اور پڑھنا اُن کے دو ہی شغل تھے۔ مطالعہ کے معاملہ
میں حد اعتدال سے بھی تجاوز کر گئے تھے۔ اُن کا لباس قسطنطنیہ کے علماء کا سا ہوتا تھا
کھانا بہت کم کھاتے تھے یعنی دن میں ایک بار۔ البتہ چائے بہت زیادہ پیتے تھے۔
سگریٹ اور سگار کا بھی استعمال کرتے تھے۔ سگریٹ پر سگار کو ترجیح دیتے تھے۔
بہت ذہین اور غیر معمولی دل و دماغ کے انسان تھے۔ دُنیا کی سات زبانوں میں گفتگو
کرنے پر قادر تھے۔ عربی، فارسی، پشتو، انگریزی، فرنچ، ترکی اور رُوسی اُن کی تحریر
اور تقریر دونوں میں بڑا جوش، ولولہ اور آگ کے شعلے پوشیدہ ہوتے تھے۔ وہ
بہت فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ اور یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اپنے ایشیائی معاصرین میں

اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

تصانیف اُن کی تصانیف میں دو کتابیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ تاریخ افغانستان۔ یہ فارسی زبان میں تھی۔ مصر میں اس کا عربی ترجمہ کیا گیا۔ اور ۱۹۰۱ء میں وہیں سے شائع ہوا۔ اس کا اُردو ترجمہ ۱۳۴۲ھ میں صوفی پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔

۲۔ "رسالہ ردِ نیچریاں"۔ یہ سید صاحب نے حیدرآباد دکن میں فارسی زبان میں تصنیف کیا تھا۔ اور پھر مصر میں خود ہی عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ اور مضامین بھی لکھے تھے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ فرانسیسی مستشرق رینان کے ساتھ اُن کا جو مباحثہ ہوا تھا وہ بھی اُن کے قابلِ قدر لکچروں کا مجموعہ ہے اور انگریزی عربی اور اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے ؀

سرسیدؒ احمد خاں

ابتدائی حالات

سرسید احمد خاں ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد بزرگوار کا نام میر متقی تھا۔ سادات کے حسینی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت آزاد منش اور درویش سیرت بزرگ تھے۔ مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں بہت رسوخ تھا۔ دہلی کے بہت بااثر اور ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ فن تیر اندازی اور تیراکی میں کمال حاصل تھا۔

تعلیم

باپ کی آزادہ روی اور بے فکری کی وجہ سے سرسید کی تعلیم و تربیت اُن کی قابل اور نیک سرشت والدہ نے کی، قرآن شریف ختم کرنے کے بعد انہیں مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں انہوں نے فارسی کی ابتدائی کتب گلستاں بوستاں اور معمولی عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں اُنہوں نے مدرسہ کی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ سرسید ابتدا میں تعلیم کی طرف سے لاپرواہی برتتے تھے۔ مگر مدرسہ سے نکلنے کے بعد اُنہوں نے تعلیم کی طرف بطورِ خود توجہ دی اور اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کی کتب کا بھی مطالعہ شروع کیا۔ پھر امام بخش صہبائی، مرزا غالب اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ جیسے جید علماء اور باکمالوں کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہیں روز بروز علم کا شوق پیدا ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ اُنہوں نے عربی و فارسی کی قابل ذکر تمام کتابیں ختم کر لیں اور ان زبانوں پر پورا عبور حاصل کر لیا۔

حصول معاش

۱۸۳۶ء میں سرسید کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے انتقال کے ساتھ ہی اس خاندان کی مالی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ مغلیہ دربار کی طرف سے ایک قلیل سا وظیفہ سرسید کی والدہ کے نام جاری

کر دیا گیا اور بس اس وقت سرسید کی عمر بائیس سال کے قریب تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے ملازمت کی طرف توجہ کی اور اپنے خالو کی کچہری میں جو اُس وقت دہلی میں صدر امین تھے کام سیکھنا شروع کر دیا۔ چند ہی ماہ کے بعد انہیں سررشتہ دار مقرر کر دیا گیا۔ ۱۸۳۹ء میں آگرہ کے کمشنری دفتر میں نائب منشی کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے عدالت دیوانی کے قوانین کا مطالعہ کیا اور اس پر پوری طرح عبور حاصل کر لیا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں انہیں مین پوری کا منصف مقرر کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد انہیں مین پوری سے تبدیل کر کے فتح پور سیکری بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد بسلسلۂ ملازمت انہیں دلی، رہتک، بجنور، مراد آباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں وہ بالترتیب قائم مقام صدر امین، مستقل صدر امین، صدر الصدور اور آخر میں عدالتِ خفیفہ کے جج کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

قومی خدمات

سرسید بجنور میں صدر امین تھے کہ میرٹھ اور پھر دہلی میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کر دی۔ جب اس بغاوت کی خبر بجنور میں پہونچی تو یہاں بھی بغاوت ہو گئی۔ اُن دنوں بجنور میں کچھ انگریز اور انکے اہل و عیال بھی مقیم تھے۔ بغاوت کے دوران میں ہندوستانی فوجیں اور عوام دونوں انگریزوں کے جانی دشمن تھے اور انہیں جہاں دیکھتے تھے تکا بوٹی کر ڈالتے تھے۔ سرسید کے دل میں انسانی ہمدردی اور امن پسندی کے جذبات عام لوگوں سے زیادہ موجزن رہتے تھے۔ اسلئے وہ مٹھی بھر نہتے اور کمزور (اُس وقت کے حالات کے مطابق) انگریزوں کا جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے بیدردی سے قتل کیا جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ دوسرے اُن کی دور اندیش اور دور بین نظر دیکھ رہی تھی۔ کہ ہندوستانی کئی اسباب بدانتظامی اور باہمی اختلاف کی وجہ سے اس جنگ

میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے اُنہوں نے بجنور میں مقیم انگریزوں کی حفاظت کا ہر قیمت پر فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلے میں انہیں طرح طرح کی مصیبتیں اُٹھانی پڑیں۔ اور خود بھی اُن کے ساتھ کئی کئی روز تک پوشیدہ رہنا پڑا۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور اُن کے حسنِ تدبّر سے بیس انگریزوں کا مختصر سا قافلہ بجنور سے نکل کر بحفاظت رُڑکی پہونچ گیا۔

سر سید کا یہ اقدام بظاہر تو انگریزوں کی حمایت میں تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ بعد کے واقعات نے اُن کے اس اقدام کی تائید کر دی۔ اُن کے اس اقدام کا ہندوستانی کے مسلمانوں کو غیر معمولی فائدہ پہونچا۔ بیس انگریزوں کی جان بچا کر وہ انگریزوں کی نظر میں اُن کے بہت بڑے محسن، وفادار اور سچے بہی خواہ قرار پائے۔ اور اُنہوں نے سر سید کی بڑی قدر و منزلت کی۔ انگریزوں کی دل میں اپنے لئے جگہ حاصل کرنے کے بعد اُنہوں نے ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کی خستہ حالی کی طرف توجہ کی۔ بغاوت کے خاتمہ کے بعد، بغاوت کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر ڈال دی گئی۔ بے شمار مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اُن کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اُن پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اور وہ کس مپرسی کی حالت میں ایڑیاں رگڑنے لگے۔ یہی وہ نازک وقت تھا جب سر سید مسلمانوں کی امداد کیلئے میدان میں کود پڑے اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مسلمانوں کو مزید تباہی سے بچا لیا۔ اُس اثر و رسوخ سے کام لے کر جو اُنہوں نے انگریزوں کی جانیں بچا کر برطانوی حکومت پر قائم کیا تھا۔ اُنہوں نے بڑے مدلل طریقے سے انگریزوں کے دل سے اس غلط خیال کا ازالہ کیا کہ بغاوت کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اُنہوں نے "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر اہلِ ہند کی بالعموم اور اہلِ اسلام کی بالخصوص بہت بڑی خدمت کی۔ اپنے اس رسالہ میں انہوں نے بغاوت اور اُس کے اسباب پر سیر حاصل بحث

کی اور بتایا کہ اس بغاوت میں جہاں ہندوستانیوں کی عدم واقفیت اور جہالت کو دخل تھا وہاں انگریزوں کی تنگ نظری اور غلط پالیسی کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ اُن کی مساعی جمیلہ بار آور ثابت ہوئیں مسلمان اس جرم سے بری قرار دیئے گئے اُن کی اندھا دھند پھانسیوں اور املاک کی ضبطی کے احکامات منسوخ ہو گئے اور وہ ایک بار پھر اطمینان اور آرام کا سانس لینے لگے۔

سرسیّد کی تعلیمی تحریک کا اجراء

انگریزوں کے ذہن سے مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیاں دور کرنے کے بعد سرسید نے قوم کے تعلیمی اور معاشرتی مسائل کی طرف توجہ دی۔ اس سلسلے میں اُن کا سب سے اہم کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا شوق پیدا کرنا ہے۔ اُس وقت تک کچھ تو بغاوت کے اثرات باقی تھے اور مسلمان انگریزوں سے سخت متنفر تھے۔ کچھ قدامت پسند مسلمان اور مولوی حضرات انگریزی تعلیم کے حصول کو اسلامی تعلیمات کے لئے مضر سمجھتے تھے اور کچھ یہ بھی تھا کہ مسلمان قوم بہ حیثیت مجموعی بہت غافل اور تعلیم سے بے پرواہ تھی۔ برعکس اس کے ہندوستان کی دوسری اقوام اپنی سوشل تنظیموں کے تحت اپنے آپ کو بلند سطح پر لا رہی تھیں خصوصاً تعلیم کے معاملے میں مسلمانوں سے منزلوں آگے نکل گئی تھیں۔ ہمسایہ اقوام کے افراد اسکولوں اور کالجوں سے نکل کر سرکاری دفتروں یا تجارتی اور صنعتی شعبوں کا رُخ کر رہے تھے اور مسلمان اپنی بے کسی و بے بسی کا ماتم کر رہے تھے۔ سرسید مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس کیا اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کے لئے عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اُس وقت مسلمانوں کے لئے کوئی ایسی درسگاہ نہیں تھی جس میں انگریزی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور تمدنی سرمائے کی بقا کا بھی خیال رکھا گیا ہو۔ اگر چند

روشن خیال مسلمان اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے بھیج بھی دیتے تھے۔
تو وہ جس ماحول میں تعلیم حاصل کرتے تھے وہ قطعاً غیر اسلامی ہوتا تھا جہاں اُن کے
ذہنی نشو و نما کے وقت بعض ایسے خیالات بھی جڑ پکڑ لیتے تھے جو اسلامی نظریات
کے بالکل منافی ہوتے تھے۔ اور اُن کی آئندہ زندگی پر بُری طرح اثر انداز ہوتے تھے۔
پھر یہ کہ ان اداروں میں ایسی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جن میں سے بیشتر غیر مسلم
اور متعصب اہل قلم کی لکھی ہوتی تھیں۔ جن کا مطالعہ مسلمان طلبہ کو اُن کے مذہب
اور اکابرین دونوں سے متنفر کر دیتا تھا۔

یہ تھے وہ محرکات جنہوں نے سر سید کے خیالات کو اس نقطے پر مرکوز کر دیا
کہ جب تک مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ دار العلوم قائم نہیں کیا جائے گا اُس وقت
تک وہ تعلیم یافتہ مسلمان نہیں بن سکیں گے۔ سر سید مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا
شوق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اُن زبانوں کو بھی زندہ رکھنا چاہتے تھے جن میں اُن کے
علمی و ادبی اور تہذیبی سرمایہ موجود تھے یعنی عربی و فارسی۔ چنانچہ انہوں نے قیام
مراد آباد کے زمانے میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ ۱۸۵۹ء کا واقعہ ہے۔ وہ
جہاں رہے انہیں قوم کی تعلیم و تربیت کی فکر دامن گیر رہی چنانچہ ۱۸۶۲ء میں جب
وہ غازی پور میں تھے انہوں نے وہاں بھی ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو آج تک "وکٹوریہ
اسکول" کے نام سے جاری ہے۔ سر سید نے علمی ترقی کے معاملے میں کہیں تنگ
نظری اور تعصب سے کام نہیں لیا اور مسلمانوں کی روش بروش غیر مسلم اقوام
کو بھی ترقی کے مواقع دیئے اور اُن کے قومی احساسات کو بھی ملحوظ رکھا۔ چنانچہ
غازی پور کے مدرسہ میں داخل ہونے کی اُنہوں نے ہر طالب علم کو اجازت دی
خواہ وہ کسی مذہب و ملّت سے تعلق رکھتا ہو۔ اُنہوں نے اس مدرسہ میں اُردو
فارسی عربی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان کی کا بھی انتظام

کیا یہ امر اُن کی عالی ظرفی اور وسیع القلبی کی بیّن دلیل ہے۔

سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام

سرسید یہ محسوس کر رہے تھے کہ اُردو کا دامن غیر زبانوں کے علمی ذخائر سے خالی ہے اور جب تک اُس کے دامن میں یہ ذخائر نہ آجائیں اُس وقت تک وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ہندوستان کا وہ طبقہ جو انگریزی اور یورپ کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے نا آشنا ہے ان علوم سے اسی صورت میں استفادہ کر سکتا ہے جب انہیں اُردو یا فارسی کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اُنہوں نے غازی پور میں ایک "سائنٹیفک سوسائٹی" قائم کی۔ اس سوسائٹی کا قیام سرسید کا بہت بڑا کارنامہ ہے جسے اُردو اور فارسی زبان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس سوسائٹی کے تحت انہوں نے غیر زبانوں کی بیسیوں کتابوں کو اُردو اور فارسی میں ترجمہ کروا کر ان زبانوں کو جدید علوم کا خزانہ بنانے میں نمایاں پارٹ ادا کیا۔ ان ترجموں میں الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رومن کی تاریخ مصر قدیم، تاریخ یونانِ قدیم، اسکاٹ برن کا رسالہ علمِ فلاحت، سنپ کر کا رسالہ سیاست مدن اور الونڈایکوس کی تاریخ چین کا فارسی ترجمہ بہت مفید اور معلومات افزا ترجمے ہیں۔ سرسید نے اس سوسائٹی کی ترقی کیلئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور یہاں تک کہ اپنا ذاتی پریس جو اُنہوں نے آٹھ ہزار روپے کی لاگت سے قائم کیا تھا کتابیں چھاپنے کیلئے سوسائٹی کی نذر کر دیا۔ سوسائٹی کی مزید امداد کیلئے اُنہوں نے قانون کے طالبعلموں کو لکچر دینا شروع کیا اور معاوضہ میں ملنے والی رقم اس سوسائٹی کو دیتے رہے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

تعلیمی ترقی کے سلسلے میں سرسید کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے علی گڑھ

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اخبار انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف سے اُس وقت نکالا تھا جب وہ غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آگئے تھے یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا مگر بعد کو ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا تھا۔ اس اخبار میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کیلئے حکومت کو مفید مشورے دئے جاتے تھے اُس کے سامنے مختلف اسکیمیں رکھی جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سائنٹیفک سوسائٹی میں جو لکچر دیئے جاتے تھے وہ بھی اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اس اخبار کے ذریعے سے شائقین علم وادب تک پہونچتے تھے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو دراصل یہ سب مختلف سیڑھیاں تھیں اس بلند منزل پر پہونچنے کیلئے جسکی پہلی منزل مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ دار العلوم کا قیام تھا۔

انگلستان کو روانگی

اس حصے کا آغاز یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو اسوقت ہوا جب وہ انگلستان روانہ ہوئے۔ سر سید یورپ کے طریقۂ تعلیم کا گہری نظر سے مشاہدہ کر کے اس میں اپنے ملک و قوم کے مزاج کے مطابق مناسب تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر اس طریقے کو یہاں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جدید طریقۂ تعلیم جو سائنٹیفک بھی ہے طلبہ کے لئے زیادہ دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے لندن پہونچ کر وہاں کے تعلیمی مراکز تجربہ گاہیں اور لائبریریاں دیکھیں۔ ان میں درس و تدریس کے طریقوں کا مشاہدہ کیا اور اُس فضا اور ماحول کا جائزہ لیا جس میں رہنے والوں کا شوق تعلیم دیوانگی کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ انگلستان سے واپس آکر انہوں نے اپنے تجربہ کی روشنی میں اپنی اسکیم کو عملی شکل دینے کی جدوجہد شروع کی۔

"تہذیب الاخلاق کا اجراء"

اُن کے اس سلسلے کی پہلی کڑی "تہذیب الاخلاق" کا اجراء ہے۔ سر سید طویل تجربہ بعد

غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہونچ چکے تھے کہ مسلمان قوم کا علومِ جدیدہ سے متنفر ہونا دراصل ان کی جہالت اور غلط عقائد کی وجہ سے ہے جب تک ان عقائد کا بطلان نہ کیا جائے اُس وقت تک وہ علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف راغب نہیں ہوں گے گویا اُنہوں نے مسلمانوں کی علمی ترقی کے ساتھ ساتھ اُن کی معاشرتی اور اخلاقی ترقی کی طرف بھی توجہ دی اُن کے خیالات و عقائد میں بھی انقلابِ عظیم پیدا کرنا چاہا۔ چنانچہ "تہذیب الاخلاق" کے پُرانے فائل آج بھی اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے ہزاروں ہزار مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود نہایت جراٗت اور استقلال سے مسلمانوں کے اُن غلط عقائد کی تردید اور اصلاح کی جو مذہب سے بالکل تعلق نہیں رکھتے تھے مگر کم سواد مولویوں نے انہیں مذہب کا جزو بنا دیا تھا۔ اُنہوں نے قرآن اور حدیث کی رُو سے غیر مذاہب کے ایسے علوم کی تحصیل کو جائز ثابت کیا جن کا حاصل کرنا دنیوی ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہو۔ اس کے ساتھ غیر اسلامی اور فضول رسم و رواج کو ترک کرنے کے لئے بڑے پُر زور مضامین لکھے۔

اُس زمانے میں عیسائی مشنریوں کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں پر قدامت پرستی اور تنگ نظری کے الزام لگا لگا کر اُنہیں مطعون کیا جا رہا تھا۔ سر سید نے اپنے اسی "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ سے مشنریوں کو دنداں شکن جوابات دیئے اور اسلامی تعلیمات کی رُو سے، ثابت کیا کہ اسلام قدامت پرستی اور تنگ نظری دونوں کے خلاف ہے۔ غرض یہ کہ سر سید کے "تہذیب الاخلاق" نے مسلمانوں کے خیالات میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ ابتدا میں اُن کا مذاق اُڑایا گیا۔ انہیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ اُن پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ مگر رفتہ رفتہ سمجھدار اور روشن خیال مسلمانوں نے اُن کی آواز پر

لبیک کہی۔ اُن کے رجحانات میں صحت مند تبدیلی پیدا ہونے لگی اور سرسید کی کوششیں اثر دکھانے لگیں۔

چندہ کی فراہمی

جب میدان ہموار ہوگیا تو سرسید نے قوم کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی اس کمیٹی نے مسلمان امراء اور صاحب حیثیت لوگوں سے چندہ وصول کرنے کا کام شروع کیا۔ اس طرح مسلمانوں کیلئے علیحدہ دارالعلوم قائم کرنے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی حکومت پر اپنی گذشتہ خدمات کا اثر ڈال کر دارالعلوم کیلئے ایک زرکثیر کی منظوری لے لی۔ اسکے بعد انہوں نے صوبہ جات متحدہ، پنجاب، صوبہ متوسط، دکن اور بہار کے بکثرت شہروں کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو جمع کر کے نہایت ہی دردمندانہ لہجے میں قوم کی بے بسی اور تعلیم کی کمی پر روشنی ڈالی۔ اس سلسلے کی مشکلات اور اس کا حل دونوں چیزیں پیش کیں۔ بکثرت جگہوں پر اُن کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ خلوص و محبت سے بھرے ہوئے سپاسنامے پیش کئے گئے۔ انہیں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا گیا اور لوگوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر مالی امداد دی۔ مگر بعض جگہ انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جلسوں میں ہڑبونگ مچائی گئی۔ خشت باری کی گئی۔ انہیں ذلیل کرنے اور نیچا دکھانے کی کوششیں کی گئیں۔ علماء نے فتوے لگائے۔ عوام نے گالیاں دیں۔ معاصرین نے آوازے کسے۔ مگر نوجوانوں کا سا حوصلہ رکھنے والا یہ بوڑھا سید ہر خطرے سے کھیلتا اور ہر فتوے پر مسکراتا نہایت ثابت قدمی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا اور آخر کار ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں اُس دارالعلوم کی بنیاد رکھ دی جو مستقبل قریب میں ایشیا کی ممتاز یونیورسٹیوں میں شمار کیا جانے والا تھا اور جسکے دامن علم میں تربیت پانے والے نونہال ایک دن دُنیا کی عظیم اسلامی حکومت کی اہم ذمہ داریوں سے

عہدہ برآ ہونے والے تھے۔

وفات

باوجودیکہ سرسید کی عمر اسّی سال کے قریب ہو چکی تھی مگر اس عمر میں بھی اُن کی صحت قابلِ رشک تھی اور بظاہر مرنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مگر انہیں پے درپے دو صدمے برداشت کرنے پڑے جنہوں نے انہیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا لیا۔ پہلا صدمہ۔ کالج کے روپیہ میں غبن کا تھا۔ سرسید نے جس محنت سے روپیہ جمع کیا تھا اور اس راستہ میں جو پریشانیاں اُٹھائی تھیں۔ ہم آج شائد اُن کا اندازہ نہ کر سکیں۔ رات دن کی محنتِ شاقہ سے جمع کی ہوئی رقم میں سے دفتر کے ایک ہندو ہیڈ کلرک نے ایک لاکھ سے کچھ اوپر روپیہ خرد بُرد کر دیا۔ اس غبن سے جو سرسید کا ذاتی نقصان نہیں تھا بلکہ پوری قوم کا نقصان تھا اُن کے دل و دماغ پر بہت بُرا اثر پڑا۔ انہیں زبردست دھکا لگا جسے وہ آخر تک فراموش نہ کر سکے۔ اگر یہی تنہا ایک صدمہ ہوتا تو شاید وہ برداشت کر لیتے مگر اُسکے کچھ عرصہ بعد اُن کا عزیز بیٹا جسٹس محمود جو تمام قوم کو عزیز تھا جسکی قابلیت، تدبر اور دانشمندی سے کون ہے جو واقف نہیں اپنی قوم اور بوڑھے باپ کو داغِ مفارقت دے گیا۔ اس صدمۂ جانکاہ نے سرسید کو بالکل مضمحل کر دیا۔ وہ بہت برداشت کے آدمی تھے اسلئے اُنہوں نے اس صدمے کے اثرات کو ظاہر نہیں ہونے دیا مگر یہ غم اندر ہی اُنہیں کھا گیا۔ اور تین روز بیمار رہ کر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو رات کے دس بجے انتقال کر گئے۔

سرسید کے علمی کارنامہ

سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم کا شوق عام کرنے اور اُن کے لئے ایک دارالعلوم قائم کرنے کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کی طرف بھی توجہ کی اور اس سلسلے میں بعض بہت ہی قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے۔ جس زمانے میں وہ دلی میں

منصف تھے اُنہوں نے "آثار الصنادید" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں دلی کی تاریخی عمارتوں کے حالات نہایت تلاش و تحقیق اور جانفشانی سے قلم بند کئے یہ کتاب اپنی افادیت اور موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر گنجینہ بے بہا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کا دوسرا علمی کارنامہ خطباتِ احمدیہ کی تصنیف ہے۔ ایک یورپین اہل قلم سر ولیم میور نے "لائف آف محمدؐ" لکھ کر اسلام کو بیحد مطعون کیا تھا۔ اور بقول عیسائیوں کے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا تھا۔ سر سید نے اس کتاب کا جواب لکھنے کیلئے اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔ اسی مقصد سے انگلستان گئے۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریری سے اہم کتابیں حاصل کیں اور ضروری مواد فراہم کر کے بارہ خطبوں میں "لائف آف محمدؐ" کا نہایت مدلل جواب لکھا اور پھر ایک فاضل انگریز سے ترجمہ کروا کر انگلستان ہی میں شائع کر دیا۔ سر سید کی اس تصنیف "خطبات احمدیہ" نے اسلام کے متعلق وہ تمام غلط فہمیاں دُور کر دیں جو "لائف آف محمدؐ" کے مطالعہ سے یورپ کے لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ اسلام کی بہت بڑی خدمت تھی جو سر سید کے ذریعہ سے انجام پائی۔ اسکے علاوہ اُن کے قلم سے بعض اور بھی قابل قدر کتابیں لکھی گئیں جن میں سے تاریخ سرکشی بجنور رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، تفسیر القرآن، فوائد الافکار، قولِ متین، کلمۃ الحق، راہِ سُنت، مسئلہ تصوف شیخ اور سلسلۃ الملوک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

طرزِ تحریر

سر سید کا طرز تحریر نہایت سادہ، عام فہم اور مہذب ہوتا تھا شگفتگی اُس کا طرۂ امتیاز تھا۔ مزاح کی چاشنی اُسے بے انتہا دلچسپ بنا دیتی تھی۔ اُن کے خیالات میں بڑی آمد تھی۔ مثالیں دے دے کر قاری کے سامنے اپنے موضوع کی تصویر کھینچ دیتے تھے اور اپنے مفہوم کو بڑی خوبصورتی سے ذہن نشین کر دیتے تھے۔ اُنہوں نے مروجہ طرزِ تحریر سے ہٹ کر اُردو نثر کو نیا

ڈھنگ اور جدید اسلوب دیا۔ اُن کے خطوط خاص طور پر اس کی زندہ مثال ہیں۔ لمبی چوڑی تمہیدوں اور بے جا تکلفات سے ہمیشہ گریز کیا۔

عادات و خصائل

سر سید بہت نیک سیرت اور فرشتہ خصلت انسان تھے۔ راست گوئی اور حیا کی اُن کی سیرت کے نمایاں جوہر ہیں۔ اُنہوں نے نازک سے نازک موقع پر بھی حق گوئی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

بہت محنتی اور جفاکش تھے۔ نہایت استقلال کے ساتھ اپنے فرائض کو جاری رکھتے تھے۔ شدید سے شدید بیماری بھی اُن کے سلسلۂ کار کو منقطع نہیں کرتی تھی۔ گرمی ہو یا لو۔ برف باری ہو یا آندھیاں چل رہی ہوں وہ جس کام میں لگ جاتے تھے اُسے انتہا تک پہونچا کر چھوڑتے تھے۔

اُن کا معمول تھا کہ صبح چار بجے بیدار ہو جاتے تھے حوائج ضروری اور نماز سے فارغ ہو کر کام شروع کر دیتے تھے اور رات کے آٹھ بجے تک اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔

بہت متواضع اور مہمان نواز انسان تھے۔ اُن کا دسترخوان ہمیشہ مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ غربا اور اپاہجوں کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ بہت خوش مزاج زندہ دل اور شوخ طبیعت آدمی تھے۔ اُن کے مزاج کی شوخی جوانی سے بڑھاپے تک یکساں قائم رہی۔ اُن کی مجلس میں بیٹھنے والے کبھی افسردہ ہو کر نہیں اُٹھتے تھے وہ خود بھی ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ مگر اسکے باوجود اُن کا بڑا وقار اور دبدبہ تھا۔ اُن کی شخصیت کا رعب و جلال حیرت انگیز تھا۔ ولایت جانے سے پہلے وہ ہندوستانی شرفاء کی طرح ہندوستان کا مخصوص لباس زیب تن کرتے تھے مگر انگلستان سے واپسی پر اُنہوں نے ترکی لباس پہننا شروع کر دیا۔ وہ انگریزی تہذیب و تمدن سے بہت متاثر تھے۔ اس لئے بود و باش کھانے پینے اور

نشست و برخواست کے یورپین طریقے اختیار کر لئے تھے۔

اپنے دوستوں اور عزیزوں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے تکلف یا بناوٹ سے کوسوں دور رہتے تھے جھوٹے رکھ رکھاؤ سے انہوں نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ اُن کے وقار اور رعب وجلال کے باوجود اُن کے دوست بڑی بے تکلفی سے پیش آتے تھے اور دوران گفتگو میں بعض ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جو اُن جیسی شخصیت کے دوسرے آدمی برداشت نہیں کرتے تھے اور اُن کی دلجوئی کا ہر ممکن خیال رکھتے تھے۔ وہ بہت سیر چشم اور مستغنی المزاج آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی خدمات کا کبھی معاوضہ نہیں چاہا بلکہ جو کچھ کمایا قوم پر خرچ کر دیا اُن کے مزاج میں بہت عاجزی اور انکساری تھی۔ معمولی سے معمولی آدمی کے ساتھ بھی بہت محبت اور یگانگت سے پیش آتے تھے۔ اپنے ملازموں کے ساتھ دوستوں اور رشتہ داروں جیسا سلوک کرتے تھے۔ غرض اُن میں وہ تمام خصوصیات جمع تھیں جو ایک بلند کردار انسان میں ہونی چاہئیں۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ

ابتدائی حالات

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اواخر ۱۸۷۸ء میں یوپی کی مشہور ریاست رام پور میں پیدا ہوئے مگر آپ کا آبائی وطن نجیب آباد ضلع بجنور ہے۔ مولانا کے والد ماجد کا نام عبد العلی خاں تھا۔ آپ نواب یوسف علی خاں والئی ریاست رام پور کے مصاحب اور رکن دربار تھے۔

تعلیم و تربیّت

مولانا کی عمر دو سال کی تھی کہ والد ماجد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے مگر آپ کی والدۂ محترمہ نے جو "بی اماں" کے نام سے مشہور تھیں غیر معمولی عزم و ہمّت سے آپ کی پرورش کی اور ایسے انداز سے تربیت کی کہ یہ یتیم بچّہ آگے بڑھ کر تاریخ عالم کا ایک روشن باب ثابت ہوا۔

مولانا نے اُردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے مکان ہی پر حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لئے بریلی ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ اور پھر مولانا کے برادر اکبر مولانا شوکت علی مرحوم نے آپ کو علی گڑھ کالج میں داخل کر دیا۔ یہاں پہونچ کر مولانا کے جوہر چمکنے شروع ہوئے۔ وہ اپنے ہم جماعتوں میں سب سے کم پڑھنے لکھنے والے اور سب سے زیادہ کھیل کود اور خوش گپیوں میں مصروف رہنے والے نوجوان تھے۔ مگر اس کے باوجود جب امتحان کا نتیجہ نکلتا تھا تو وہ اپنے ہم جماعتوں میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے اس کی وجہ صرف اور صرف اُن کی غیر معمولی ذہانت تھی وہ سال کا بیشتر حصّہ کھیل کود یونین کے جلسوں اور شعر و سخن کی محفلوں میں گذارتے تھے مگر جب امتحان سر پر آجاتا تھا تو عموماً ڈیڑھ دو مہینے پہلے کتابیں لے کر بیٹھ جاتے تھے اور محض اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس قلیل عرصے

میں اتنا کچھ ذہن نشین کر لیتے تھے جو بعض "پڑھاکو" قسم کے لڑکے سال بھر کی محنت میں بھی ذہن نشین نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور سارے صوبہ میں اوّل آئے۔

انگلستان کو روانگی

بی اے کی ڈگری لینے کے بعد مولانا کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے انہیں آئی سی ایس کا امتحان دلوانے کے لئے انگلستان بھیجا اور وہ انگلستان پہونچ کر آکسفورڈ میں داخل ہو گئے مگر چونکہ اُن کا فطری رجحان اس طرف نہیں تھا اس لئے ناکامی ہوئی مگر اُن کی یہی ناکامی اُن کے اور اُن سے بڑھ کر قوم کے حق میں بارانِ رحمت ثابت ہوئی۔ ہو سکتا تھا کہ آئی سی ایس کا امتحان پاس کر کے جب وہ ہندوستان واپس آتے تو کسی معزز اور اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو جاتے۔ اس طرح قوم اور ملک اُن کی بے لوث اور اعلیٰ سیاسی خدمات سے محروم رہ جاتے۔

شادی اور دوسری بار انگلستان کو روانگی

امتحان میں ناکامی کی خبر سُن کر اُن کی والدہ محترمہ "بی اماں" اور مولانا شوکت علی مرحوم نے انہیں انگلستان سے واپس بلا لیا اور شادی کر دی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد مولانا اپنے بھائی شوکت علی کے خرچ پر دوسری بار پھر انگلستان تشریف لے گئے اور اس بار بجائے آئی سی ایس کا امتحان دینے کے انہوں نے آکسفورڈ سے تاریخ میں آنرز کا امتحان دیا۔ چونکہ اس مضمون سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔ اس لئے کامیاب ہوئے۔

ملازمت

انگلستان سے واپسی کے بعد مولانا کو ریاست رام پور میں افسر تعلیمات مقرر کر دیا گیا۔ مگر دربار رام پور کے بعض امراء اُن سے حسد کرنے لگے اور اُنہوں نے مولانا کے خلاف ہز ہائینس نواب رام پور کے کان بھرنے

شروع کردیئے۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ نواب موصوف اور مولانا کے درمیان کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ایک بار تو اس کشیدگی کو مولانا شوکت علی مرحوم نے رام پور آکر دُور کر دیا۔ مگر نواب کے دل میں مولانا کے خلاف گرہ پڑ گئی تھی وہ آخر تک نہ نکل سکی۔ آخر مولانا شوکت علی مرحوم کے مشورے سے اُنہوں نے ریاست کی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔

بڑودہ میں قیامِ انگلستان کے زمانہ میں ریاست بڑودہ کے ولی عہد کنور فتح سنگھ اور مولانا کے درمیان بہت ہی یگانگت اور خلوص کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ انگلستان سے واپس آکر کنور موصوف نے اپنے والد پر زور ڈالنا شروع کیا کہ مولانا محمد علی کو بڑودہ بلا لیا جائے۔ اُدھر مولانا دربارِ رام پور سے دل برداشتہ ہو کر چلے گئے تھے۔ چنانچہ کنور فتح سنگھ کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور مہاراجہ بڑودہ نے انہیں اپنے یہاں بلا کر محکمۂ افیون کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔ یہاں آکر مولانا نے نہایت دیانت، قابلیت اور مستعدی سے کام کیا جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ اُن کی ساڑھے چار سال کی ملازمت میں محکمۂ مذکور کو سترہ لاکھ روپے کی بچت ہوئی یہ بچت گذشتہ سالوں کے مقابلے میں دو ہزار پندرہ فیصدی زیادہ تھی۔ مولانا کی اس کارگذاری سے خوش ہو کر مہاراجہ بڑودہ نے انہیں ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کر دیا۔ مولانا کی کمشنری اہالیانِ نوساری کے حق میں بارانِ رحمت ثابت ہوئی۔ کیونکہ مولانا کے تقرر کے بعد ہی ضلع کی حالت میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ غرباء اور کاشتکار جو بُری طرح مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔ اب ہر ظلم اور زیادتی سے محفوظ ہو گئے۔ مولانا نے یہاں آکر متعدد اصلاحات جاری کیں جن سے ریاست اور عوام دونوں کو فائدہ پہونچا۔ نذر یا رشوت کو اُنہوں نے بیک جنبش قلم ممنوع قرار دیدیا۔ خود مولانا کو متعدد بار بڑی بڑی رقوم پیش کی گئیں مگر اُنہوں نے نہایت سختی سے واپس کر دیں اور اپنے ماتحت افسروں کو بھی سرزنش کی۔

اس کے بعد مولانا کو ریاست کے ولی عہد کنور فتح سنگھ کا پرنسپل اسسٹنٹ مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس طرح مولانا کو کنور کے قریب رہنے کا موقع مل سکے گا اور وہ کنور کو مجبور کر کے اُس کی عادتِ مے نوشی ترک کرا دیں گے جو حدودِ اعتدال سے کہیں زیادہ تجاوز کر چکی تھی۔ مگر مولانا کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور کنور موصوف کا اُسی کثرتِ مے نوشی کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔

صحافت کی طرف

یہ مولانا کی ذہانت، خداداد صلاحیت، مستعدی اور دیانت تھی کہ وہ بڑودہ میں نہایت کامیابی سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے اور عوام سے لے کر حاکم ریاست تک اُن سے خوش رہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ملازمت سے وہ خود کبھی مطمئن نہیں ہوئے اُن کا دل اپنی قوم کی تباہ حالی اور برادرانِ وطن کی غلامی پر ہمیشہ کڑھتا رہا۔ اور وہ ایسے ذرائع پر غور کرتے رہے جنہیں اختیار کر کے قوم اور ملک کو اس لعنت سے نجات دلائی جائے۔ وہ ازل سے ایک دردمند دل لے کر آئے تھے۔ جو اہلِ ملک و قوم کے مصائب دیکھ کر غیر معمولی شدت اور قوت سے دھڑکنے لگتا تھا۔ اس عالم میں مولانا کو ان فرائض کا خیال آتا تھا جو اُن کے ملک اور قوم کی طرف سے اُن پر عائد ہوتے تھے۔ پھر کچھ یہ بھی تھا کہ اُن کی اُفتادِ طبع ملازمت کے خلاف تھی اگر کنور فتح سنگھ سے برادرانہ و مخلصانہ تعلقات اور مہاراجہ کی شفقت و محبت اُن کا دامن نہ پکڑتیں تو وہ اس ملازمت پر کبھی کے لات مار کر چلے گئے ہوتے۔ مگر اس شفقت و محبت کے باوجود بھی جب اہلِ ملک و قوم کی حالت اور بین الاقوامی حالات نازک صورت اختیار کرنے لگے تو مولانا نے اپنے اصل فرائض کی طرف توجہ دی اور ابتداءً میں ریاست سے دو سال کی رخصت لے کر ایک انگریزی ہفت روزہ "کامریڈ" جاری کر دیا۔ کامریڈ کا پہلا پرچہ کلکتہ سے نکلا۔ اس پرچہ نے ایسی

مقبولیت حاصل کی کہ انگریزی خواں عوام سے لے کر خواص حتیٰ کہ وائسرائے ہند
لارڈ ہارڈنگ اور اُن کی بیوی، صوبوں کے گورنر اور جرمنی کا ولی عہد تک اُس کا
قدردان ہو گیا۔ "مسٹر میکڈانلڈ وزیرِ اعظم برطانیہ نے دورانِ ملازمت میں خود مولانا
سے کہا کہ میں آپ کا "کامریڈ" بڑے ذوق و شوق اور باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔
انگلستان کے ادیبوں اور اخبار نویسوں نے بھی کامریڈ کو بہت پسندیدگی کی نظر سے
دیکھا اور اُس کی بہت تعریف کی۔ بکثرت انگریز اُس کے مستقل خریدار تھے۔"

اس کے ساتھ ساتھ مولانا کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ ہندوستان
کی اُردو خواں پبلک (جس کی ملک میں اکثریت ہے) کی رہنمائی اور اُن میں آزادی
کا جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لئے ایک سلجھا ہوا اُردو اخبار بھی نکالنا چاہیئے۔
چنانچہ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو اُن کے اُردو روزنامے "ہمدرد" کا پہلا پرچہ منظر
عام پر آیا۔ اُس وقت ہندوستان کا دار السلطنت کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا تھا
اس لئے مولانا اپنا "کامریڈ" بھی کلکتہ سے دہلی میں لے آئے تھے۔ یہیں سے اُنھوں
نے ہمدرد جاری کیا "ہمدرد" بھی "کامریڈ" کی طرح بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر پھلا
اور پھولا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام ہندوستان کی بساطِ سیاست و صحافت
پر چھا گیا۔ ادارۂ ہمدرد میں مولانا کی نگاہِ انتخاب نے ملک کے بلند پایہ ادیبوں اور
اخبار نویسوں کو جمع کر لیا تھا۔ چنانچہ میر محفوظ علی، سید ہاشمی فریدآبادی، قاضی عبد الغفار
سید جالب، مولوی عبد الحلیم شررؔ اور عارف ہسوی جیسے صاحبِ طرز انشا پرداز
اور سلجھے ہوئے اخبار نویس مولانا کے معاون اور شریکِ کار تھے۔ ان سب پر مولانا
کی جامع صفات شخصیت کی نگرانی، غرض "ہمدرد" بہت جلد ملک و قوم کی نظروں
میں مقبول ہو گیا اور کسی نے اسے سر پہ اور کسی نے آنکھوں میں جگہ دی۔

قیدِ فرنگ "کامریڈ" اور "ہمدرد" دونوں شہرت و مقبولیت کے اوجِ کمال

پر تھے کہ برطانیہ اور جرمنی کے درمیان پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اسی دوران میں "لنڈن ٹائمز" نے ترکوں کے خلاف ایک مضمون لکھا اور اُس میں ان کی تحقیر و توہین کی۔ مولانا محمد علی جو اسلام کے عاشق اور دنیائے اسلام کے دیوانہ تھے ترکوں کی تحقیر و تذلیل برداشت نہ کر سکے اور چالیس گھنٹوں تک مسلسل محنت کر کے اُنہوں نے ایک مضمون "چوائس آف دی ٹرکش" لکھا جس میں لنڈن ٹائمز کے مضمون کی دھجیاں اڑا دیں۔ مولانا کا اندازِ نگارش حکومتِ برطانیہ کو ناگوار گذرا اور اُس نے "کامریڈ و ہمدرد" دونوں کی ضمانت ضبط کر لی۔ اس طرح اہلِ ہند کے یہ دونوں سچے اور بیباک ترجمان انگریز کے جبر و استبداد کے ہاتھوں خاموش ہو گئے۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ جب مولانا ذیابطس میں مبتلا ہو کر طبی مشورہ سے رام پور گئے تو پہلے انہیں ریاست کے ڈائرکٹر جنرل پولیس نے نظر بند کر دیا۔ مگر چودہ گھنٹے کے بعد یہ حکم واپس لے لیا گیا اور مولانا رام پور سے شکار کھیلنے کیلئے نینی تال چلے گئے۔ وہاں سے عُرس میں شرکت کرنے کی غرض سے اجمیر روانہ ہوئے۔ مگر اجمیر آئے ہوئے دو ہی دن ہوئے تھے کہ اُن سے دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ایک حکم کی تعمیل کروائی گئی۔ اس حکم کے تحت اُنہیں مع مولانا شوکت علی کے نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد اُنہیں مختلف شہروں میں نظر بندی کی زندگی گذارنی پڑی۔ آخر چھنڈواڑہ میں انہیں قید کر دیا گیا اور یہاں سے بیتول جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اسی دوران میں مولانا محمد علی اور اُن کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کی نظر بندی کے متعلق ہندوستان کے رہنماؤں نے انگریزی حکومت سے بار بار احتجاج کیا۔ چنانچہ آنریبل سر رضا علی مسز اینی بسنٹ مسٹر مظہر الحق اور قائد اعظم محمد علی جناح نے ذاتی طور پر وائسرائے اور امپیریل کونسل میں ایوانِ اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے اُن کی نظر بندی اور اسیری کو خلافِ قانون قرار دیا اور اس پر سخت احتجاج کیا مگر برطانوی حکومت کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور

اُس نے ان دونوں بھائیوں کی رہائی سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اُس کی دوربین اور مردم شناس آنکھ مولانا کی ہر دلعزیزی اور اُن کی غیر معمولی قائدانہ صلاحیتوں کو بھانپ چکی تھی اور اس نتیجہ پر پہونچ چکی تھی کہ مولانا محمد علی کا وجود مستقبل میں ہمارے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔ اسلئے پہلے ہی اُن کی طاقت توڑ دو۔

اُفقِ شہرت پر

مگر ۱۹۱۹ء میں جب رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہوئے اور جلیانوالہ باغ کا خونیں حادثہ پیش آنے سے سارا ملک انگریزی استبداد کے خلاف صف آرا ہو گیا تو حکومت نے عوام کا جوش وخروش ٹھنڈا کرنے اور اُن کی دلجوئی کے پیش نظر تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس طرح تقریباً پانچ سال کی قید و پابندی کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی بیتول جیل سے رہا کر دیئے گئے۔ اسوقت امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جہاں جنرل ڈائر کی گولیوں نے سینکڑوں بے گناہ اور نہتے ہندوستانیوں کو خاک و خون میں تڑپایا تھا کانگرس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے جلسے ہو رہے تھے۔ بیتول سے رہا ہو کر مولانا محمد علی معہ اپنے برادرِ بزرگ کے امرتسر پہونچے۔ جہاں اُن کا ایسی شان و شوکت سے استقبال کیا گیا کہ امرتسر کی تاریخ اسکی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر انسانوں کا سمندر تھا کہ کسی کے روکے نہیں رکتا تھا۔ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی غرض ہر ملک، و ملت کے لوگ اُن کے استقبال کے لئے جوق در جوق جمع ہوئے تھے اسٹیشن سے جلسہ گاہ تک اُن کے عشاق کا انبوہ پروانہ وار فدا ہو رہا تھا۔ کانگرس کے پنڈال کے باہر مہاتما گاندھی پنڈت مدن موہن مالوی اور ہندوستان کے بہت سے رہنما اُن کے استقبال کے لئے چشم براہ تھے۔ کانگرس کے اجلاس میں تشریف لاکر مولانا نے ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر فرمائی اُنہوں نے کہا۔

"میں کہتا ہوں اس آزادی کے لئے مسٹر تلک کو پھر جیل جانا چاہئے۔
مجھے دوبارہ اپنی عمر بھر کے لئے نظر بند ہو جانا چاہئے، مسز بسنٹ
کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہئے، مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے
لئے خاتمہ ہو جانا چاہیئے جیسے کہ پنجاب میں ہوئے۔"

کانگرس پر احسان

ہندوستان کی تاریخ پر عبور رکھنے والے اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکیں گے کہ اگر مولانا کانگرس میں شریک نہ ہوتے تو کانگرس، کانگرس نہیں بن سکتی تھی۔ ہندوستان کی دونوں قوموں اور خصوصاً مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے میں مولانا کا حصّہ سب سے زیادہ ہے۔ اُنہوں نے اپنے بعد آنے والے رہنماؤں کیلئے آزادی کا راستہ اس طرح ہموار کر دیا کہ انہیں قوم کو اپنے ساتھ لے کر چلنے میں زیادہ دشواریاں پیش نہیں آئیں اگر مولانا اپنی مختلف تحریکات، تحریرات اور تقادیر سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو غلامی کا تلخ احساس نہ دلاتے اور انہیں آزادی کی نعمت غیر مترقبہ حاصل کرنے کے لئے تیار نہ کرتے تو یقیناً اُن کے جانشینوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مولانا نے حصولِ آزادی کے لئے جو جدوجہد کی اور اس میں جس قدر کامیابی حاصل کی اس کا ماحصل اتنا ہی ہے کہ قوم کی مردہ رگوں میں زندگی کا گرم اور جوان خون دوڑنے لگا اور وہ ایک بہت بڑے اور صبر آزما امتحان کے لئے تیار ہو گئی۔

مولانا کی تحریک آزادی

جب ہم مولانا کی تحریک آزادی کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس کے دو بنیادی اجزاء نظر آتے ہیں۔ عالمِ اسلام کا تحفظ خود اختیاری —— ہندوستان کی آزادی کامل —— ہندوستان کی آزادی کی تحریک تو شروع ہو چکی تھی مگر دُنیا کے دوسرے حصّوں میں بسنے والے مسلمان جس کس مپرسی کے عالم میں تھے اور اسلامی حکومتوں میں جس طوائف

الملوکی کا دور دورہ تھا۔ وہ مولانا کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ وہ اس نکتے کو سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کا احتجاج یورپ کی جابر طاقتوں کو خوفزدہ تو کر سکتا ہے مگر اُن کو ظالمانہ اقدام سے باز نہیں رکھ سکتا ہے۔ عالمِ اسلام کو یورپ کی طاغوتی طاقتوں سے آزاد کروانے کے لئے وہ ہندوستان کی بتیس کروڑ آبادی کی متحدہ آواز اُٹھانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم اقوام کو مسلمانوں کے خالص اسلامی مطالبات سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی جبتک کہ اُس میں انہیں اپنا فائدہ نظر نہ آتا۔ ان نازک حالات میں اگر مولانا ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم جماعتوں سے الگ ہو کر ایک نئی اور خالص مسلم جماعت کی تشکیل کرتے تو اس صورت میں جہاں ہندوستان کی تحریک آزادی کمزور ہو جاتی وہاں مولانا کی وہ تحریک بھی بے جان ہوتی جو عالمِ اسلام کی آزادی کے لئے معرضِ وجود میں لائی گئی تھی اور اقوامِ یورپ، دنیائے اسلام پر اپنی گرفت پہلے سے بھی زیادہ مضبوط کر دیتیں۔ مولانا کو اس خطرے کا احساس قبل از وقت ہو چکا تھا۔

خلافت وفد

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زوالِ ترکی کے بعد جب انگریزوں اور یونانیوں نے ترک قوم کے ساتھ نہایت ہی ذلّت آمیز سلوک کیا اور اپنے تمام گذشتہ عہد و پیمان طاقِ نسیاں میں رکھ کر ترکوں اور در پردہ عالمِ اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے لئے خطرناک ذرائع اختیار کرنے لگے تو مولانا اقوامِ یورپ کو حقیقتِ حال سے باخبر کرنے اور اُن پر مسئلہ خلافت کی نزاکت واضح کرنے کے لئے اپنا مشہور عالم خلافت وفد لے کر یورپ روانہ ہوئے یورپ پہونچنے پر انہوں نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا کہ گو خلافت کا مسئلہ مذہباً مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے مگر ہندوستان میں سینکڑوں سال سے یکجا رہنے کی وجہ سے ہر قوم دوسری قوم کے دُکھ درد میں برابر کی شریک ہے۔

اور اس مسئلے میں بھی تمام اقوام ہند مسلمانوں کی ہم نوا ہیں اور اس مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتی ہیں۔ اگر خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کی حسب منشا طے نہ ہوا تو یہ بات صرف سات کروڑ مسلمانوں ہی کے غم و غصہ کا باعث نہیں ہوگی بلکہ سارے ہندوستان کی بقیہ آبادی کو بارود خانے میں تبدیل کر دے گی۔

ترکِ موالات

انگریز بلکہ تمام یورپی اقوام مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے پر تلی ہوئی تھیں اس لئے مولانا کے وفد کو ناکامی ہوئی۔ ہندوستان کے عوام جو پہلے ہی انگریزوں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے خلافت وفد کی ناکامی سے اور بھی چراغ پا ہو گئے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ہنگامے برپا ہو گئے۔ عدم تعاون، ترکِ موالات اور ہجرت کی تحریکیں شروع ہو گئیں سینکڑوں سرکاری ملازموں نے ملازمتوں پر لات مار دی، وکلاء اور پروفیسروں نے کالجوں اور پروفیسروں نے کالجوں اور کچہریوں کا مقاطعہ کر دیا۔ طالبعلموں نے کلاسوں میں جانے کی بجائے جلسہ گاہوں اور وہاں سے جیل خانوں کے رُخ کئے۔ ہزاروں مسلمان ہندوستان کی غلامانہ زندگی ترک کر کے افغانستان وغیرہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور قوم و ملک نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ وہ مولانا محمد علی کے اشارے پر اپنا سب کچھ نثار کر سکتی ہے۔

دوبارہ گرفتاری

تحریک کو مزید تقویت پہونچانے اور انگریزی حکومت کا مکمل مقاطعہ کرنے کیلئے مولانا نے ہندوستان کے بڑے بڑے تمام علماء سے فتوے حاصل کئے کہ چونکہ انگریز مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انہیں مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ پہلے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو فوج میں ملازم رکھتے ہیں پھر اُن کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلامی ممالک میں جاکر اپنے ہی بھائیوں پر گولیاں چلائیں۔ مسلمان ہو کر مسلمانوں ہی کو قتل کرنا از روئے شریعت

بہت بڑا گناہ ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو برطانوی فوجوں میں شامل نہیں ہونا چاہیئے اور جو لوگ ملازم ہیں انہیں فوج سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ اسی مقصد کیلئے کراچی میں وسیع پیمانے پر خلافت کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت مولانا محمد علی مرحوم نے کی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئی۔ مشہور ہندو رہنما سری سوامی شنکر اچاریہ جی نے بھی جلسے کے اسٹیج پر آکر تقریر کی اور مسلمانوں کو فوج کی ملازمت ترک کر دینے کا مشورہ دیا۔ مولانا کی شعلہ بار تقریر اور کانفرنس کی غیر معمولی کامیابی پر انگریز بہت برافروختہ ہوئے اور انہوں نے مولانا اور اُن کے رفقائے کار مولٰنا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد، مولوی نثار احمد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور سری سوامی شنکر اچاریہ کو گرفتار کر لیا۔ کراچی کے "خالق دینا ہال" میں ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا جس میں سوائے شنکر اچاریہ کے باقی سب کو دو دو سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔

حق گوئی

جیسا کہ سطور مندرجہ بالا میں بیان کیا جا چکا ہے مولانا محمد علی مرحوم ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے علم بردار تھے یہی وجہ تھی کہ انہیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔ جہاں اُنہوں نے مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کی صدارت کی وہاں کانگرس کے بھی صدر رہے بلکہ کانگرس کے روح رواں رہے۔ اس اتحاد کی خاطر اُنہیں بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھانی پڑیں مسلمانوں میں سے ایک گروہ کی مخالفت مول لینی پڑی۔ لوگوں کے طعنے سُننے پڑے۔ مگر انہوں نے یہ سب کچھ گوارا کیا صرف اس لئے تاکہ اس باہمی اتحاد کے نتیجے میں ملک آزاد ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ طویل عرصے تک اس غلط فہمی کا شکار ضرور رہے کہ ہندوستان کی دونوں قومیں متحد ہو سکتی ہیں۔ انہیں اپنی

نیک نیتی اور حسنِ ظن کے آئینے میں دوسرے بھی نیک نیت نظر آتے تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک خلافت اور ترکِ موالات اور ہجرت کی تحریکوں میں مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ شاید آئندہ کا مؤرخ اُن کی اس لغزش پر انہیں معاف نہ کرے مگر یہ یک طرفہ فیصلہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی نہیں تھے۔ وہ بہت جلد بھڑک جاتے تھے اور جذبات سے جلدی مغلوب ہو جاتے تھے وہ جب عربوں یا ترکوں پر اقوام یورپ کا تشدد دیکھتے تھے تو فوراً مشتعل ہو جاتے تھے۔ عالم اسلام کی تذلیل انہیں کسی حالت میں گوارا نہیں تھی۔ وہ انگریزوں کے جانی دشمن تھے۔ اُن کے خون کے پیاسے تھے۔ اور اپنی یہ پیاس بجھانے کے لئے انہیں ہندوستان کی غیر مسلم اقوام سے رشتۂ دوستی جوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ پھر یہ امر بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ ترکِ موالات اور تحریکِ ہجرت وغیرہ میں مسلمانوں کے نقصانات کی ذمہ داری کانگرس کے اُن عیّار لیڈروں پر عاید ہوتی ہے جنہوں نے مولانا کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو اس بھٹی میں جھونک دیا۔ مگر ان باتوں کے باوجود ہندوؤں سے ربط ضبط اور اُن سے اتحاد و اتفاق کے پیامبر ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ مسلمان بحیثیتِ قوم ہندوؤں سے بالکل علیحدہ ایک مستقل قوم ہیں۔ جن کا اپنا کلچر، اپنی زبان، اپنی مذہبی اور تمدنی روایات ہیں۔ وہ ہندوؤں سے ایسا اتحاد کرنے کے حق میں نہیں تھے جس کے نتیجے میں مسلمان اپنی تاریخی، تمدنی، معاشرتی اور مذہبی روایات کو فراموش کر کے ہندوؤں میں مدغم ہو جائیں۔ بعض سرکردہ ہندوؤں اور خود گاندھی جی کی طرف سے ایک قوم کا جو نظریہ ایجاد کیا جا رہا تھا اور متحدہ قومیت اور وطنیت کے مدھم سُروں میں جو راگ الاپا جا رہا تھا مولانا اُس سے بے خبر نہیں تھے۔ اسی خطرے

کے پیشِ نظر اُنہوں نے سیاسی انداز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے مذہب پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے ہوئے ایک قوم کے نظریئے کی مخالفت کی تھی اُنہوں نے فرمایا:۔ "یہ میرا مذہبی فریضہ ہے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم کروں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ ہندو، ہندو رہے اور مسلمان، مسلمان"۔

مولانا مسلمانوں کو ہندوؤں سے بالکل الگ ایک عظیم روایات کی حامل قوم سمجھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوؤں کے بڑے بڑے رشیوں اور اوتاروں سے ایک فاسق و فاجر مسلمان کو بہتر سمجھتے تھے۔ یہی نہیں ڈنکے کی چوٹ پر اس کا اعلان بھی کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے علی گڑھ کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:۔ "ایک فاسق و فاجر مسلمان گاندھی جی سے کہیں بہتر ہے"۔

تو اُن کی اس بات پر ہندو حلقوں نے بہت لے دے کی اور بعض شرپسند ہندوؤں کے مشورے سے ایک اشتہار شائع کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ گاندھی جی کے متعلق ایسا ہتک آمیز نظریہ رکھنے والا شخص کانگرس کا صدر نہیں رہ سکتا امین الدولہ پارک لکھنؤ کے ایک جلسۂ عام میں جب اُن کی توجہ اس اشتہار کی طرف مبذول کرائی گئی، تو اُنہوں کانگرس کی صدارت اور ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر اپنے مذہبی عقاید اور اسلام کی فضیلت کو ترجیح دی اور نہایت بیباکی اور حق گوئی سے کہا کہ "میں اسلام کو اور عقائد سے کہیں بہتر و اعلیٰ سمجھتا ہوں اور اس لحاظ سے جہاں تک عقائدِ ایمانی کا تعلق ہے میں اکیلے گاندھی جی ہی نہیں تمام ہندوؤں تمام عیسائیوں تمام غیر مسلموں سے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان ہر بدتر سے بدتر اور بدعمل سے بدعمل مسلمان کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اسلام کی فضیلت میرا جزوِ ایمانی ہے۔ اگر آج خدانخواستہ میں اس کا قائل نہ رہوں تو مسلمان رہنے کی کوئی وجہ ہی نہیں"

کانگرس سے علیحدگی

آخر ایک دن ایسا بھی آگیا کہ کانگرس کا یہ تجربہ کار

جنرل، ہندو مسلم اتحاد کا شیدائی، گاندھی جی کا رفیق کار، از خود نہیں بلکہ سال ہا سال تک برادرانِ وطن کے طعنہ ہائے دلخراش سُن سُن کر اور اُن کے خطرناک عزائم کا بار بار مشاہدہ کر کر کے تنگ آگیا اور ۱۹۲۹ء میں کانگرس سے قطعی طور پر علیحدہ ہوگیا۔

گول میز کانفرنس میں شرکت

مولانا کی کانگرس سے علیحدگی "نہرو رپورٹ" کی وجہ سے ہوئی اور اُن کی اور قائدِ اعظم کی سرکردگی میں مسلمانوں نے بھی بحیثیتِ قوم اسے رد کر دیا۔ کیونکہ اس رپورٹ میں سراسر ہندوؤں کا مفاد پیشِ نظر رکھا گیا تھا اور مسلمانوں کے مفاد کو نہ صرف نظرانداز کر دیا گیا تھا بلکہ اسے نقصان بھی پہونچایا گیا تھا۔ ادھر تو اس رپورٹ کو مسلمانوں نے رد کیا اور اُدھر حکومت نے بھی رد کر دیا۔ اس استرداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگرس نے ایک سال تک وسیع پیمانے پر پوشیدہ تیاریاں کر کے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک سے گھبرا کر حکومت نے لندن میں ہندوستانی لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ مولانا محمد علی مرحوم بھی اپنی شدید علالت کے باوجود اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان کی صحت اتنی خراب تھی کہ انہیں اسٹریچر پر لٹا کر جہاز پر سوار کرایا گیا۔ باوجودیکہ ڈاکٹر بھی مشورے دے رہے تھے کہ آپ کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اس حالت میں آپ اس قدر دُور دراز کا سفر اختیار نہ کیجئے۔ لندن میں آپ کی مصروفیت اور سیاسی مسائل پر طویل تقریریں آپ کی صحت پر بہت خراب اثر ڈالیں گی۔ مگر شمعِ آزادی کے اس جانباز پروانے نے ان خدشات کو پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی۔ اور قوم کو یہ درس دیتا ہوا ساحلِ ہندوستان سے انگلستان کی طرف روانہ ہوگیا کہ زندہ رہو تو قوم و ملک کے لئے اور مرو تو قوم و ملک کے لئے۔ موت سے ڈرنے والے لوگ کبھی حصولِ مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عروسِ آزادی و کامرانی انہیں

سے ہم آغوش ہوتی ہے جو موت و زندگی کی جداگانہ حیثیتوں کو مٹا دیتے ہیں۔ روانگی سے پیشتر اسلام کے اس بطلِ جلیل نے جو ولولہ انگیز الفاظ کہے تھے اُن کی الہامی شان تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہ ہو سکے گی۔

"میں انگلستان میں آزادی لینے کے لئے جا رہا ہوں۔ یا تو میں آزادی لے کر واپس آؤں گا یا میری لاش آئے گی"۔ (ملخص)

کسے خبر تھی کہ سرزمین ہندوستان اب اس عظیم المرتبت انسان اور جلیل القدر رہنما سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو رہی ہے۔ ملک و ملّت کی یہ نادر الوجود شخصیت موت کے جہاز میں سوار ہو رہی ہے۔ اہلِ ہند کے کان اب اس کی آواز قیامت تک نہیں سُن سکیں گے۔ لندن پہونچ کر مولانا نے ہندوستان کی آزادی کے لئے جو معرکتہ الآرا تقریر کی، اسے پڑھ کر مردہ قومیں آج بھی اپنی رگوں میں زندگی کی سی حرارت محسوس کرنے لگتی ہیں اور پژمردہ دل پوری توانائی سے دھڑکنے لگتے ہیں۔

معرکتہ الآرا تقریر

اس معرکتہ الآرا تقریر میں اس بطلِ حریت نے برطانوی حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں آج جس مقصد کے لئے آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک کو لوٹ کو نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے غربت کی موت منظور ہے۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر یہاں میرے لئے ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی"۔

غروبِ عظمت

ہندوستان سے انگلستان تک طویل سفر کی صعوبتیں انگلستان میں مصروفیتیں اور پھر طویل تقریریں سرکاری و غیر سرکاری لوگوں سے ملاقاتیں، ان سب چیزوں سے مولانا کی صحت پر بہت بُرا اثر

ڈالا۔ بیماری نے شدت اختیار کی اور آخر کار آسمانِ اسلام کا یہ درخشندہ ستارہ ۴؍جنوری ۱۹۳۱ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

عادات وخصائل

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ایک جامع صفات رہنما تھے۔ بلا کے شوخ، ظریف اور زندہ دل۔ مگر انتہا کے مذہبی، زاہد و عابد۔ بہت خلیق، ملنسار، مگر بہت جلد برہم ہوجانے والے، سادگی اور عجز و انکسار اُن کی فطرت کے نمایاں اوصاف تھے۔ حق گوئی و بیباکی ہیں وہ آج تک ضرب المثل ہیں۔ اخلاقی جرأت اُن کا مزاج ثانی تھا۔ جب وہ کسی بات کو حق سمجھ لیتے تھے تو پھر پوری طاقت سے اُس کی موافقت کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے پیر و مرشد سے بھی اختلاف کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اُن جیسے جرأت مند، نڈر، شیر دل، بیباک اور صاف گو رہنما ہندوستان نے بہت کم پیدا کئے۔

شخصیت

مولانا کی شخصیت تاریخ ہندوستان کی عجیب وغریب شخصیت تھی۔ وہ جنگِ آزادی کے جرنیل، صاحبِ طرز صحافی، اُردو زبان کے مسلم الثبوت شاعر و ادیب انگریزی زبان کے بے مثل انشاء پرداز، شعلہ بیان خطیب اور ایک بلند پایہ عالم تھے۔ ہندوستان نے آج تک اُن جیسا اور کوئی لیڈر پیدا نہیں کیا جو تنہا ہندوستان کی بتیس۳۲ کروڑ آبادی پر بلا تفریق مذہب و ملت حکومت کرتا ہو۔ اور جس کے ادنیٰ اشارے پر ہندوستان کے عوام اپنی جان و مال عزت آبرو ہر چیز قربان کر دینے کے لئے تیار رہوں۔ ہندوستان کے ہر طبقہ میں جو مقبولیت و ہر دلعزیزی انہیں حاصل ہوئی۔ اُسے دیکھ کر انہیں ہندوستان کا "بے تاج بادشاہ" کہنا غلط نہیں ہے۔ وہ صرف ایک فرد نہیں تھے وہ بجائے خود ایک بہت بڑی تحریک

تھے وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی دستاویز تھے۔ وہ ہندوستان کے ایک سرے سے اُٹھے اور دوسرے سرے تک چھائے چلے گئے ان کے بقول پشاور سے کلکتہ تک کا فاصلہ اُن کی ایک غلام گردش تھی۔ اُنہوں نے اپنی آتش نوائی اور شعلہ بیانی سے اہلِ ہند کے سینوں میں جذبۂ آزادی کے شعلے بھڑکا دیئے اور ہندوستان کو آتش فشاں بنا دیا۔ اُنہوں نے ہندوستانیوں کو انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سکھائی۔ اُنہوں نے انگریز کے بت پر پیہم ضربیں لگائیں۔ اُس کے وقار اور پندار کو اس کی رعونت اور تمکنت کو خاک میں ملا دیا۔ اُن سے انگریز خوف کھاتے تھے، گاندھی جی اُن کا ادب کرتے تھے اور عوام اُن پر جان نثار کرتے تھے۔ ہندوستان کا جو رہنما اُن سے ٹکرایا مولانا کے ہاتھوں اُس کا غرور و نخوت چُور چُور ہو گیا۔ شکست کا لفظ اُن کی ڈکشنری سے خارج تھا۔ انہوں نے نازک سے نازک موقعوں پر بھی سپر ہمت نہیں ڈالی۔ وہ آزادی کے لئے پیدا ہوئے، آزادی کے لئے زندہ رہے اور آزادی ہی کے لئے مر گئے۔ ہندوستان کی تاریخ آزادی کا ایک ایک لفظ اُن سے عبارت ہے۔ اُنہیں ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ہم پر صد ہزار افسوس اگر ہم اُنہیں بھلا دیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ

ابتدائی زندگی

مشرق کا یہ عظیم ترین مدبر، زیرک سیاستدان اور مسلمانانِ ہند کا محسنِ اعظم جسے تاریخ قائدِ اعظم کے نام سے پکارتی ہے۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ قائد اعظم کے والد کا نام جناح پونجا تھا۔ آپ کا وطن مالوف راج کوٹ تھا مگر تجارت کے سلسلے میں کراچی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ آپ خوجہ قوم کے ایک معزز فرد تھے۔

ہوش سنبھالنے کے بعد قائد اعظم کو کراچی کے ایک مکتب میں داخل کر دیا گیا جہاں آپ نے "بغدادی قاعدہ" اور قرآن شریف کی تحصیل کی۔ اسکے بعد کراچی ہی کے ایک مدرسہ میں داخل ہو کر دنیوی علوم کے مراحل طے کرنے لگے۔ آپ نے فارسی کی بھی تحصیل کی چنانچہ فارسی کی کتاب "حکایات لطیف" آپ کی درسی کتب میں شامل تھی۔ ابھی آپ کی عمر سولہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ والدین نے ایک نئی اور ذمہ دارانہ زندگی کی منزل میں قدم رکھنے پر مجبور کر دیا اور امرت بائی نامی ایک خاتون سے شادی کر دی مگر یہ شادی قائد اعظم کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ کر سکی اور آپ اسی ذوق و شوق سے حصول تعلیم میں منہمک رہے۔ یہاں تک کہ سندھ مدرسہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔

انگلستان کو روانگی

قائد اعظم کے والد بزرگوار جناح پونجا کے دوست احباب اور خاص طور پر آپ کے ایک انگریز دوست مسٹر فریڈرک کرافٹ نے قائد اعظم کی ذہانت اور شوقِ تعلیم دیکھ کر جناح پونجا کو مشورہ دیا کہ آپ اس ہونہار نوجوان کو قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے انگلستان

بھیج دیں۔ چنانچہ جناح پونجا نے اپنے معزز دوست کے پُرخلوص مشورے کو قبول
کرتے ہوئے ۱۸۹۲ء کی ایک صبح کو قائدِ اعظم کا سامانِ سفر تیار کروا کر انگلستان
جانے والے جہاز پر سوار کروا دیا۔ اُس وقت قائدِ اعظم کی عمر سولہ سال کی تھی سولہ
سال کا ایک نوجوان، ایسا نوجوان جس کی نگرانی اور سرپرستی کرنے والوں میں سے
کوئی بھی اُس کے ساتھ نہ ہو غیر ملک میں جا کر اور انگلستان جیسے ملک میں جا کر جس
قدر بے راہ رو نہ ہوتا کم تھا۔ مگر جس وقت قائدِ اعظم نے انگلستان کے ساحل پر قدم
رکھا اُس وقت سے لے کر عازمِ ہندوستان ہونے کے وقت تک اپنی زندگی کا ایک
لمحہ بھی بیکار مشاغل اور لہو و لعب میں ضائع نہ کیا۔ لندن پہونچ کر وہاں کی مشہور
قانونی درسگاہ "لنکن ان" میں داخلہ لیا اور نہایت محنت اور توجہ سے حصول
تعلیم میں منہمک ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُنہوں نے انگریز قوم کو اس قدر قریب
سے دیکھا۔ اُس کی سیرت و کردار، اُس کی قومی اور ذاتی زندگی اُس کے خیالات و
افعال غرض اُس کی زندگی کے ہر پہلو کا بڑے غور سے مشاہدہ کیا۔ قائدِ اعظم نے قیامِ
انگلستان کے دوران میں صرف ایک محنتی اور ہونہار طالب علم ہی کی حیثیت سے
زندگی نہیں گذاری بلکہ وہاں کی علمی ادبی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیا۔ اور وہاں کے
مشہور "شکسپیئر ڈرامیٹک کلب" کے ممبر بن کر اپنی خوش مذاقی اور ادب دوستی کے
گہرے نقوش قائم کر دیئے۔

انہیں دنوں انگلستان کے وزیرِ اعظم لارڈ سالسبری نے مشہور ہندوستانی
رہنما دادا بھائی نوروجی کو کالا آدمی کہہ کر نہ صرف اُن کی بلکہ سارے ہندوستانیوں کی
توہین کی۔ اس واقعہ نے لندن میں مقیم تمام ہندوستانیوں کو مشتعل کر دیا اور
وہ اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گئے۔ قائدِ اعظم اسی گروہ
کے ممتاز رکن تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُن کی قومی غیرت اور حمیت کی حس بیدار ہوئی

اُن کا جوان اور گرم خون پوری شدّت سے گردش کرنے لگا۔ اور اُنہوں نے فیصلہ کر لیا کہ لارڈ سالسبری کی نخوت کا جواب دینے کے لئے لندن کے ایک حلقے سے دادا بھائی نوروجی کو پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے کے لئے کھڑا کریں گے۔ چنانچہ اُنہوں نے بڑی سرگرمی سے اس الکشن میں حصّہ لیا اور اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھے جب تک دادا بھائی نوروجی کامیاب نہ ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ لندن کے لوگ ایک ہندوستانی نوجوان (قائدِ اعظم) کی سیاسی سرگرمیوں اور اُس کی آہنی شخصیت سے روشناس ہوئے۔

زندگی کا نیا دور

آخر ۱۸۹۶ء کا آغاز ہوا اور قائدِ اعظم قانون کی اعلیٰ ڈگری لے کر انگلستان سے واپس آ گئے۔ جب وہ کراچی پہونچے تو اُن کی والدہ مٹھی بائی فوت ہو چکی تھیں۔ اُن کے والد نے اپنی عزیز بیوی کے علاج میں زرِ کثیر صرف کر دیا تھا اور اس قدر انہماک سے علاج کیا تھا۔ کہ کاروبار کی طرف بھی توجہ نہ دے سکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی تجارت فیل ہو گئی۔ اب قائدِ اعظم پر پے در پے دو مصیبتیں پڑیں۔ مشفق ماں کا داغِ مفارقت اور تجارت میں زبردست خسارہ۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید ان صدمات کے سامنے سپرِ ہمت پھینک دیتا۔ مگر جسے آگے چل کر ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا سہارا اور تاریخِ عالم کا روشن ترین باب بننا تھا وہ اتنی آسانی سے سپرِ ہمت کیسے پھینک سکتا تھا۔ قائدِ اعظم کے عزم و حوصلہ کے امتحان کا دوسرا وقت وہ تھا۔ جب کراچی کی بعض فرموں نے انہیں ملازمت کی پیش کش کی مگر اُنہوں نے اس پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ایک مصیبت زدہ نوجوان جو مالی طور پر سخت پریشان تھا جو بالکل نوجوان تھا جس کو قانون کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور جس کے لئے قانون کے میدان میں فوری ترقی کے امکانات بھی نہیں تھے۔ اسے بظاہر یہ پیش کش

نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کر لینی چاہئے تھی۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اُسکے ارادے متزلزل ہوجاتے۔ مگر آہنی عزم و ہمت رکھنے والے قائد اعظم نے جو ایک قانون دان کی حیثیت سے اپنی معاشی زندگی کی ابتدا کرنے کا ارادہ کر چکے تھے فرم کی ملازمت سے انکار کر دیا اور ایک بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرنے کی غرض سے کراچی سے بمبئی روانہ ہوگئے۔ یہ واقعہ ۱۸۹۶ء کا ہے۔

قائد اعظم کے قیام بمبئی کے ابتدائی تین چار سال بہت پریشانی میں گذرے نئی نئی پریکٹس تھی۔ بمبئی جیسے شہر میں ایک سے ایک قانون کے اعلیٰ اور تجربہ کار ماہر موجود تھے۔ وہاں کسی نئے آدمی کے لئے بآسانی گنجائش نکلنی مشکل تھی۔ مگر قائد اعظم نے ہمت نہ ہاری اور ہر مشکل کا نہایت ہی پامردی سے مقابلہ کرتے رہے اس دوران میں اُن کی قانون دانی کی شہرت ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب بمبئی کے ایڈوکیٹ جنرل کے یہاں ریڈر کی جگہ خالی ہوئی تو کچھ اُن کی شہرت اور کچھ دوستوں کی سفارش سے وہ اس جگہ کے لئے منتخب کر لئے گئے۔ یہاں اُنہوں نے اس قدر محنت اور قابلیت سے اپنے فرائض انجام دیئے کہ جب بمبئی میں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی آسامی خالی ہوئی تو اُنہیں اس جگہ کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۰ء کا ہے۔ انہیں اس حیثیت سے کام کرنے کے کئی مواقع ملے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو اُن کی مالی حالت بھی بہتر ہوگئی دوسرے اُنہوں نے کچھ رقم پس انداز بھی کر لی۔ پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی جگہ پر اُنہوں نے تھوڑی تھوڑی مدّت تک کئی بار کام کیا مگر جب اُن کی قانونی صلاحیتوں اور دیانت داری نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تو اُنہیں یہ عہدہ مستقل طور پر پیش کیا گیا۔ مگر قائد اعظم نے تو اس درمیانی عرصے کو گذار کر اپنی مالی حالت درست کرنے کے لئے یہ ملازمت قبول کی تھی۔ اُن کا ارادہ تو ایک آزاد بیرسٹر کی حیثیت سے زندگی گذارنے کا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے یہ پیش کش قبول

کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی پریکٹس شروع کر دی - اس دوران میں وہ اپنے غریب والد اور اپنے بھائی بہنوں کو نہیں بھولے اور حتی الامکان مالی امداد کرتے رہے۔ پریذیڈنسی مجسٹریٹ کا عہدہ چھوڑ کر جب اُنہوں نے ایک آزاد بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرنی شروع کی تو اپنے والد کو ڈھائی سو روپے مہینہ دینے لگے۔ اب قائداعظم ایک تجربہ کار اور اعلیٰ درجے کی قانونی صلاحیتیں رکھنے والے بیرسٹر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے اس لئے اُنہوں نے غیر معمولی ترقی کی اور بہت جلد اُن کی آمدنی تقریباً پندرہ ہزار روپے ماہوار تک پہونچ گئی۔

دوسری شادی

قائداعظم کی پہلی بیوی بمشکل ایک سال زندہ رہیں۔ قائداعظم لندن میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ وہ ہیضہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء تک یعنی زندگی کے تقریباً پچیس سال اُنہوں نے بغیر کسی رفیقۂ حیات کے گذارے۔ ۱۹۱۸ء میں اُنہوں نے سر ڈنشا کی صاحبزادی رتن بائی کے ساتھ دوسری شادی کی۔ شادی سے پہلے رتن بائی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ رتن بائی نے تقریباً دس سال تک قائداعظم کی سچی رفیقۂ حیات بن کر زندگی گذاری اور ہر معاملہ میں اُن کا ہاتھ بٹایا۔ قائداعظم کو اپنی بیوی سے نہایت درجہ محبت تھی وہ انہیں اپنا بہترین ساتھی اور بہت بڑا سہارا سمجھتے تھے اور شادی کے دس سال بعد جب وہ بھی قائداعظم کو داغِ مفارقت دے گئیں تو اُنہوں نے تیسری شادی کا خیال تک نہ کیا اور باقی زندگی تجرد میں بسر کر دی۔ رتن بائی کے بطن سے قائداعظم کی ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں۔ جن کا نام صفیہ جناح رکھا گیا۔

سیاسی زندگی کی ابتداء

یہ دور جس میں قائداعظم ایک کامیاب قانون دان کی حیثیت سے زندگی گذار رہے تھے سیاسی

اعتبار سے بہت نازک تھا۔ تقسیم بنگال کے واقعہ کے بعد جو ۱۹۰۵ء میں پیش آیا تھا۔ ہندوستان کی سیاسی فضا بہت مکدر ہو چکی تھی اور تلک جیسے متعصب ہندو لیڈر ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر کے باہمی نفاق کی تخم ریزی کر رہے تھے۔ گائے، باجہ اور اردو، ہندی کا نام لے کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان حالات میں قائداعظم جیسے مسلمانوں کے سچے بہی خواہ اور ان پر جان چھڑکنے والے انسان کا تماشائی کی حیثیت سے الگ کھڑا رہنا ناممکن تھا چنانچہ انہوں نے کانگرس میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اُس وقت یہی جماعت ہندوستان کی سب سے بڑی اور با اثر جماعت تھی۔ کانگرس میں شامل ہو کر اُنہوں نے ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے کی ایسی سرگرم کوشش کی کہ ہندو حلقوں نے انہیں "سفیر اتحاد" کا خطاب دیا۔ اُنہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ بعض ناعاقبت اندیش ہندو لیڈر ہندو مسلمانوں کے درمیان دشمنی اور منافرت پیدا کر کے انتشار پھیلا رہے ہیں۔ اگر یہ انتشار قائم رہا یا بڑھتا گیا تو انگریز کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جائے گی اور ہندوستان کی آزادی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اُنہوں نے الہ آباد میں ہندو مسلم کانفرنس منعقد کروائی جس میں مسٹر گوکھلے، پنڈت مالویہ، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو، لارڈ سنہا اور سر آغا خاں، نواب وقار الملک، سر ابراہیم رحمت اللہ، سر حسن امام، مولوی محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خاں جیسے معززا اور مقتدر لوگوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے قائداعظم کا مقصد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے نمائندے سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایسی تجاویز مرتب کریں جن پر عمل پیرا ہونے سے باہمی منافرت کی مسموم فضا ختم ہو جائے اور دونوں متحد ہو کر انگریز سے آزادی کا مطالبہ کریں۔ مگر پنڈت مالویہ اور ان کے متعصب ساتھیوں نے قائداعظم کی کوشش کو ناکام بنا دیا اور بجائے اس کے کہ اس کانفرنس میں اختلافات کو کم کرنے کے طریقے

سوچتے اختلافات کو اور بھی ہوا دینے لگے مگر کانفرنس کی ناکامی کے بعد بھی ہندو مسلم اتحاد کا شیدائی قائد اعظم مایوس نہیں ہؤا اور اس نیک مقصد کے حصول میں پوری طرح کوشاں رہا۔

اس کے بعد حالات نے بہت زیادہ نازک صورت اختیار کرلی۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کردیا گیا۔ اس طرح بنگال کے ایک حصّے کے مسلمانوں کی وہ سیاسی برتری بھی ختم ہوگئی جو تقسیم بنگال کے نتیجے میں انہیں حاصل ہوگئی تھی۔ اسکے علاوہ اٹلی اور ترکی کی جنگ اور ایران میں روسی حکومت کے جارحانہ اقدامات نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مضطرب کر دیا۔ ان حالات میں ضروری ہوگیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہوں اور اپنے اور دُنیائے اسلام کے تحفظ و بقا کے لئے ٹھوس پروگرام بنائیں۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہؤا۔ سر میاں محمد شفیع نے اس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں قائدِ اعظم نے بھی شرکت کی اور یہاں بھی ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک پُرزور ریزولیشن پاس کروایا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قائد اعظم آزادی کی منزل سے ہمکنار ہونے کیلئے ہندو مسلم اتحاد کو کتنا ضروری سمجھتے تھے اور اسے ہر موقع پر پیشِ نظر رکھتے تھے۔

۱۹۱۳ء میں قائدِ اعظم آرام کرنے کی غرض سے انگلستان تشریف لے گئے ان دنوں وہاں مولانا محمد علی جوہر اور سر وزیر حسن مسلم لیگ کے نمائندوں کی حیثیت سے مقیم تھے۔ ان دونوں کی کوششوں سے قائد اعظم مسلم لیگ کے ممبر بن گئے۔ یہ واقعہ بظاہر ایک معمولی سا واقعہ ہے مگر دراصل اسے تاریخی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ وہی مسلم لیگ تھی آگے چل کر جس کے صدر کی حیثیت سے اُنہوں نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اسکے پلیٹ فارم پر متحد کیا اور اس جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے منزل مقصود پر پہونچنے میں کامیاب ہوئے۔ انگلستان سے واپس آکر قائد اعظم نے کراچی

کے عظیم الشان جلسہ کو خطاب کیا اور انڈیا کونسل کی ترکیب میں اصلاح کرنے کا معرکتہ الآرا ریزولیشن پیش کیا۔ اُنہوں نے انڈیا کونسل میں ایسے ارکان کی شمولیت پر شدید نکتہ چینی کی جو ہندوستانیوں کے حالات سے ناواقف ہوں یا اُن کے معاملات میں عملی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے ہوں۔ اسکے علاوہ اُنہوں نے اس امر پر سب سے زیادہ زور دیا کہ انڈیا کونسل کے ارکان کی تعداد کا ایک تہائی حصّہ اُن ہندوستانی ممبروں پر مشتمل ہونا چاہیے جنہیں امپیریل اور صوبائی لیجسلیٹو کونسلوں نے منتخب کیا ہو۔ قائداعظم کے اس فاضلانہ اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے اہم ترین ریزولیشن کو ہندوستان کے ہر حلقہ نے انتہائی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اُن کی سیاسی قابلیت کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مئی ۱۹۱۴ء میں انہیں کانگرس نے اپنا نمائندہ بنا کر انگلستان بھیجا جہاں اُنکا شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ یہاں قائدِاعظم نے بڑی قابلیت اور جرأت سے ہندوستانیوں کی نمائندگی کی۔

۱۹۱۴ء میں انگریزوں اور جرمنی کے درمیان پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ ہندوستانیوں نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنا تن من دھن سب کچھ اُن کی طرف سے جنگ کی بھینٹ چڑھا دیا۔ انگریزوں نے وعدہ کیا کہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو اصلاحات دی جائیں گی یہ موقع بڑا اہم تھا۔ اس موقع پر ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے رہنما متوقع اصلاحات میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حصّہ دلوانے کے لئے سرگرم جدوجہد کریں۔ چنانچہ اس نازک فرض کو قائدِاعظم نے اپنے ذمہ لیا اور ۱۹۱۶ء میں بمبئی پراونشل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے جہاں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا وہاں جداگانہ انتخاب کا نظریہ پیش کر کے پاکستان کی بنیاد رکھ دی۔ اور لکھنؤ کے اجلاس میں ہندو اور مسلمان نمائندوں سے اس کی توثیق کروا کر

ہندوؤں سے دو قوموں کے نظریہ کی حقیقت کو صحیح تسلیم کروالیا۔
جنگ کے خاتمہ کے بعد انگریز اپنے وعدوں سے پھر گئے اور بجائے اس کے کہ وہ ہندوستان کو اصلاحات دے کر اس ملک میں عوامی حکومت قائم کرتے اُنہوں نے "رولٹ ایکٹ" پاس کر کے ہندوستانیوں کی رہی سہی آزادی کو بھی ختم کر دیا۔ ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ اندھا دھند مقدمات چلا کر انہیں اپیل کرنے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ حکومتِ برطانیہ کے اس افسوسناک طرزِ عمل نے قائدِ اعظم کو اس سے برگشتہ کر دیا اور انہوں نے نہایت جرأت مندانہ اور دندان شکن طریق سے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے سامنے رولٹ ایکٹ کی دھجیاں اُڑا کر اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دیدیا۔ قائدِ اعظم کے استعفیٰ کے بعد ملک کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے۔ ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک بے اطمینانی اور انتشار پھیل گیا۔ کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی گولیوں اور لاٹھیوں کا آزادانہ استعمال شروع ہو گیا جیل خانوں میں گنجائش نہیں رہی اور ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ ترکی کے ساتھ اتحادیوں کے غیر شریفانہ سلوک نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا۔ اور وہ اپنے مسلمان ترک بھائیوں کی امداد کے لئے میدان میں کود پڑے تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدمِ تعاون نے ہندوستان میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا گاندھی جی اور اُن کے ہندو ساتھی موقع کو غنیمت سمجھ کر میدان میں آ گئے اور ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت ایسے غلط طور پر ان کی رہنمائی کرنے لگے جس کے نتیجے میں انہیں زبردست جانی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ قائدِ اعظم نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کی رہنمائی کی اور انہیں غلط قیادت کے ہاتھوں میں جانے سے باز رکھا مگر وہ بُری طرح مشتعل ہو چکے تھے۔ ہندو کی ساحری اپنا پورا کام کر چکی تھی۔

مسلمان اندھا دھند گاندھی جی کے پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے۔

اس موقع پر قائداعظم کانگرس سے قطعی طور پر ناامید ہو گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ اُن کی طرف سے کی گئی صلح اور اتحاد کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور اب ہندو مسلمانوں کو تباہ کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے ۱۹۲۰ء کے بعد کانگرس سے قطعی طور پر علیحدگی اختیار کر لی۔

۳ رفروری ۱۹۲۸ء کو سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ کمیشن کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستان کی سیاسی فضا پھر گرم ہو گئی۔ کانگرس اور مسلم لیگ اپنی اپنی جگہ ایسی تجاویز پر غور و خوض کرنے لگیں جن کے ذریعہ اہل ہند آزادی کی منزل سے ہمکنار ہو سکیں۔ مگر نہرو رپورٹ نے حریت پسند اور حقیقی معنیٰ میں قومی جذبہ سے سرشار ہندوستانیوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں کے حقوق کو بُری طرح پامال کیا گیا تھا بلکہ بالفاظ دیگر انہیں ہندوؤں کا غلام بنا کر رکھ دیا گیا۔ نہرو رپورٹ کی منظوری کے وقت قائداعظم انگلستان میں تھے واپسی پر انہوں نے اس کو بغور پڑھا اور اس میں بعض ترامیم کر کے اسے کانگرس کے سامنے رکھا۔ مگر کانگرس نے ان ترامیم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک بار پھر اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔

آخر ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے ہندو مسلم کش مکش کا ایک حل پیش کیا جس کی بنیاد قائداعظم نے ۱۹۱۶ء کی میثاق لکھنؤ میں جداگانہ انتخابات کا نظریہ پیش کر کے رکھ دی تھی۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لئے ایک ایسی حکومت کی ضرورت پر زور دیا جس میں وہ اسلامی اُصولوں کی روشنی میں آزادانہ زندگی گذار سکیں۔ انہوں نے پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی سلطنت قائم کرنے کا نظریہ پیش کیا اور مسلمانانِ ہندوستان کو ایک واضح

نصب العین دیا۔ ایک منزل کا تصوّر پیش کیا۔ اُنہوں نے قائداعظم سے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور انہیں بھی اپنا ہم خیال پایا۔ آخر علامہ اقبال کا یہی خواب قائداعظم کے ہاتھوں پورا ہُوا۔

۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو اُنہوں نے لاہور کے تاریخی اجلاس میں وہ قرارداد پیش کی جسے "پاکستان" کے نام سے پکارا گیا۔ اس اجلاس میں اُنہوں نے نہایت واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کے نزدیک مسئلہ آزادی کا ایسا کوئی حل قابلِ قبول نہ ہوگا جو اس قرارداد سے متصادم ہوتا ہو۔ یہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا مطالبہ ہے وہ اسے پورا کروا کر دم لیں گے۔

ابتداء میں اُن کی قرارداد اور مسلمانوں کے اس متفقہ مطالبہ کا مذاق اُڑایا گیا۔ اسے مجذوب کی بڑ قرار دیا گیا۔ اسے ناقابلِ عمل بتایا گیا مگر دس کروڑ مسلمانوں کا یہ مدبّر اور نڈر راہنما اور آہنی عزائم رکھنے والا ضیغمِ سیاست نہایت پامردی سے اپنے مطالبہ پر اڑا رہا اور منتشر مسلمانوں کی تنظیم کر کے اُنہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتا رہا۔ مسلم لیگ جو اس سے پہلے ایک جسدِ بے جان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس میں حرکت و عمل کی روح پھونکی۔ ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک گھوم پھر کر مسلمانوں کو بیدار کیا۔ انہیں مسلم لیگ کے ہلالی پرچم تلے متحد کیا۔ ایک طرف ملکی دشمن کی مکاری اور دوسری طرف انگریز کی عیّاری کا پردہ چاک کیا۔ اپنے تدبّر اور فراست سے اُن کی تمام چالوں کو ناکام بنایا اور آخر کار جب ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کا تاریخی دن طلوع ہُوا تو پاکستان کا خواب حقیقت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ سارا کرشمہ اس مردِ مومن کی عقل و فراست اور تدبر و سیاست کا مرہونِ منت تھا۔ اُنہوں نے اپنی انتھک جدوجہد غیر متزلزل عزم و استقلال اور محکم یقین کے بل پر پراگندہ اور منتشر مسلمانوں کو ایک عظیم مملکت عطا کر دی انہیں

ایک جگہ جمع کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنے کے تمام مواقع مہیا کر دیئے۔

اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچا کر مسلمانوں کا یہ قائد بیباک ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی شب کو دس بج کر پچیس منٹ پر کروڑوں انسانوں کو سوگوار چھوڑ کر راہی ملک عدم ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

عادات و خصائل

قائد اعظم کی شخصیت بہت بارعب اور پُروقار تھی۔ ادنیٰ درجے کے لوگوں کا تو ذکر ہی کیا۔ بہت بلند مرتبہ کے لوگ بھی ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے۔ سوائے چند آدمیوں کے جو اُنہیں "مائی ڈیر جناح" کہہ کر مخاطب کرتے تھے وہ بھی صرف خط و کتابت میں شاید ہی کوئی شخص اُن کے سامنے انہیں نام سے مخاطب کرتا ہو۔ اُن کی آواز میں بہت دبدبہ اور وقار تھا۔ جب وہ گفتگو کرتے تھے اور اپنے لانبے ہاتھ اور پتلی پتلی انگلیوں کو جنبش دیتے تھے تو لوگ مبہوت رہ جاتے تھے۔

وہ بڑے حاضر دماغ اور زود فہم تھے۔ اُن کے سامنے کسی بات کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ صرف اشارہ کر دینا کافی تھا۔ وہ بہت جلدی بات کی تہہ تک پہونچ جاتے تھے۔

مگر جب خود کسی بات کا فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھتے تھے تو اُس کے ہر پہلو پر غور کرتے تھے اُس پر بار بار سوچتے تھے اور جب ایک فیصلہ کر لیتے تھے تو شاید پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے وہ اپنے فیصلہ سے بال بھر نہیں ہٹتے تھے۔

وہ بہت محنتی اور انتھک تھے۔ چوبیس گھنٹے میں بارہ گھنٹے کام کرتے تھے اپنے نام کی ساری ڈاک خود دیکھتے۔ بیماری کے دوران میں بھی کام کرتے رہتے تھے۔ جب کبھی سفر درپیش ہوتا تو سامانِ سفر بھی خود ہی باندھتے۔ اپنے پروگرام پر نہایت

باقاعدگی اور پابندی سے عمل کرتے۔ اُن کے سونے، جاگنے، نہانے، ناشتہ کرنے اور کھانے غرض ہر کام کا وقت مقرر تھا۔

وہ بہت خوش پوش تھے اور لباس کی نفاست کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ لباس کی تراش خراش اور اُس کے پہننے کا انداز اُن کے مزاج کی نفاست اور خوش سلیقگی کا پتہ دیتا تھا۔ ابتدائے عمر سے انگریزی لباس پہننے کے عادی تھے مگر آخر میں شیروانی شلوار اور سیاہ ٹوپی جو اُن کے نام پر جناح کیپ کہلاتی ہے پہننے لگے تھے۔ وہ انگریزی کھانوں کے مقابلے میں دیسی کھانے زیادہ پسند کرتے تھے۔ کباب اُن کی دل پسند چیز تھی۔ پھلوں میں آم، نارنگی اور پپیتا بہت مرغوب تھا۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

سید الاحرار مولانا حسرت موہانی

ابتدائی حالات

مولانا حسرت کا نام فضل الحسن تھا۔ ۱۲۹۵ھ میں ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید اظہر حسن موہانی تھا۔ جو نیشا پوری سادات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے سلسلۂ نسب امام علی موسیٰ رضا تک پہونچتا ہے۔ مولانا حسرت کے والد فتح پور ہسوہ میں تین گاؤں کے مالک تھے اور انہیں گاؤں کی آمدنی اس خاندان کی پرورش کا ذریعہ تھی۔

تعلیم

ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا کو موہان کے ایک مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں آپ نے قرآن شریف ختم کرنے کے بعد اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مزید تعلیم کی غرض سے آپ مڈل اسکول میں داخل ہو گئے اور ۱۸۹۴ء میں نہایت اعزاز اور امتیاز کے ساتھ اُردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ آپ تمام صوبہ میں اوّل آئے۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ کے مستحق قرار دیئے گئے اسکے بعد آپ فتح پور کے ہائی اسکول میں داخل ہو گئے اور ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان اوّل نمبر میں پاس کیا۔ اُن دنوں ڈاکٹر سر ضیاءالدین ایم اے او کالج علی گڑھ میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ جب اُنہوں نے گزٹ میں مولانا حسرت کا نام اوّل نمبر پر کامیاب ہونے والوں میں دیکھا تو انہیں اپنے پاس آکر علی گڑھ کالج میں داخل ہونے کی دعوت دی مولانا نے یہ دعوت قبول کر لی اور علی گڑھ جا کر ایم اے او کالج میں داخل ہو گئے۔

شاعری کی ابتدا

عربی فارسی اور اُردو کی تحصیل تو مولانا نے موہان ہی میں کر لی تھی اور وہیں سے اُن کی شاعری کی ابتدا ہو گئی تھی۔ اس کے بعد فتح پور ہائی اسکول کے زمانۂ قیام میں اُن کا ذوقِ سخن اور بھی پروان

چڑھا۔ ساتھ ساتھ اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ سونے پر سہاگہ کا کام کرتا رہا۔
مگر علی گڑھ آکر حقیقی معنیٰ میں مولانا کے جوہر کھلے۔ ایک تو اس لئے کہ علی گڑھ پہنچنے
تک اُن کا شعور بخوبی بیدار ہو چکا تھا مطالعہ وسیع ہو چکا تھا۔ پھر یہ کہ علی گڑھ
کی فضا موہان اور فتحپور کی فضا سے کہیں زیادہ دلکش، علم پرور اور مذاقِ سخن کو
نکھارنے والی تھی۔ یہاں ایک سے ایک ہونہار اور ذہین نوجوانوں اور فاضل پروفیسر
کا مجمع رہتا تھا۔ سیّد سجاد حیدر یلدرم، مولانا شوکت علی مرحوم، خان بہادر سید ابو محمد
جیسے لوگ مولانا کے ساتھیوں میں تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، صاحبزادہ آفتاب احمد
خاں، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک جیسے پروفیسر اور اکابرینِ علی گڑھ مولانا
کے مشفق اور سرپرست تھے اور مولانا کو ان کی صحبتیں میّسر آتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ
یہاں کی فضا انہیں خوب راس آئی اور تحصیل علم کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کی محفلیں
بھی منعقد ہوتی رہیں اور مولانا دادِ سخن پاتے رہے۔ یہیں اُنہوں نے مجلس "اُردوئے
معلّی" قائم کی۔ جس نے علی گڑھ کی فضا میں بڑے بڑے ادبی ہنگامے برپا کئے۔ ۱۹۰۳ء
میں مولانا حسرت نے علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کر لیا۔

حُرّیت کا پہلا نعرہ

علی گڑھ کے دورانِ قیام میں جہاں مولانا حسرت
کے ادبی جوہر چمکنے شروع ہوئے وہاں اُن کے
سیاسی خیالات و افکار بھی پروان چڑھنے لگے۔ مولانا کی سیرت اور اُن کے عہد بہ
عہد کے افکار و خیالات کا بغور مطالعہ کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حُرّیت اور
غلامی سے نفرت کی چنگاری اوّل دن سے اُن کے نہاں خانۂ دل و دماغ میں پوشیدہ
تھی۔ چنانچہ علی گڑھ میں اس کا سب سے پہلے ظہور ہوا جب اُنہوں نے کالج کے
انگریز پرنسپل کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس جُرم میں اُنہیں کالج سے نکال
دیا گیا۔ مگر بعض بزرگوں کی سفارش پر انہیں پھر داخل کر لیا گیا اور امتحان میں بیٹھنے کی اجازت

دے دی گئی۔

اخبار نویسی کی ابتدا

بی اے کا امتحان دے کر ۱۹۰۳ء میں مولانا نے "اردوئے معلیٰ" کے نام سے ایک رسالہ کا ڈکلریشن حاصل کرنے کی درخواست دیدی۔ اور شہر میں آکر اس کے ابتدائی انتظامات شروع کر دیئے۔ جب رزلٹ شائع ہوا اور مولانا کی کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔ تو اُن کو وکٹوریہ کالج گوالیار میں ریاضی اور عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے دعوت دی گئی۔ مگر مولانا نے یہ دعوت رد کر دی اور ادب ملک وملت کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا کر اس میدان میں گامزن ہو گئے "اردوئے معلیٰ" جاری ہوا اور بڑی آب وتاب سے جاری ہوا۔ بہت جلد اردو ادب میں اس کو ایک بلند مقام حاصل ہو گیا۔ اس کے مضامین سنجیدہ قسم کے علمی وادبی حلقوں میں موضوع بحث ہے جیسا کہ سطور مندرجہ بالا میں عرض کیا جا چکا ہے شعر وادب کے ذوق کے ساتھ ساتھ مولانا سیاست کی وادیٔ خارزار میں بھی قدم رکھ چکے تھے۔ چنانچہ اردوئے معلیٰ کے صفحات میں شعر وادب کے پہلو بہ پہلو موضوع سیاست سے متعلق مضامین بھی شائع ہونے لگے۔

قید فرنگ

چنانچہ ۱۹۰۸ء میں "اردوئے معلیٰ" کے ایک شمارہ میں انگریزوں کی مصر سے متعلق پالیسی پر ایک بہت سخت اور باغیانہ قسم کا مضمون شائع ہوا جس میں پوری قوت سے انگریز کے جارحانہ عزائم کا پردہ چاک کیا گیا۔ بھلا انگریز یہ شدید تنقید کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ مولانا کو گرفتار کر لیا گیا اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔ جس میں علی گڑھ کالج کے اکابرین خصوصاً نواب وقار الملک نے بھی مولانا کے خلاف گواہی دی۔ انگریزی عدالت کی نظر میں وہ بغاوت کے مجرم قرار پائے۔ اُن کا پریس ضبط کر لیا۔ کتابوں کا قیمتی ذخیرہ برباد کر دیا گیا اور انہیں دو

سال کی قید سخت کی سزا دیدی گئی۔ اس قید میں مولانا کو بے حد تکالیف دی گئیں اور اُن کی طاقت سے زیادہ کام لیا گیا۔ مگر قید کی یہ سختیاں اُنہیں اُن کے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا سکیں۔

سیاست کا آغاز

مولانا حسرت کی سیاست کا باقاعدہ آغاز تو ۱۹۰۴ء سے ہو گیا تھا جب وہ کانگرس میں شامل ہو گئے بمبئی کے اجلاس میں کانگریس کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے مولانا تلک کے بڑے معتقد تھے اور انہیں ہندوستان کے سیاست دانوں میں سب سے زیادہ نڈر اور بے باک سیاست دان قرار دیتے تھے۔ چنانچہ جب سورت کانگریس کے اجلاس میں تلک کانگریس سے اختلاف کر کے اس تنظیم سے علیحدہ ہو گئے تو اُن کی پیروی میں مولانا حسرت نے بھی کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

"اُردوئے معلیٰ" میں مطبوعہ قابلِ اعتراض مضمون کے سلسلے میں مولانا حسرت ۱۹۰۸ء میں قید ہوئے اور دو سال کی سزا کاٹ کر ۱۹۱۰ء میں رہا ہوئے۔ قید فرنگ سے رہائی کے بعد اُن کے دوستوں اور عزیزوں نے جان توڑ کوشش کی کہ وہ سیاست سے علیحدگی اختیار کر لیں مگر حسرت کے کردار کا یہ سب سے نمایاں جوہر تھا کہ جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے تھے تو اس سے سر مو نہیں ہٹتے تھے خواہ اُس میں اُن کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے دوستوں اور عزیزوں کی پُر خلوص کوششیں رائیگاں گئیں اور مولانا نے سیاست سے وابستہ رہنے کے فیصلہ میں قطعاً تبدیلی نہیں کی۔ یہاں تک کہ اُن کے دوستوں نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ "اُردوئے معلیٰ" کے خریداروں نے قطع تعلق کر لیا۔ اُن کی مالی حالت سخت خراب ہو گئی۔ مگر اُنہوں نے ان مصائب کو پرِ کاہ کے برابر وقعت نہیں دی بلکہ اپنے نظریات میں پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر لی۔

سودیشی تحریک

انہیں دنوں سودیشی تحریک کی ابتدا ہوئی اور ولائتی کپڑے

کا بائیکاٹ کرکے دیسی کپڑا استعمال کرنے کا نعرہ بلند ہؤا۔ مولانا حسرت نے اس تحریک کو خوش آمدید کہا۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ سے قطعاً خالی ہے کہ مولانا حسرت پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اس تحریک میں اتنی سرگرمی سے حصّہ لیا۔ صرف یہی نہیں کہ دوسروں کو ولایتی کپڑے کی جگہ سودیشی کپڑا پہننے کی تلقین کی خود بھی ہندوستان کا بنا ہؤا نہایت سادہ اور چند آنے گز کا کپڑا پہننا شروع کیا اور ساری عمر اسی وضع پر قائم رہے۔

مولانا نے اس تحریک میں عملی طور پر بھی حصّہ لیا۔ اور مولانا شبلی کی سفارش پر مسٹر فاضل بھائی کریم بھائی سے دیسی کپڑا خرید کر کانپور میں ایک اسٹور قائم کر دیا۔ اس کے علاوہ شمالی ہند کے ہر ہر شہر اور قصبے میں پھر کر لوگوں کو ولایتی کپڑے کا بائیکاٹ کرنے اور دیسی کپڑا استعمال کرنے کی تلقین کی جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ شمالی ہند میں ولایتی کپڑے کے خلاف عام بیزاری پھیل گئی اور بے شمار لوگوں نے دیسی کپڑا استعمال کرنا شروع کر دیا۔

مسلم لیگ میں شمولیت

مولانا حسرت موہانی ایک عرصہ تک مسلم لیگ سے سخت ناراض رہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد ڈالنے والوں اور پھر سرپرستی کرنے والوں میں اکثریت سروں، خان بہادروں، نوابوں اور ایسے لوگوں کی تھی جو دامنِ سرکارِ انگلشیہ سے وابستہ تھے۔ اُس زمانہ میں جب مسلم لیگ پر سر آغا خاں کا اثر تھا مولانا مسلم لیگ کو آغا خانی لیگ کہا کرتے تھے۔ مگر جب مسلم لیگ میں قومی کام کرنے کا ولولہ پیدا ہؤا جب اس جماعت کے اراکین میں جرأت اور حوصلہ کے آثار نظر آنے لگے تو مولانا حسرت بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور آخر مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کے سرگرم رُکن بن گئے۔ مگر اس طرح نہیں کہ اپنے آپ کو اس میں بالکل مدغم کر دیا ہو۔ بلکہ ہر موقع پر اپنے سیاسی نظریات اور حریت پسندی کی حفاظت کرتے رہے چنانچہ مسجد کانپور کی شہادت کے ہنگامے کے بعد جب مسلمانوں اور حکومت میں مصالحت ہو گئی اور آگرہ میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۴ء میں لارڈ ہارڈنگ کا شکریہ ادا کرنے

کے لئے ایک ریزولیشن پیش ہوا تو بڑے بڑے احرار نے اُس کی تائید کی مگر صرف دو آدمی تھے جنہوں نے اس کی مخالفت کی ایک مولوی عبدالودود بریلوی اور دوسرے مولانا حسرت غرض مسلم لیگ کی سیاست بھی اُنہیں راس نہ آئی اور آخر وہ اس سے بھی الگ ہو گئے۔

پھر قید فرنگ میں

پہلی جنگِ عظیم میں ٹرکی نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے سازش کر کے شریف مکہ کو ٹرکی کے خلاف اُکسایا اور بغاوت کروادی ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کے حق میں انگریزوں کے جارحانہ رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈر شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وغیرہ گرفتار کر لئے گئے۔ آخر میں مولانا حسرت کی بھی باری آگئی اور اُنہیں بھی ۱۹۱۶ء میں گرفتار کر کے للت پور میں قید کر دیا گیا اور پھر میرٹھ جیل میں بھیج دیے گئے۔ اس قید کے زمانے میں بھی انہیں بے انتہا مصائب کا نشانہ بنایا گیا۔ کوئی سختی ایسی نہیں تھی جو اُن پر روا نہ رکھی گئی ہو۔

تیسری بار ۱۹۲۲ء میں پھر مولانا کو گرفتار کر لیا گیا اور بائیس ۲۲ سال کی سزا دی گئی مگر دو سال کے بعد ہی رہا کر دیا۔

مولانا کا نظریۂ آزادی

مولانا حسرت وہ واحد سیاستدان تھے جو اوّل دن سے ہندوستانیوں کے لئے معمولی اصلاحات یا انگریزوں کے زیرِ اثر نیم خود مختارانہ قسم کی آزادی کے مخالف تھے۔ اُن کا نظریہ ابتدا سے یہی تھا کہ ہندوستان، ہندوستانیوں کا ملک ہے اور اس پر ہندوستانیوں کی خود مختار حکومت ہونی چاہیئے۔ بالفاظ دیگر وہ ہندوستان کی کامل آزادی کے علم بردار تھے۔ اور اُن کے دور میں (۱۹۲۸ء تک) کوئی ہندوستانی رہنما ایسا نہیں تھا جو ہندوستان کی کامل آزادی کا خواہاں ہو۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں احمد آباد کے مقام پر

کانگریس کا تاریخی جلسہ منعقد تھا گاندھی جی سوراج ملنے کی آخری تاریخ کا اعلان کر چکے تھے۔ ہندوستان میں اِس سرے سے اُس سرے تک ایک ہیجان برپا تھا۔ گاندھی جی کے علاوہ کانگریس کے دوسرے لیڈر بھی اپنی حرّیت پسندی کی وجہ سے پوجے جا رہے تھے مگر اسی کانگریس کے پنڈال میں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا جو گاندھی جی اور اُن کے کانگریسی رفقا سے کہیں بڑھ کر حریت کا پرستار تھا۔ جلسہ گاہ کے قریب ہی ایک پنڈال میں مسلمان زعما کا اجلاس ہو رہا تھا اور اس اجلاس کو خطاب کرنے کیلئے گاندھی جی خاص طور پر بلائے گئے تھے کہ اس اثنا میں مولانا حسرت نے کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی تحریک پیش کر دی۔ گاندھی جی کو اس کی خبر دی گئی وہ بھاگے ہوئے سبجیکٹ کمیٹی کے اجلاس میں آئے اور مولانا کو لاکھ سمجھایا کہ آپ ہندوستان کو مکمل آزادی دینے سے متعلق اپنی تحریک واپس لے لیجئے۔ مگر مولانا نے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گاندھی جی اور کانگریس کے وہ لیڈر جن کی حریت پسندی ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آزادیٔ ہند کے معاملے میں مولانا سے کتنے پیچھے تھے۔

اس اختلاف نے مولانا کو کانگریس سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا اور اُنہوں نے مولانا آزاد سبحانی کے اشتراکِ عمل سے ایک اور سیاسی پارٹی کی بنیاد ڈالی جو کمیونزم سے بہت حد تک متاثر تھی۔ خود مولانا بھی پہلے نیشنلسٹ اور پھر کمیونسٹ خیالات سے متفق ہو گئے تھے اور عرصے تک ہندوستانیوں کی اُن غلط فہمیوں کو دُور کرتے رہے جو انہیں کمیونزم سے متعلق پیدا ہو گئی تھیں۔ مگر اُن کی وہ پارٹی جو اُنہوں نے مولانا آزاد سبحانی کے ساتھ قائم کی تھی زیادہ عرصے تک نہ چل سکی۔ جب مسلم لیگ میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور اُس کی عنان قائدِ اعظم کے مضبوط ہاتھوں میں آئی تو وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور قائدِ اعظم کی سرکردگی میں قوم کو لیگ کے پلیٹ فارم پر متحد

کرنے میں کوشاں رہے اس سلسلے میں اُنہوں نے ہندوستان گیر دَورے کئے اور پوری قوت سے مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کی ترغیب دی مگر مسلم لیگ میں شمولیت کے باوجود بھی وہ بہت بیباکی سے اپنے نظریات کا اظہار کرتے رہے اور قائدِاعظم جیسے عظیم المرتبت رہنما سے بھی اختلاف رائے کرنے میں نہیں ہچکچائے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ سے قطعاً خالی ہے کہ مسلم لیگ کے اجلاس میں صرف حسرت موہانی کی شخصیت واحد شخصیت ہوتی تھی جو قائدِاعظم کی مخالفت میں بلاجھجک کھڑی ہوجاتی تھی وہ اس کی پرواہ کئے بغیر کہ میرا کوئی بھی ہم خیال نہیں ہے بڑی جرأت مندی اور پورے اعتماد سے اپنی رائے کا اظہار کردیتے تھے چنانچہ ایک بار جب اُن سے نظریۂ پاکستان کے متعلق استفسار کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ ـــ "میں پاکستان کا موید ہوں لیکن پاکستان ڈومنین کا قائل نہیں۔ بلکہ پاکستان جمہوریت کا علم بردار ہے اور یہی نکتہ میرے اور قائدِاعظم کے درمیان ایک خلیج پیدا کررہا ہے"۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا ہندوستان ہی میں رہے اور ہندوستانی پارلیمنٹ میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ترجمانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

وفات

وفات سے چند ماہ پہلے وہ حج سے واپسی پر کراچی تشریف لائے۔ اور وہاں سے لاہور آئے یہاں چند روز مقیم رہ کر ہندوستان واپس چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ بیمار رہ کر ۱۵ ر مئی ۱۹۵۱ء کو فوت ہوگئے۔

عادات و خصائل

مولانا حسرت بہت ہی منکسر المزاج اور درویش صفت انسان تھے۔ اُن کا لباس انتہائی معمولی ہوتا تھا اتنا معمولی کہ شاید ہندوستان کے کسی رہنما کا نہیں ہوتا ہوگا۔ بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی، بوسیدہ شیروانی، تنگ پائنچے کا پاجامہ، شکستہ جوتا، بغل میں بستر اور ہاتھ میں تھیلا اور ایک چھڑی اس شانِ درویشی سے وُہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔

وہ بہت ہی بے نیاز اور مستغنی المزاج آدمی تھے۔ نازک سے نازک موقعہ پر بھی اپنی ذاتی ضرورت کے لئے کسی سے امداد طلب نہیں کی وہ علی گڑھ سے کانپور میں منتقل ہو گئے اور آخر تک یہیں نہایت کس مپرسی اور غربت کے عالم میں زندگی گذار دی۔ اُن کی درویشانہ زندگی عوام کی ہمدردی میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے والے جاہ پرست لیڈروں کیلئے قابلِ تقلید اور سبق آموز تھی۔ بقول علامہ سلیمان ندوی اُن کی زندگی میں حضرت ابوذر غفاری کی سی شان نظر آتی تھی۔ اُنہوں نے تمام عمر مصیبتیں اُٹھائیں ہندوستان کی آزادی کے لئے بڑھ چڑھ کر قربانیاں کیں۔ وہ بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہیں ہوئے۔ ہندوستان کی تاریخ آزادی کے تابناک اور پُرآشوب ابواب اُن سے وابستہ ہیں مگر اسکے باوجود غیر منقسم ہندوستان کے وہی تنہا لیڈر ہیں جنہیں نہال آزادی سے کوئی ثمرہ نہیں ملا۔ وہ وزارت یا سفارت کے کسی منصب پر فائز نہیں کئے گئے اور نہ اُنہوں نے کبھی اس کی خواہش کی مگر اُن کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی ہے۔ تاریخ آزادی ہند کا مورخ اُسے نظر انداز نہیں کر سکے گا اور یہ بدنامی کا داغ ہندوستان کے اربابِ حل و عقد کی پیشانیوں پر ہمیشہ قائم رہے گا۔

تصانیف

مولانا ایک حریت پسند اور بیباک رہنما ہونے کے باوجود بلند پایہ صحافی صاحبِ طرز ادیب اور نغز گو شاعر بھی تھے۔ کلاسیکی ادب میں اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ اُردو شاعری کی صنفِ غزل اُنہیں کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ (مولانا کی شاعری پر تبصرہ "شعر و ادب" کے حصے میں ملاحظہ فرمائیے) اُردوئے معلّٰی کے علاوہ اُنہوں نے ایک اخبار "مستقل" بھی کانپور سے شائع کیا تھا۔ اسکی بے لاگ تنقیدیں اور دلوں میں آزادی کے شعلے بھڑکانے والے مقالات آج بھی مولانا کی حریت پسندی کی شہادت دے رہے ہیں۔

اسکے علاوہ اُنہوں نے گیارہ جلدوں میں شعرائے متقدمین کے دواوین کا انتخاب شائع کر کے اُردو شاعری کے قیمتی سرمایہ کو محفوظ کرنے کے قابلِ قدر کارنامہ سرانجام دیا۔ اُن کی تصنیفات میں "نکات سخن"

شہیدِ ملت خان لیاقت علی خاںؒ

ابتدائی حالات

ملتِ اسلامیہ کا جانباز اور سرفروش مجاہد، دنیائے سیاست کا عظیم مدبر اور پاکستان کے دس کروڑ عوام کا شیر دل قائد آج سے اُنسٹھ سال قبل ۱۸۹۵ء میں مشرقی پنجاب کے ضلع کرنال میں پیدا ہوا۔ خان لیاقت علی خان کے والد بزرگوار کا نام نواب رستم علی خاں ہے جو کرنال کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے ضلع کرنال کا یہ خاندان جس میں تاریخ کی اس عظیم شخصیت نے جنم لیا تقریباً پانچ سو سال پہلے ترکِ وطن کر کے ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ اس خاندان کے جد امجد کا سلسلہ نسب نوشیروانِ عادل سے جا ملتا ہے۔

خان لیاقت علی خاں مرحوم اپنے بچپن ہی سے ذہین، خوش اخلاق اور جرأت مند ہونے کے ساتھ ساتھ جہاں گیری و جہان بانی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ مرحوم کی والدہ کا بیان ہے کہ ابھی اُن کی عمر کھیلنے کودنے ہی کی تھی کہ اُن سے عجیب عجیب حرکات سرزد ہونے لگیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنے ہجولیوں کے ساتھ مونڈھے اور کرسیاں بچھا کر خود صدر کی جگہ بیٹھ جاتے اور دوسری کرسیوں اور مونڈھوں پر اپنے "وزیروں" اور عہدیداروں کو جگہ دیتے۔ اس کے بعد مملکت کے انتظامی امور زیر بحث آتے۔ مختلف امراء و وزراء اپنے اپنے محکموں کی رپورٹیں پیش کرتے۔ جنہیں خان لیاقت علی خاں بڑے غور و خوض اور توجہ سے سنتے جیسے سچ مچ وہ کسی مملکت کے صدر یا بادشاہ ہیں اور مملکت کے انتظامی امور کا تمام تر انحصار اُنہیں پر ہے وزیروں اور امراء کو ہدایات دیتے۔ اور اُن کی غفلت پر سرزنش کرتے۔

غرض یہ کہ اُن کا بچپن ہی اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب یہ جھوٹ موٹ کی حکومت کا بادشاہ سچ مچ کی حکومت کا سربراہ بن جائے گا اور یہ ہونہار بچہ کروڑوں انسانوں کا نگہبان اور اُن کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا ہوگا۔

تعلیم

خان لیاقت علی خاں ایک متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس وجہ سے اُن کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی سہولتیں مہیا تھیں دوسرے تعلیم کا شوق اُن کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ذہانت اُن کی فطرت کا جزو لاینفک تھا۔ انہیں تعلیمی مدارج کو انتہائی سرعت سے طے کر کے جلد سے منتہائے کمال پر پہونچ جانے کا کتنا شوق تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ پانچویں جماعت میں اوّل نمبر پر کامیاب ہوئے تو تقسیم انعام کے جلسے میں انہیں ایک کتاب پیش کی گئی مگر اُنہوں نے یہ کہہ کر اسے واپس کر دیا کہ

"میں اس کے بدلے بیک وقت دو جماعتیں اوپر چڑھنا چاہتا ہوں"

چنانچہ چھٹی جماعت کا امتحان لئے بغیر انہیں ساتویں جماعت میں داخل کر لیا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں اُنہوں نے علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔

شادی

مگر قبل اس سے کہ وہ میٹرک کا امتحان پاس کرتے اُن کی چچازاد بہن سے شادی کر دی گئی۔ عام طور سے ازدواجی زندگی حصولِ تعلیم میں دیوار بن کر حائل ہو جاتی ہے۔ مگر خان لیاقت علی خاں جیسے عزمِ راسخ رکھنے والے کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکا اور ازدواجی زندگی انہیں ان کے ارادے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا سکی۔ اُنہوں نے بی اے کر کے ہی دم لیا۔ اس دوران میں لیاقت علی خاں نے کالجوں کے عام طلبہ کی طرح کھیل کود یا غیر ضروری سیر و تفریح میں اپنا وقت خراب نہیں کیا بلکہ اُن کے وقت کا بیشتر حصّہ کتب بینی اور علمی و ادبی مسائل پر گفتگو میں صرف ہوتا تھا۔

انگلستان کو روانگی

علی گڑھ سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کرنے کے بعد ۱۹۱۹ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے وہ انگلستان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ایم اے پاس کیا۔ یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے اور پھر ۱۹۲۲ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی اور کامیابی و کامرانی کے پرچم اڑاتے ہوئے وطن واپس آگئے۔

بات ادھوری رہ جائے گی اور لیاقت علی خاں کی شخصیت کا بیان بھی نامکمل رہ جائے گا۔ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ قیام انگلستان کے زمانہ میں اُن کی ذات مرجع خلائق تھی۔ اپنے ہم نشینوں اور یونیورسٹی کے طلبہ میں انہیں ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ ان کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ آکسفورڈ کی ہندوستانی مجلس کے معتمد خزانہ تھے۔ یہ امر اُن کی قابلِ اعتماد اور دیانتدار شخصیت پر بھی دلالت کرتا ہے۔

سیاسی زندگی کی ابتدا

۱۹۲۲ء میں لیاقت علی خاں کی زندگی کا پہلا دور ختم ہو گیا اور جب ۱۹۲۳ء کا آغاز ہوا تو وہ ایک نئے دور میں قدم رکھ چکے تھے۔ یہ نیا دور مسلم لیگ میں شمولیت کا تھا۔ خان مرحوم کی سابقہ زندگی اور اُن کے بچپن کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ سے قطعاً خالی ہے کہ وہ حصولِ تعلیم کو حصول زر کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اور نہ انہیں اس کی ضرورت تھی۔ شاید کوئی کہے کہ ممکن ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے اُن کا مقصد صوبائی یا مرکزی حکومتوں میں کوئی اعلیٰ عہدہ حاصل کر کے دنیوی وجاہت میں اضافہ کرنا ہو۔ مگر جب ہم اُن کی نوجوانی کے ایک واقعہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس خیال کے بودے پن پر ہنسی آجاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب انہوں نے بی اے کر لیا تو حکومت برطانیہ کی طرف سے اُن کے لئے آئی سی ایس کی ایک ملازمت پیش کی گئی۔ اگر انہیں برطانوی حکومت میں کوئی اعلیٰ منصب درکار تھا اور اگر

یہی اُن کا مطمعِ نظر تھا تو یہ تو اُن کے لئے بڑا سنہرا موقع تھا۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے اس پیش کش کو رد کر دیا کہ "میں تو صرف قومی خدمت کو اپنا شعار بنانا چاہتا ہوں"۔

اس کے بعد کا بھی ایک واقعہ ان کی بے لوث قومی خدمت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب وہ تعلیم سے فارغ التحصیل ہو کر سیاسی دُنیا میں قدم رکھ چکے تھے اور ہندو و انگریز سیاستدان آسمانِ سیاست کے اس تابناک ستارے کے تیور دیکھ کر خوفزدہ ہو رہے تھے۔ اُس وقت خان لیاقت علی خاں کو دامِ فریب میں پھانسنے اور مسلمانوں کے ایک مضبوط ستون کو گرانے کیلئے انہیں طرح طرح کے لالچ دیئے گئے۔ چنانچہ سر جگدیش چندر بسرمی واستو نے جو وائسرائے کی مجلس کے رُکنِ رکین تھے۔ خان لیاقت علی خاں کو جنوبی افریقہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر کا عہدہ پیش کیا مگر خان موصوف نے یہ کہتے ہوئے اسے رد کر دیا کہ "میں قومی زندگی سے کنارہ کشی کرنے کے لئے تیار نہیں"۔ چنانچہ یہی ہوا اور ۱۹۲۳ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو کر اُنہوں نے اپنے قول کی تصدیق کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہت کم لوگ مسلم لیگ کے نام سے واقف تھے۔ سارا ہندوستان کانگریس کے زیر اثر تھا۔ خود مسلمانوں میں سے ایک بڑی تعداد کانگریس سے وابستہ تھی۔ ایسے حالات میں جب مسلم لیگ (عوام میں) بالکل غیر معروف جماعت تھی اور اس کے مستقبل کے متعلق کوئی خوش کن یا اُمید افزا پیش گوئی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ خان لیاقت علی خاں کا اس میں شامل ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اُن کے پیشِ نظر صرف اور صرف قومی خدمت کا جذبہ تھا۔ اور وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو پہلے تو کانگریس یا انگریزی حکومت سے وابستہ رہے۔ کیونکہ اسوقت انہیں کا طوطی بول رہا تھا اور انہیں سے وابستگی میں اعزاز تھا اور جب مسلم لیگ کا سورج چڑھنے لگا

جب اس جماعت سے خوش آئند اُمیدیں وابستہ ہونے لگیں تو مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

مسلم لیگ سے وابستگی کے بعد خان لیاقت علی خاں نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز اسی جماعت کی خدمت کو بنا لیا۔ اسی جماعت کے پلیٹ فارم سے اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا اور اسی کے پلیٹ فارم پر خاتمہ ہوا (واضح ہو۔ کہ خان لیاقت علی خاں کی شہادت راولپنڈی کے اس جلسۂ عام میں ہوئی تھی جو مسلم لیگ کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا)۔

جب ۱۹۲۶ء شروع ہوا تو وہ یو۔پی کی مجلس آئین ساز کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۴۰ء تک اپنے صوبے کے مسلمانوں کی بے لوث خدمت کرتے رہے نہ صرف یہ بلکہ اُن کی سیاسی بصیرت اور صوبائی مسائل پر گہری نظر دیکھ کر انہیں مجلس آئین ساز کا ڈپٹی اسپیکر بھی بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ آٹھ سال تک فائز رہے۔ گو ابھی یو۔پی اسمبلی میں صوبہ کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کیلئے اُن کی ضرورت تھی، مگر اب ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو ان کی ضرورت تھی۔ وہ لیاقت کو صرف ایک صوبے تک محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لیاقت صوبائی حدود کو توڑ کر سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کو اپنا شعار بنائے۔ چنانچہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی پُرخلوص خواہشوں نے اپنا اثر دکھایا اور آخر کار یو۔پی کے مسلمانوں کا نمائندہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا نمائندہ بن کر ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں چلا گیا اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ تا آنکہ ۱۹۳۷ء آ گیا۔ ہندوستانیوں کو صوبائی وزارتیں بنانے کی دعوت دی گئی۔ آخر کانگریس کے انکار کے بعد نواب صاحب آف چھتاری نے وزارت بنائی اور خان لیاقت علی خاں کو مسندِ وزارت پیش کی مگر ان میں کس

حد تک دور بینی تھی اور وہ کتنے استقلال پسند سیاست دان تھے اُس کا اندازہ اُن کے مندرجہ ذیل جواب سے کیجئے. جو انہوں نے نواب صاحب کی پیش کش کا انکار کرتے ہوئے دیا تھا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ
— "میں اس عارضی آمد و رفت کا قائل نہیں ہوں" — چنانچہ یہی ہُوا اور چند روز کے بعد نواب صاحب کا قصرِ وزارت دھڑام سے زمین پر آ رہا۔
اس کے بعد جب پنڈت گوبند ولبھ پنتھ نے کانگریسی وزارت بنائی تو اُنہوں نے بھی لیاقت علی خاں کو قلمدانِ وزارت پیش کیا مگر لیاقت علی خاں نے یہ پیش کش بھی رد کر دی اور پنتھ جی کو جواب دیا کہ — "میں جیل جانے کو تیار نہیں" — پنتھ جی نے اپنی دانست میں لیاقت علی خاں پر وار کرتے ہوئے کہا کہ — "جب جیل جانے کا وقت آئے تو استعفیٰ دیدیجئے گا" — مگر لیاقت علی خاں بھی بہت حاضر جواب اور نہلے پہ دہلا مارنے والے انسان تھے۔ اُنہوں نے پنتھ جی پر پوری شدت سے حملہ کرتے ہوئے کہا کہ — "میں کھدر پہننے کا قائل نہیں" — پنتھ جی نے پھر پینترا بدلا — "صرف مجلس آئین ساز کے جلسوں میں کھدر پہن کر آجایا کیجئے" — مگر لیاقت علی خاں کب چُوکنے والے تھے اُنہوں نے پنتھ جی مہاراج کا ہتھیار اُنہیں پر چلا دیا — "میں اس طرح عوام کو دھوکا نہیں دے سکتا" — یہ پُر لطف اور دلچسپ گفتگو جو دو مختلف کیمپوں کے نمائندوں کے درمیان ہوئی بظاہر تو صرف دلچسپ ہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے مزاجوں اور سیاسی عقائد کی ترجمان بھی ہے آخر کار حالات نے ثابت کر دیا کہ دونوں گروہوں میں سے کون صاف گو اور حق پرست تھا اور یہ کہ لیاقت علی خاں کس قدر خود دار صاف دل روشن ضمیر اور دور اندیش سیاست دان تھے۔

اسی سیاسی تدبر اور انہیں پرخلوص خدمات کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۴۳ء میں انہیں اپنا جنرل سکریٹری منتخب کر لیا اور اس سال مرکزی اسمبلی میں وہ مسلم لیگ کے لیڈر منتخب کر لئے گئے۔

جب ۱۹۴۵ء کا آغاز ہوا اور ملک میں عام انتخابات شروع ہوئے جن میں مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنی نمائندگی کا حق کانگریس کو دیں یا مسلم لیگ کو تو قائدِاعظم کی سیاسی بصیرت نے اس عظیم کام کیلئے لیاقت علیخاں کی عظیم شخصیت کو منتخب کیا اور انہیں کی نگرانی اور ہدایت کے تحت یہ ملک گیر انتخاب ہوئے جن میں مسلم لیگ نے شاندار کامیابی حاصل کی اور قوم نے اپنا سر اونچا کر لیا۔ مسلمانوں اور مسلم لیگ کی اس قابلِ فخر کامیابی میں لیاقت علی خاں کے تدبر اور فراست کا سب سے زیادہ حصّہ تھا۔

۱۹۴۶ء۔۱۹۴۵ء میں جب ہندوستان کو آزادی دینے کے مسائل پر غور و خوض کی غرض سے شملہ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کانفرنس میں بھی انہیں بطورِ خاص مدعو کیا گیا۔ گویا اب لیاقت علیخاں کی شہرت و عظمت کا آفتاب چڑھ رہا تھا اور مخالفین کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

۱۹۴۶ء طلوع ہوا تو خان لیاقت علیخاں کو وائسرائے ہند کی مجلس انتظامیہ کا رکن بنایا گیا اور جب ۱۹۴۶ء کا آفتاب غروب ہونے لگا تو (دسمبر میں) وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے اور مسودہ آزادی پر تبادلہ خیال کرنے کیلئے قائدِاعظم کے دستِ راست کی حیثیت سے انگلستان تشریف لے گئے۔ جہاں اُن کا نہایت پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور جب اُنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور تحریک پاکستان کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور انگریزوں کو بتایا کہ قرارداد پاکستان کی منظوری کے سوا ہندوستان کی آزادی اور اندرونی کش مکش کا کوئی علاج

نہیں ہے۔ تو ان کے طرزِ استدلال اور شیوا بیانی پر انگلستان کے سیاست دان انگشت بدندان رہ گئے۔

جب ہندوستان میں عبوری حکومت قائم کی گئی تو وہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر مقرر کئے گئے اور انہوں نے ہندوستان کے وزیرِ مالیات کی حیثیت سے ۱۹۴۷،۴۸ء کا ایسا متوازن بجٹ پیش کیا جسے دیکھ کر ہندو سیاست دانوں نے اپنا سر پیٹ لیا کیونکہ اس بجٹ میں ہندو سرمایہ داروں پر ضرب کاری لگائی گئی تھی۔ اُن کی مالیاتی قابلیت کا ہندو اور انگریز دونوں نے لوہا مان لیا۔

اُنہوں نے قائدِ اعظم کے دستِ راست کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی گرانبہا خدمات انجام دیں اور ہر نازک موقعہ پر سفینۂ ملّت کو سہارا دیا۔ اُنہوں نے ہر لالچ اور ذاتی منفعت کو ٹھوکر مار دی۔ دنیائے اسلام ہی نہیں بلکہ دنیائے سیاست میں اپنے لئے بہت بلند مقام حاصل کر لیا۔ اتنا بلند کہ قائدِ اعظم کے علاوہ ہندوستان کی کوئی شخصیت اُن کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اُن کی اور قائدِ اعظم کی سرکردگی میں ہندوستان کے مسلمانوں نے جنگِ آزادی میں کامیابی حاصل کر لی تو ۱۵ را گست کو انہیں پاکستان کی نئی مملکت کا پہلا وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ امورِ دفاع کا قلمدان بھی سونپ دیا گیا اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ اُنہوں نے ان دونوں اہم فرائض کو کیسی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔

۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں انتہائی نازک اور خطرات سے لبریز دن تھا۔ جب بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم علیہ الرحمتہ ملّتِ اسلام کو چھوڑ کر مولائے حقیقی سے جا ملے تھے۔ لوگ دم بخود تھے کہ اب کیا ہو گا۔ ہر طرف تاریکی تھی، ہندوستان میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے کہ ایک طرف سے گرجدار آواز بلند ہوئی۔ اے قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج پامال کرنے والوں کے نام لیوا مسلمانو!

تمہیں کیا ہو گیا۔ بیشک قائدِ اعظم عدیم النظیر انسان تھے اور اُن کا جواب پیدا ہونا مشکل ہے۔ مگر یاد کرو تم کس کی اولاد ہو۔ اُن کی جن میں سے کیسی کیسی جلیل القدر شخصیتیں اُٹھ گئیں مگر اُن کے چہروں پر خوف و ہراس کا نشان تک نہ آیا اور جو پہلے سے بھی زیادہ مستعدی اور جراُت سے گرمِ کار ہو گئے۔ اپنے دل سے خوف و ہراس کو نکال کر پھینک دو۔ خدا پر نظر رکھو، اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ کرو۔ اتحاد، تنظیم اور احساسِ فرض کو پیشِ نظر رکھو اور نہایت ثابت قدمی سے میرے پیچھے چل پڑو میرا ذمہ ہے کہ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ وہ آنکھ جو تمہاری طرف بدارادے سے دیکھے گی بینائی سے محروم کر دی جائے گی۔ وہ قدم جو ناپاک عزائم لے کر تمہاری سرزمین کی طرف بڑھیں گے توڑ دیئے جائیں گے۔ وہ ہاتھ جو تمہیں نقصان پہونچانے کے لئے اُٹھیں گے کاٹ دیئے جائیں گے۔

جیسے طوفانوں میں ہچکولے کھاتے ہوئے سفینے کو سہارا مل گیا ہو۔ جیسے تاریکی میں بھٹکتے ہوئے قافلے کو اُمید کی کرن نظر آگئی ہو۔ قائدِ ملت کی گرجدار آواز نے پاکستان کے غم زدہ اور بے سہارا مسلمانوں کو سہارا دے دیا۔ اُن کے دل مضبوط ہو گئے اور وہ اپنے قائد کی رہنمائی میں ترقی اور استحکام کی منزلوں کی طرف ثابت قدمی سے بڑھنے لگے بڑے بڑے حادثے بھی اُنہیں اُن کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔

تاآنکہ ۱۹۵۱ء آپہونچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بعض شرپسندوں، صوبائی عصبیت اور ذاتی مفاد کے پرستاروں نے قائدِ ملت کی مخالفت شروع کر دی۔ جب ملک اندرونی اور بیرونی اُلجھنوں میں گھرا ہوا تھا اُس وقت ان آبرو باختہ لوگوں نے قائدِ ملت کی مخالفت کر کے ملک میں انتشار پیدا کر دیا۔ پاکستان کی ساکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا۔ جماعت بندی کر کے مسلم لیگ کو کمزور کر دیا۔ پنجاب کا ایک امن

دشمن اور ملک و ملّت کے مفاد کو پسِ پشت ڈال کو ذاتی مفاد کی پرستش کرنیوالا روزنامہ اُن کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ اُن پر نہایت گندے الزامات لگا رہا تھا۔ دروغ بافی اور افترا پردازی کے قابلِ نفرین مظاہرے کر رہا تھا۔ اُسوقت قائدِ ملّت کے احساسِ فرض نے ایک اور انگڑائی لی اور اُنھوں نے محسوس کیا کہ ملک کو مستحکم اور مسلم لیگ کو طاقتور جماعت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ لیگ کی باگ ڈور مضبوط ہاتھوں میں ہو۔ چنانچہ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اُنھوں نے مسلم لیگ کی مسندِ صدارت کو زینت بخشی اور صدرِ مسلم لیگ کی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں طوفانی دورے کر کے مسلم لیگ میں حرکت و عمل پیدا کی۔ پنجاب کے انتخابات کے سلسلے میں جب وہ لاہور تشریف لائے اور یونیورسٹی گراونڈ کے جلسۂ عام میں تقریر کرنے کیلئے کھڑے ہوئے تو غرض پرستوں کی طرف سے آئے ہوئے چند کرایہ کے لوگوں نے اُن کی مخالفت میں نعرے لگائے اور جلسے کو درہم برہم کرنا چاہا۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ پولیس یا فوج نے نہیں بلکہ اسی مجمع عام میں سے لیاقت کے پرستار اُٹھے اور اُنھوں نے پانچ منٹ میں کرایہ کے اُن ٹٹوؤں کو اُسی طرف روانہ کر دیا جدھر سے وہ آئے تھے اور پھر قائدِ ملّت پوری قوت سے باطل کی مخالفت اور حق کی تائید میں تا دیر گرجتا رہا اور کسی کی جرأت نہ ہو سکی کہ اُس کی مخالفت میں اُف بھی کرتا۔

وہ اپنے ارادوں میں چٹان کی طرح قوی، وہ عظیم مدبر اور بیدار مغز سیاست دان ہر خطرے اور ہر مخالفت کو مُسکرا مُسکرا کر برداشت کرتا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ ان مخالفتوں اور دھمکیوں کی حقیقت کیا ہے اور اُن کی بُنیاد کتنی پودی ہے۔ چنانچہ وہی ہوا۔ شدید مخالفتوں کے باوجود مسلم لیگ اُن کی سرکردگی میں کامیاب ہوئی اور مخالفین کو ذلّت ناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس کے بعد وہ پنجاب سے فتح وظفر کے شادیانے بجاتے ہوئے کراچی واپس چلے گئے اور پھر لاہور اُس وقت تک اُن کے دیدار سے محروم رہا جب تک کہ یہاں اُن کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

اچانک بھارتی افواج نے پاکستان کی سرحد پر نقل و حرکت شروع کی اور قائدِ ملّت کی باخبری اور ہوشمندی نے سُراغ لگا لیا کہ دشمنوں کے عزائم انتہائی خطرناک ہیں۔ اس بار پھر اُن کی قائدانہ جرأت اور سیاسی بصیرت نے کروٹ لی اور اُنہوں نے اپنی آتش بار تقریروں سے ملک کے نوجوانوں اور بوڑھوں دونوں کا خون گرما دیا۔ اُن کی آتش بیانی اور باوقار آواز سے بھارت کی فضائیں لرز اُٹھیں اور جب وہ لاہور آئے تو اہالیانِ شہر اُن کے راستہ میں بچھ گئے۔ وہ لوگ جو پہلے اُن کی مخالفت میں پیش پیش تھے حیرت سے کھڑے منہ دیکھ رہے تھے۔ منٹو پارک میں اُن کا ایسا پُر شوکت استقبال کیا گیا کہ تاریخ نظیر نہیں پیش کر سکتی۔

یہ وہ وقت تھا جب قائدِ ملت مقبولیت اور شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہونچ چکے تھے اور پھر آخر دم تک دُنیا کی کوئی طاقت انہیں ان بلندیوں سے نہ گرا سکی۔

قائدِ ملت کی سیاسی زندگی اور ملکی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے دورۂ امریکہ پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ قائدِ ملّت کا یہ دورہ جہاں پاکستان کو بیرونی دُنیا سے روشناس کرانے میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ وہاں اُس نے اُن کی شخصیت عظمت اور سیاسی تدبر و فراست کو بھی بیرونی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور امریکہ و یورپ کے وہ لوگ جو اب تک ایشیا کی اس عظیم شخصیت سے ناواقف تھے۔ اُس کا لوہا مان گئے۔ قائدِ ملّت نے اپنے دورۂ امریکہ میں ہر مقام پر اپنی تقریروں میں دو چیزوں پر خاص طور سے روشنی ڈالی۔ پاکستان اور اسلام۔ اُن کی وہ تقریریں جو اُنہوں نے امریکہ میں کیں اسلامی اور ملکی جذبہ سے سرشار ہیں اور اُن کا ایک ایک

نفظ ملک و ملّت کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے وہ امریکہ کے جس شہر میں گئے وہاں کے عوام اور خواص دونوں نے اُن کے حضور سرِ عقیدت جھکایا۔ اخبارات نے اُن کی تصاویر شائع کیں۔ اُن پر اداریہ لکھے جن میں اُن کی عقل و فراست اور تدبر و سیاست پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔ یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دیں۔ صدر مملکت اور وزراء و امراء نے اُنہیں مرحبا کہا۔ غرض یہ کہ اہلِ امریکہ کے دل و دماغ پر اپنی عظمت کا نقش بٹھا کر وہ کامیاب و کامران واپس آئے۔

ایک روز نازک موقع پر جب اُن کی باخبری اور دلیری کا امتحان ہونے والا تھا۔ اُنہوں نے حیرت انگیز ہوش مندی اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ یہ واقعہ راولپنڈی سازش کے مجرموں کی گرفتاری کا ہے۔ اندرونی انگیخت کی بناء پر فوج کے کچھ ناعاقبت اندیش افسروں نے ایک سازش کی تاکہ لیاقت علی خاں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدام کتنا خطرناک اور خون آشام تھا اور اس کے نتائج کتنے تباہ کن تھے۔

مملکتِ پاکستان کے دس کروڑ عوام قائد ملت کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کریں گے کہ اُنہوں نے اس سازش کا انکشاف کر کے ملک و ملّت کو تباہی سے بچا لیا۔ اور جب دنیا نے سُنا کہ قائد ملّت نے فوج کے بڑے بڑے جابر میجر جنرلوں اور بریگیڈیروں کو گرفتار کر کے یوں جیل میں ڈال دیا جیسے کوئی دودھ میں سے بال یا مکھی نکال کر پھینک دیتا ہے تو وہ اُن کی جرأت پر انگشت بدنداں رہ گئے۔

مگر افسوس کہ عین اُس وقت جب ملک و ملّت کو ان کی اشد ضرورت تھی ایک بداندیش اور سیاہ کار نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے جلسۂ عام میں گولی مار کر شہید کر دیا — اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن — اور قائد ملت

نے اپنے مندرجہ ذیل الفاظ کی صداقت کا ثبوت دے دیا جو کچھ ہی عرصہ پہلے اُنہوں نے اہلِ پاکستان کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔

"دولت میرے پاس نہیں، جائداد کا میں مالک نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو انسان کے ایمان میں خلل ڈالتی ہیں اور اُس کے عقیدے کو کمزور کرتی ہیں صرف ایک جان میرے پاس ہے اور وہ بھی چار برس سے پاکستان کے لئے وقف ہے۔ اب میں آپ کو کیا دوں — اس محبت اور اس عقیدت کے بدلہ میں — صرف یہ وعدہ کہ اگر پاکستان کی حفاظت کے لئے، پاکستان کی بقا کے لئے پاکستان کی عزت کے لئے قوم کو خون بہانا پڑا تو لیاقت کا خون بھی اُس میں شامل ہو گا۔"

فنِ انشاء پردازی

انشاء پردازی وہ فن ہے جس کے ذریعہ سے ایک انشاء پرداز انسانی محسوسات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ احساس کی دولت ہر انسان کے پاس ہوتی ہے۔ ہر انسان حالات و واقعات، غم و اندوہ، مسرت و انبساط، موسمی کیفیات اور مناظرِ قدرت سے متاثر ہوتا ہے مگر ہر انسان ان کیفیات کو اس طرح قلم بند کرنے پر قادر نہیں ہوتا ہے کہ ان کی بجنسہٖ تصویر کھینچ جائے اور پڑھنے والا اُس ماحول میں پہونچ جائے جس میں سے لکھنے والا گذر چکا ہے۔

مطالعہ کی ضرورت

کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے اُس موضوع سے متعلق تصانیف کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے کیونکہ جب تک کافی معلومات اور دماغ میں خیالات کا ذخیرہ نہ ہو اسوقت تک نہ صرف یہ کہ مضمون بہت کمزور ہوگا بلکہ اندازِ تحریر میں روانی اور برجستگی بھی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ موضوع سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرنے سے مضمون کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ فکر کے نئے نئے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ ایک پہلو سے دوسرا پہلو نکلتا ہے اور ایک نکتہ سے دوسرا نکتہ۔ اور جب آدمی لکھنے کیلئے قلم اُٹھاتا ہے تو اُسکے دماغ میں خیالات کی اس قدر آمد ہوتی ہے کہ لکھتے لکھتے ہاتھ تھک جاتے ہیں مگر خیالات کا دھارا تھمنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ بعض انشاء پردازوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کر کے پہلے کچھ نوٹس لے لیتے ہیں اور اُن نوٹس کو سامنے رکھ کر مضمون لکھتے ہیں بمضمون لکھنے سے پہلے کتابوں کا مطالعہ

نوٹس کی تیاری یا حوالوں کی تلاش علمی و ادبی تاریخی و تحقیقی، یا سیاسی و معاشی اور اسی قبیل کے دوسرے موضوعات پر مضامین لکھنے میں تو مدد دے سکتی ہے بلکہ ایسے موضوعات پر مضامین لکھنے کیلئے انتہائی ضروری ہے مگر جہاں تک ایسے مضامین کا تعلق ہے جو علمی و ادبی یا تاریخی و تحقیقی نہ ہوں بلکہ فرض کیجئے موسمیات یا مناظرِ قدرت سے تعلق رکھتے ہوں وہاں شدتِ احساس اور مشاہدے کی گہرائی کی ضرورت ہوتی ہے جن لوگوں میں مختلف کیفیات کو شدت سے محسوس کرنے کا مادہ اور ہر چیز کو غور سے دیکھنے کی عادت ہوتی ہے وہ لوگ اس میدان میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو انشاپردازی کی ابتدا کرنا چاہتے ہیں یا جو مبتدی کی حیثیت رکھتے ہیں اس میدان میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتے ہیں۔ جب تک کہ مختلف انشاپردازوں کی تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ نہ کریں۔ انہیں خواہ علمی و ادبی مضامین لکھنے ہوں خواہ موسمی کیفیات اور مناظرِ قدرت پر ہر حالت میں اعلیٰ پایہ کی بکثرت تصانیف کا پوری توجہ اور غور و فکر سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ تاکہ وہ لکھنے کے فن، اندازِ تحریر، جملوں کی ساخت اور الفاظ کے محلِ استعمال وغیرہ سے واقف ہو جائیں۔

عنوان

انشاپردازی میں عنوان کا تعین بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ عنوان کے لئے پُرشوکت اور پُرکشش الفاظ منتخب کر لیتے ہیں خواہ وہ مضمون میں بیان ہونے والے مطالب پر پوری طرح حاوی ہوں یا نہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ الفاظ کا جادو بڑا بھرپور اور کامیاب ہوتا ہے۔ ہر اچھا انشاپرداز اپنی تحریر میں زیادہ سے زیادہ پُرکشش اور حسین الفاظ استعمال کرتا ہے مگر دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ اُن الفاظ کی معنویت کیا حیثیت رکھتی ہے۔ ایک اچھا انشاپرداز الفاظ کے انتخاب میں بڑے سلیقے سے کام لیتا ہے اور

خاص طور پر عنوان کے معاملے میں کہ جس پر پڑھنے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے۔ وہ عنوان کے لئے جہاں زیادہ سے زیادہ جاندار اور دلکش الفاظ منتخب کرتا ہے وہاں اس بات کا بھی خیال رکھتا ہے کہ یہ الفاظ کم از کم ہوں۔ ایک اچھے جملے کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ اُس میں کم سے کم الفاظ ہوں اور زیادہ سے زیادہ مطالب دوسری بات جو عنوان کا تعین کرتے وقت پیش نظر رکھی جاتی ہے یہ ہوتی ہے کہ عنوان اس قدر جامع اور بولتا ہوا ہونا چاہئے کہ اُس پر نظر پڑتے ہی اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ اس میں کس قسم کی باتیں کہی گئی ہیں۔ بالفاظ دیگر عنوان مضمون کے ہر پہلو پر حاوی ہونا چاہئے۔

تمہید عام طور سے نفسِ مضمون پر روشنی ڈالنے سے پہلے متعلقہ مضمون کی تمہید کی ضرورت دو وجوہ سے پیش آتی ہے۔ کچھ تو اسلئے کہ بعض انشاء پرداز کے پاس خیالات کا ذخیرہ کم ہوتا ہے۔ اسلئے وہ لمبی چوڑی تمہید باندھ کر تھوڑے سے الفاظ میں اصل مضمون بیان کر دیتے ہیں۔ بعض انشاء پرداز اپنے مضمون میں زور پیدا کرنے اور کچھ اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کیلئے تمہید باندھتے ہیں اور بعض انشاء پرداز تمہید کو اُسکے اصلی رنگ میں باندھتے ہیں۔ عام طور سے تمہید میں مضمون کے ابتدائی حصول سے بحث کی جاتی ہے یا اجمالاً روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مضمون نگار آئندہ بیان ہونے والے واقعات کیلئے اپنے قاری کو تیار کرتا ہے اور اس کے ذہن کو ہموار کرتا ہے۔ جہاں تک تمہید کی ضرورت کا سوال ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثر و بیشتر اس کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ تمہید کو اس قدر اہمیت دینا کہ وہ نفسِ مضمون پر غالب آجائے ایک باکمال انشاء پرداز کے شایانِ شان نہیں ہے بلکہ اچھے انشاء پرداز انتہائی ضروری تمہید کے بعد اصل مضمون شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ضروری تمہید بھی مختصر

سے مختصر ہوتی ہے۔ تاکہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہی جا سکیں تمہید کے لئے ضروری ہے کہ اُس کا اصل مضمون کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہو اور پڑھنے والا یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو جائے کہ اگر تمہید کے یہ جملے نہ لکھے جاتے تو یہ مضمون نامکمل رہ جاتا۔ مگر میرے نزدیک تو یہی بہتر ہے کہ جہاں تک ہو سکے تمہید سے گریز کیا جائے۔ اصل مضمون کو اس انداز سے شروع کرنا کہ تمہید کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ ایک اچھے انشا پرداز کا کمال ہے۔

ذیلی عنوانات مضمون میں دلچسپی اور تنوع پیدا کرنے اور اسے مختلف حصّوں میں تقسیم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ کچھ ذیلی عنوانات قائم کر لئے جائیں تاکہ پڑھنے والے اُکتا نہ جائیں اور ہر نیا عنوان دیکھ کر اُن کے موڈ میں تبدیلی پیدا ہوتی جائے۔ ایک ہی عنوان کے تحت طویل مضمون پڑھتے پڑھتے دماغ میں تھکن پیدا ہو جاتی ہے لیکن جب نظر کے سامنے کوئی ذیلی عنوان آجاتا ہے تو ذہن کی اُکتاہٹ اور غیر دلچسپی جاتی رہتی ہے۔ پہلا موڈ ختم ہو جاتا ہے اور ذیلی عنوان دیکھ کر مضمون کے باقی حصّے کو پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا ہو جاتا ہے جو ذیلی سُرخی کی وجہ سے ایک اعتبار سے نئے مضمون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی ذیلی سُرخیاں قائم کرنے سے مضمون کے مختلف حصّے ہو جاتے ہیں اور ہر پہلو قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

زبان الفاظ اور زبان برتن کی حیثیت رکھتے ہیں اور معانی کھانے کی حیثیت اگر نہایت لذیذ اور نفیس کھانا گندے یا بھدّے برتنوں میں دیا جائیگا تو نفاست پسند طبیعتیں اسے قبول نہیں کریں گی۔ بالکل یہی حال الفاظ و معانی کا ہے اگر نہایت بلند مطالب اور نازک خیالات بھونڈے الفاظ اور غیر دلچسپ اور اُلجھی ہوئی زبان میں پیش کئے جائیں تو وہ ایک لطیف خیالات اور نفیس و نازک

دماغ رکھنے والے قاری کو اپیل نہیں کریں گے۔ اس لئے مطالب بیان کرنے کے
لئے زیادہ سے زیادہ موثر، دلکش اور شستہ زبان اختیار کرنی چاہئے۔ اس کے
ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ہر موضوع اور ہر مضمون کے لئے
ایک سی نوعیت کے الفاظ اور ایک سی زبان کا استعمال بھی نامناسب ہوتا ہے۔
بعض مضامین کے مخاطب عالم و فاضل ہوتے ہیں۔ بعض کے مخاطب، معمولی
قابلیت کے لوگ اور بعض درمیانے درجے کی قابلیت رکھنے والوں کیلئے ہوتے ہیں
اس لئے مضمون لکھتے وقت خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمارے مخاطب کس قسم کے لوگ
ہیں۔ اسکے علاوہ مضمون اور مطالب کی نوعیت بھی الفاظ اور زبان کے ساتھ بہت
قریبی تعلق رکھتی ہے۔ بعض جگہ نہایت ہی پُر شوکت الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے
اور بعض جگہ نہایت سُبک اور سادہ الفاظ کی۔ اسلئے ہر موقع اور محل کے لحاظ سے
الفاظ کا انتخاب کرنا چاہئے۔ مگر زبان کی فصاحت و بلاغت کو کسی حالت میں نظر
انداز نہیں کرنا چاہئے۔ تراکیب بہت خوبصورت، مانوس اور صاف ہونا چاہئیں۔

اسلوبِ نگارش

مضمون لکھتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال
رکھنا چاہیئے کہ جملے بہت مختصر ہوں اُن میں برجستگی اور
بےساختگی ہو۔ ایک بات کا اعادہ نہ کیا جائے۔ الفاظ کی تکرار بھی ذہنی افلاس کی
دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے ہر جملے کے بعد دوسرا جملہ نئے الفاظ اور نرالے ڈھنگ
سے شروع کیا جائے۔ اسلوبِ نگارش ناصحانہ نہ ہو۔ کیونکہ انسانی فطرت پند و نصائح
سے گھبراتی ہے۔ باکمال انشاپرداز دل کا اسلوبِ نگارش بہت شگفتہ ہوتا ہے وہ
پند و نصائح کا خشک دفتر کھولنے کی بجائے اس خوبصورتی سے بات کہہ جاتے ہیں
کہ سُننے والے محظوظ بھی ہوتے ہیں اور نصیحت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے الفاظ
میں نہیں معنی میں نصائح پوشیدہ ہوتی ہیں۔

نظرِ ثانی

مضمون ختم کرنے کے بعد اُس پر نظرِ ثانی کرنا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ قلم کی روانی اور خیالات کی رو میں بعض الفاظ اور ضروری باتیں لکھنے سے رہ جاتی ہیں اور بعض باتیں یا الفاظ دوبارہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ نظرِ ثانی ان تمام نقائص کو دور کر دیتی ہے۔ نظرِ ثانی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ زیرِ تصنیف مضمون کے وہ حصے جو پہلی بار ذہن میں نہیں آسکے تھے دوبارہ دیکھنے سے نظر کے سامنے آجاتے ہیں اس طرح مضمون میں تشنگی باقی نہیں رہتی ہے ::

میر تقی میر اور اُن کی شاعری

ابتدائی حالات

میر صاحب کا نام محمد تقی تھا۔ اُن کے پردادا حجاز سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آئے اور دکن میں مقیم ہو گئے۔ وہاں سے احمد آباد اور پھر اکبر آباد (آگرہ) میں آ کر مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ۱۱۳۷ھ کے لگ بھگ میر تقی میر کی ولادت ہوئی۔ میر صاحب سادات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کے بزرگ شرفائے اکبر آباد میں شمار ہوتے تھے۔ والد کا نام بعض تذکرہ نویسوں کے نزدیک عبداللہ اور بعض کے نزدیک محمد علی تھا۔ مگر اپنے مرشد کے عطا کردہ لقب علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔

تعلیم و تربیت

میر صاحب کے والدِ بزرگوار علی متقی کے ایک مستعقد تھے۔ سید امان اللہ جنہیں علی متقی بہت عزیز رکھتے تھے سید امان اللہ کو بھی علی متقی اور اُن کے بیٹے (میر) سے تعلق خاص تھا۔ اسی تعلق کی بنا پر اُنہوں نے میر کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری خود سنبھال لی تھی۔ میر نے اُنہیں سید امان اللہ سے قرآن شریف اور عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ سید امان اللہ بہت علم دوست بزرگ تھے اور اپنے وقت کا زیادہ حصہ اہلِ کمال کی صحبتوں میں بسر کرتے تھے میر صاحب بھی ان کے ساتھ ان صحبتوں میں شریک ہوتے تھے اور کسبِ فیض کرتے تھے۔

میر صاحب کی عمر دس سال کی تھی کہ سید امان اللہ فوت ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کے علم و کمال سے استفادہ کیا۔ مگر کچھ ہی عرصے کے بعد میر کے والد صاحب بھی فوت ہو گئے۔ یہیں سے اُن کے مصائب کا آغاز ہوا

ترکِ وطن

والد کے انتقال کے بعد میر صاحب بالکل بے سہارا ہو گئے اُن کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے بھی اُن کے ساتھ بہت ہی سرد مہری کا سلوک کیا۔ ناچار تلاشِ معاش میں انہیں اکبر آباد سے نکلنا پڑا۔ اسی سرگرانی کی حالت میں دلّی پہونچے۔ یہاں امیر الامراء نواب صمصام الدولہ تک اُنکی رسائی ہو گئی۔ امیر موصوف میر کے والد کے بہت معتقد تھے جب انہیں معلوم ہُوا کہ یہ نوجوان علی متقی کا بیٹا ہے تو اُنھوں نے میر کی بہت عزت افزائی کی اور اُن کے لئے ایک روپیہ یومیہ مقرر کر دیا۔ مگر میر صاحب کی فارغ البالی کا یہ زمانہ ایک سال سے تجاوز نہ کر سکا۔ امیر الامرا نادر شاہ کے حملہ کے دوران میں کام آئے اور میر بے سہارا ہو کر پھر اکبر آباد چلے گئے۔ مگر اکبر آباد میں اُن کے ساتھ بہت ہی بیگانگی کا سلوک کیا گیا۔ آخر مجبور ہو کر پھر دہلی آ گئے اور اپنے سوتیلے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں مقیم ہو گئے۔

خان آرزو کے یہاں قیام کا زمانہ میر کیلئے بہت سازگار ثابت ہوا۔ اُنہیں فکر معاش کی طرف سے بھی نجات مل گئی اور اُنہوں نے دہلی کے علماء و فضلا سے کسبِ فیض کر کے اپنی تعلیم کی تکمیل کی مگر میر کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے یہاں بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا اور اپنے خالو آرزو کو اُن کے خلاف بھڑکاتے رہے۔ آخر کار ایک روز ایسا ہُوا کہ میر خان آرزو کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ خان موصوف نے کوئی ایسی بات کہی جو میر کو ناگوار گذری۔ وہ اسی وقت کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور خان آرزو کے گھر سے ایسے نکلے کہ پھر آخر تک اُن کی دہلیز پر قدم نہ رکھا۔

اس واقعہ کے بعد میر صاحب کے مصائب اور پریشانیوں کا نیا دور شروع ہُوا۔ مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کی ہنگامہ آرائیوں اور قتل و غارت کی وجہ سے انہیں متعدد بار دلّی سے نکلنا پڑا۔ انہیں دنوں والئے اودھ نواب آصف الدولہ نے

ازراہ قدردانی انہیں لکھنؤ بلا لیا۔ میر صاحب پہلے ہی پریشان بیٹھے تھے۔ دلی کے حالات اور اہل شہر سے بھی کبیدہ خاطر تھے۔ چنانچہ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر وہ لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ نواب موصوف نے اُن کی بڑی قدر و منزلت اور عزت افزائی کی اور اپنے خواص میں شامل کر لیا۔ مگر میر صاحب بہت خوددار اور نازک مزاج تھے۔ انقلاباتِ زمانہ کی نیرنگیاں دیکھ دیکھ کر اُن کا دل دُنیا اور اس کی وجاہت و امارت سے سرد ہو چکا تھا۔ مزاج میں استغنا پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے کسی معمولی بات پر نواب آصف الدولہ سے ناراض ہو گئے اور اس کے دربار سے قطع تعلق کر کے گھر بیٹھ رہے اور عمر کا باقی حصّہ فقر و فاقہ میں بسر کر دیا۔

وفات

زندگی کے آخری تین سال اُن کے لئے سخت پریشان کن اور مہلک ثابت ہوئے۔ پہلے سال اُن کی جوان بیٹی فوت ہو گئی۔ دوسرے سال جوان لڑکا داغِ مفارقت دے گیا اور تیسرے سال رفیقۂ حیات نے بھی رختِ سفر آخرت باندھ لیا۔ ان پے درپے حادثات نے میر کی کمرِ ہمت کو بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا۔ اور ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ کو اُن کی روح بھی قفسِ عنصری سے آزاد ہو گئی۔

عادات و خصائل

میر بہت نازک مزاج، اور بہت خوددار انسان تھے مصائب کا انبار، عزیزوں کی بے اعتنائی اور ابتدائے جوانی میں جنون کے عارضہ نے اُنہیں کسی حد تک بدمزاج بھی بنا دیا تھا۔ وہ فطرتاً بہت کم آمیز تھے۔ مگر اس کے باوجود اپنے مخلص دوستوں سے نہایت خندہ پیشانی اور شفقت و مہربانی سے ملتے تھے۔ بہت نرم دل اور زود رنج بھی تھے۔ احساسات میں شدّت تھی۔ کسی کی آدھی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ اپنے کمال کا شدید احساس تھا۔ وزراء و امراء اور نوابوں سے ذرا کھنچ کر ملتے تھے اور جب دیکھتے تھے کہ میری خودداری پر آنچ آ رہی ہے تو بڑی سے بڑی دولت پر بھی لات مار کر چلے

جاتے تھے۔ بہت ہی مستغنی المزاج تھے۔ صبر و قناعت اُن کی سیرت کا نمایاں جوہر تھا۔ عمر کا بڑا حصّہ اور خصوصاً آخری حصہ نہایت پریشانی اور فاقوں کی حالت میں گذرا مگر کسی کے سامنے دامنِ امداد پھیلانا یا کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔

شاعری

ہماری بساطِ شاعری پر جن شاعروں نے سب سے زیادہ گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، اُن میں میر بہت نمایاں ہے۔ میر کی وفات کو آج تقریباً ڈیڑھ سو سال ہونے کو آئے ہیں۔ ان ڈیڑھ سو سالوں میں ہندوستان کی سیاسی و سماجی تہذیبی و تمدنی اور لسانی تاریخ میں ان گنت انقلابات آئے اور ہماری زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شاعری بھی اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی لیکن کلام میر کی پختگی اور پائیداری ہر دور میں قائم رہی۔ اس کا رنگ ہر عہد میں چمکتا رہا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر شاعر نے میر کی شاعری سے استفادہ کیا۔ یہ بات اس کی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

اس ڈیڑھ سو سال کے طویل دور میں اُردو شاعری خصوصاً غزل میں بیشمار تجربے کئے گئے۔ ہیئت، موضوع، الفاظ، معنی، غرض ہر اعتبار سے مگر یہ تجرباتی دَور میر کی ہیئتِ شاعری، موضوعات، الفاظ اور معنی کو نظر انداز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میر کی عظمت کی یہ دوسری بڑی دلیل ہے۔

آخر وہ کونسی خصوصیات تھیں جنہوں نے میر کو اب تک زندہ رکھا۔ اور اس کی عظمت پر آنچ نہ آنے دی۔ یہ وہ سوال ہے جو کلام میر کا مطالعہ کرنے والے ہر قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو میر کی عظمت اور

بقا کا راز ان چند خصوصیات میں پوشیدہ ہے۔

احساس کی شدت، تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی وسعت، تاثر اور سوز و گداز کی فراوانی، اظہار خیال کی سادگی، جذبے کی صداقت اور ان سب سے بڑھ کر اس پر قدرت۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے یک جا ہو کر میر کی شاعری کو عظمت اور ہمیشہ کی زندگی عطا کر دی۔

بعض لوگوں کے خیال میں میر کی کامیابی میں ایک اور چیز کا بھی دخل ہے۔ اور وہ صنف اور موضوع کا انتخاب ہے۔ یعنی اس نے اظہار خیال کیلئے صنف غزل منتخب کی جو اس کی فطرت سے ہم آہنگ تھی۔ اور اُس نے محبت کے راگ الاپے جو اس کی آپ بیتی کی حیثیت رکھتے تھے۔

اِس میں شک نہیں کہ اظہارِ خیال کے لئے غزل کا انتخاب میر کی "ہوشمندی" اور "حسنِ انتخاب" دونوں کا مکمل ثبوت ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اگر وہ غزل کی بجائے قصائد یا دیگر اصنافِ سخن کو منتخب کرتا تو آج ہم اُسے خراجِ عظمت پیش کرنے سے قاصر ہوتے۔ اس کے قصائد اور دوسری نظمیں ہمارے سامنے موجود ہیں جنہیں دیکھ کر اِس خیال کو مزید تقویت پہونچتی ہے کہ وہ غزل اور صرف غزل کے لئے پیدا ہوا تھا۔ مگر جب ہم اس بات کے دوسرے پہلو کی طرف دیکھتے ہیں کہ میر کے علاوہ تقریباً ہر شاعر نے وہی صنفِ سخن اختیار کی جو میر نے اپنے اِظہارِ فکر کے لئے منتخب کی تھی۔ اُردو زبان کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے غزل کے کوچے میں قدم نہ رکھا ہو۔ بلکہ ننانوے فی صدی شعراء نے غزل ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا مگر اسکے باوجود ان میں سے بہت کم لوگوں کو میر کی سی کامیابی حاصل ہوسکی تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موضوع اور صنف کے ساتھ ساتھ میر کی خداداد صلاحیت اور وہ خصوصیات جو اوپر بیان کی گئی ہیں اس کی کامیابی

کی ضامن تھیں۔ ان تمام خصوصیات کے امتزاج سے اُس نے ایک نئی کیفیت کو جنم دیا جسے اس کی درد مندی یا نشتریت کہنا چاہئے یہی نشتریت اور اس کی دھیمی دھیمی غم انگیز نے ہے جس کی تانیں آج بھی گونج رہی ہیں۔ یہی وہ میٹھا میٹھا درد ہے جو دلوں میں جگہ پا لیتا ہے میر اپنی شاعری کے اس پہلو کی بدولت ممتاز شعرا کی صفِ اوّل میں سب سے آگے بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے ان شعروں میں سے جو اس خصوصیت کے حامل ہیں چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:۔

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے　　کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

~~~~

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر　　جو ہماری خاک پر سے ہو کے گذرا رو گیا

~~~~

مت کر عجب جو میر ترے غم میں مر گیا　　جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

~~~~

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے　　دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

~~~~

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جئے　　عمر نے ہم سے بے وفائی کی

لیکن ان خصوصیات کے علاوہ اس کی ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی اور جس سے بلاشبہ میر کی عظمت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ میر کو اب تک امام یاسیات کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ بہت کم لوگوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ وہ پیغمبر نشاط بھی تھا اس کے یہاں بعض آفاقی صداقتیں بھی ہیں جو دنیا کے ہر ملک اور ہر نسل کیلئے بلا امتیاز مذہب و ملت قابل قبول ہیں جب ہم کلیاتِ میر کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں غم انگیز اشعار کے ساتھ ساتھ نشاط انگیز

اشعار بھی ملتے ہیں۔ جو اس کی فطرت کے اس پہلو کی نقاب کشائی کرتے ہیں جسے آلام زمانہ کی کثرت نے غم کے دبیز پردوں میں ڈھانپ دیا تھا مگر جو غم کے بادل چھٹتے ہی اپنی بہار اور رعنائی جمال دکھلانے لگتا تھا۔

یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے کہ ایک ایسا انسان جو شعور کی منزل میں قدم رکھنے سے لے کر لحد میں اترنے کے وقت تک لا تعداد مصائب کا شکار رہا جس کے دور میں ایک دو بار نہیں بیسیوں مرتبہ کشت و خون کے سیلاب آئے۔ شہر تاراج کر دیے گئے۔ بستیاں ویران کر دی گئیں اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے بے شمار انسانوں کو خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھا۔ خود اُسے ایک شہر سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے، اس طرح جانے کتنے شہروں اور جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی، جس کی ساری عمر فقر و فاقہ میں بسر ہوئی جو غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں کا بھی نشانہ بنا رہا اور اس کی کسک کو اپنے دل میں دبائے نامرادی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ایسے شگفتہ شعر کیسے کہتا تھا۔

بہار آئی ہے غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
نہال سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے

چلتے ہو تو چمن کو چلئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

ایسا انسان جو شدت احساس اور نازک مزاجی کے ہاتھوں خوشی میں بھی اُن کا پہلو تلاش کر لیتا ہو۔ ایک صدمہ جسکے لئے عمر بھر کی کوفت بن جاتا ہو وہ موسم کی رنگینیوں اور کیفیات سے کیسے لطف اُٹھا سکتا ہے۔ انسانی ذہن یہ معمہ حل کرنے سے قاصر ہے یہاں پہونچکر میر کی خداداد صلاحیت اس کی قادر الکلامی اور اس کے مشاہدے کی گہرائی پر ایمان لاتے ہی بنتی ہے یہ تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کوئی شاعر اپنی "ہمہ دانی" کا مظاہرہ

کرنے کے لئے ایسے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کرے جو اس کی فطرت اور حالات سے بالکل مختلف ہؤا۔ لیکن پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اِن خلاف فطرت اور خلافِ حالات موضوعات پر قلم اُٹھاتے وقت تصنع اور آورد کا پیدا ہو جانا بھی ایک لازمی امر ہے۔ مگر میر کے یہاں ایسے اشعار میں حیرت انگیز آمد روانی اور ولولہ ہے۔ میر کی شاعری کا وہ حصّہ جسے نشاطیہ کہنا چاہیئے، صرف موسمیات اور اُن کی کیفیات بیان کرنے تک محدود نہیں تھا بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر وارداتِ عشق اور ذکرِ مے و مینا کا بھی احاطہ کئے ہوئے تھا۔ مثلاً ؎

کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ~~~ اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ عاشق ہے تو کہیں ~~~ القصہ خوش گذرتی ہے اس بدگمان سے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے ~~~ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں ~~~ ساری مستی شراب کی سی ہے
کہاں یہ قامتِ دلکش کہاں پاکیزگی ایسی ~~~ ملے ہیں ہم بہت گلزار کے نازک نہالوں سے

یہ چند شعر ہیں جو میر کی نشاطیہ شاعری میں سے بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں جنہیں دیکھ کر ایک ایسا قاری جس نے میر کی خزینہ شاعری کا مطالعہ نہ کیا ہو میر کو ایک باغ و بہار طبیعت کا انسان تصوّر کرے گا۔ ان اشعار میں میر نے ایک ایسے پہلو کو لیا ہے جسے اُس کی فطرت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ مگر جسے ادا کرنے میں وہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ہؤا ہے۔ کیا اس کی شاعری کا یہ پہلو اُس کی عظمت میں اضافہ کرنے کا موجب نہیں ہے؟ اب تین شعر کا ایک قطعہ بھی ملاحظہ کرتے چلئے اور دیکھئے کہ یہاں پہونچکر وہ اپنے مزاج کی شوخی کو کتنے فنکارانہ طریقے سے پیش کرتا ہے۔

جاگے تھے ہمارے بختِ خفتہ ~~~ پہونچا تھا ہم وہ اپنے گھر رات
تھی صبح جو منہ کو کھول دیتا ~~~ ہر چند کہ تب تھی اک پہر رات

...ھوں میں مُنہ چھپا کے بولا　　اب ہوئے گی میرؔ کس قدر رات

میرؔ نے جہاں جہاں شراب کا ذکر کیا ہے وہاں وہاں وہ اپنے قاری کو ایک ایسا رندِ خرابات نظر آتا ہے جس کی ساری زندگی دادِ عیش دیتے ہوئے گذری ہے اور جس نے شراب کو پانی کر دیا ہے۔ وہ مئے و مینا اور اُس کی جزئیات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ تقلید اور تصنع کا گمان تک نہیں ہوتا۔ مثلاً:۔

پھوٹا کئے پیالے، لنڈھتا پھرا قرابا　　مستی میں میری تھا واں اک عشوہ اور شرابا

کیا جانوں بزمِ عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ　　میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

ساقی تو ایک بار تو توبہ مری تڑا　　توبہ کروں جو پھر تو ہے توبہ ہزار بار

ساقی گھر چاروں اور آیا ہے　　دے بھی مئے ابر روز آیا ہے

مئے گلگوں کی بو سے بسکہ میخانہ مہکتا تھا　　لب ساغر پہ مُنہ رکھ رکھ کے ہر شیشہ بہکتا تھا

میرؔ کے کلیات میں خزینۂ اشعار کے بعد سب سے زیادہ تعداد ان اشعار کی ہے جو شراب اور اس کے لوازمات سے متعلق ہیں۔ اس کا اندازہ اوپر کے چند اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہر شاعر کا ایک میدان ہوتا ہے۔ اسی میں وہ اپنے رہوارِ خیال کو دوڑاتا ہے۔ لیکن جہاں وہ اس سے باہر نکلا اور حقیقت کھل گئی لیکن اِس زاویہ سے دیکھنے اور سوچنے کے بعد میرؔ کے کمالِ فن کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُس نے اپنی منتخب کردہ صنف صنفِ غزل میں سے جس موضوع کو لیا اُسے تمام و کمال انتہا کو پہونچا دیا۔ جب اُسنے خزینۂ جذبات کی عکاسی کی تو اس مقام پر پہونچ گیا ؎

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں ایک داغ　　اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

جب عیش و نشاط کے بیان کی طرف متوجہ ہوا تو اس قدر سرمست ہو گیا ؎

ساقی گھر چاروں اور آیا ہے　　دے بھی مئے ابر روز آیا ہے

جب عشق کی وادی میں قدم رکھا تو محبوب کے ساتھ یوں چھیڑ چھاڑ کی ؎

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

وہ نہ صرف اپنے دور کا بلکہ موجودہ دور کے شاعروں میں بھی بہت بڑا باکمال اور عظیم فنکار تھا۔ جو اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اُردو زبان زندہ ہے اور اُسے اُس وقت تک خراجِ عظمت پیش کیا جاتا رہے گا۔ جب تک لوگوں میں اچھے اور بُرے یا اصل و نقل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت باقی ہے ؛

~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~

مرزا غالبؔ اور اُن کی شاعری

حالاتِ زندگی

ابتدائی حالات اسداللہ خاں نام، غالبؔ تخلص ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو آگرہ میں پیدا ہوئے، مرزا کے دادا ایران سے لکھنؤ آئے اور نواب آصف الدولہ کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے حیدرآباد دکن اور پھر ریاست الور کی سرکار میں ملازمت کی اور مہاراجہ الور کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے مارے گئے۔ اُن کے انتقال کے بعد مہاراجہ نے مرزا غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خاں اور چچا نصراللہ بیگ خاں کو دو گاؤں عطا کئے اور کچھ روزینہ بھی مقرر کر دیا۔ عبداللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد مرزا غالبؔ کے چچا نے مرزا کی پرورش کی۔

جب ہندوستان پر حکومتِ برطانیہ کا تسلط قائم ہو گیا تو مرزا کے چچا نصراللہ بیگ خاں انگریزی فوج میں ملازم ہو گئے۔ حکومتِ برطانیہ کی طرف سے انہیں آگرہ کے قریب دو پرگنے سونک اور سونسا عطا ہوئے۔ نصراللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد اُنکے پسماندگاں کیلئے پنشن مقرر کر دی گئی جس میں سے سات سو روپے سالانہ مرزا غالبؔ کے حصّہ میں آئے جو اُنہیں اپریل ۱۸۵۷ء تک ملتے رہے۔ مگر چونکہ مرزا بہادر شاہِ ظفر کے اُستاد تھے۔ اس تعلق کی بنا پر ایّامِ بغاوت میں جہاں اور بہت سے متعلقینِ دربار معتوب قرار پائے وہاں مرزا غالبؔ کی پنشن بھی بند ہو گئی مگر تین سال کے بعد پھر جاری کر دی گئی۔

شادی سے پہلے مرزا غالبؔ کی سکونت مستقل طور پر آگرے میں رہی گو اس

درمیان میں وہ دہلی آتے جاتے رہے، جب تیرہ سال کی عمر میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے اُن کی شادی ہوگئی تو اس کے بعد وہ مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہوگئے۔ اس طرح دہلی اُن کا وطن ثانی قرار پایا اور اُنہوں نے اپنی عمر کے پچاس سال اس سرزمین پر بسر کئے۔

تعلیم

مرزا کی تعلیم و تربیت اُس زمانہ کے دستور کے مطابق کسی درسگاہ یا دارالعلوم میں باقاعدگی سے نہیں ہوئی تاہم آگرے کے مشہور اور فاضل معلم شیخ معظم سے اُنہیں نسبت تلمذ رہی۔ اُس کے بعد ایران کے ایک نومسلم عبدالصمد کا آگرے میں گذر ہوا۔ وہ فارسی زبان کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ عربی کا بھی بہت بڑا فاضل تھا۔ مرزا نے اُسے اپنے یہاں ٹھہرا لیا اور تقریباً دو سال تک اُس[1] سے کسب فیض کرتے رہے۔ اُس کی توجہ اور محنت نے مرزا میں فارسی زبان کی ایسی قابلیت اور استعداد پیدا کر دیا کہ وہ اس زبان کے بہت بڑے فاضل اور صاحبِ کمال کہلائے۔

عادات و خصائل

مرزا غالب بہت خوش اخلاق اور متواضع انسان تھے۔ ہر شخص سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کا دائرہ احباب بہت وسیع تھا۔ بادشاہوں اور امراء سے لے کر معمولی لوگ تک اُن کے مداح تھے۔ اپنے دوستوں کے غم میں مغموم اور اُن کی خوشی میں مسرور ہوتے تھے جس شخص سے اُنہیں ایک بار بھی تعلق ہو جاتا، عمر بھر اُس کا خیال رکھتے تھے اُن کے خطوط اس کا واضح ثبوت ہیں۔ خطوط کا جواب دینے کے معاملے میں بہت فیاض تھے۔ جو اُنہیں ایک بار خط بھیجتا تھا یہ اُسے کئی کئی بار خط لکھتے۔ اپنے خطوں کے جواب نہ پاکر کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے اور اس کا شکوہ کرتے تھے۔ روزانہ متعدد خطوط موصول ہوتے تھے اور مرزا نہایت پابندی سے سب کے جواب دیتے تھے۔

---

[1] مرزا نے اپنے خطوط میں کہیں تو اسے اپنا اُستاد تسلیم کیا ہے اور کہیں انکار کیا ہے۔ اسلئے یہ امر مشتبہ ہوگیا ہے کہ واقعی عبدالصمد سے اُنہوں نے کسب فیض کیا ہے؟

بہت ہی بامروت اور خلیق تھے. باوجودیکہ ضعیفی نے تاب و تواں سلب کرلی تھی مگر دوستوں اور شاگردوں کی دلجوئی کے خیال سے اُن کے کلام کی اصلاح کرتے اور اُن کے خطوں کے جوابات دینے سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے. بیماری کے دوران میں جب لکھنے سے معذور ہو جاتے تھے تو دوسروں سے لکھوا دیتے تھے.

بہت ہی فراخ حوصلہ اور کشادہ دست آدمی تھے. باوجودیکہ مقروض رہتے تھے. آمدنی کا بڑا حصہ شراب نوشی کی نذر ہو جاتا تھا. مگر پھر بھی غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد سے کبھی دریغ نہیں کرتے تھے. اپاہجوں اور ناداروں کا اُن کے دروازے پر جمگھٹا رہتا تھا اور حتی الامکان اُنہیں خالی ہاتھ واپس نہیں کرتے تھے. دلّی کے شرفاء اور غالب کے احباب جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مفلوک الحال ہو گئے تھے. غالب کی کشادہ دستی سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے.

مزاج میں بلا کی شوخی تھی. خواہ کتنے ہی مقروض اور مصیبت زدہ ہوں. کوئی عزیز ترین دوست فوت ہو گیا یا قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا ہو. اُن کی شوخی ہر حال میں قائم رہتی تھی. غمی کے موقعوں پر بھی جب انسان سراپا غم ہوتا ہے. وہ شوخی کا پہلو نکال لیتے تھے. اُن کے خطوط اس کا زندہ ثبوت ہیں. اسکے علاوہ اُن سے منسوب بیسیوں لطائف بھی اُن کی شوخیٔ طبع اور زندہ دلی کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں.

ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ مزاج میں استغناء اور خودداری بھی تھی. اپنے منصب اور مرتبہ کا ہر موقع پر خیال رکھتے تھے. وہ بادشاہوں سے بھی ملتے تھے، امراء و رؤساء سے بھی اور انگریز حکام سے بھی مگر ہمیشہ ہم مرتبہ کی حیثیت سے. چنانچہ جب گورنمنٹ ہند کے سکرٹری مسٹر ٹامسن نے بھی انہیں دہلی کالج میں فارسی کا اُستاد مقرر کرنے کے لئے انٹرویو لینے کی غرض سے بلایا تو مرزا غالب اپنی پالکی میں سوار ہو کر اُن کے بنگلے پر گئے اور اُنہیں اپنی آمد کی اطلاع دے کر اس انتظار میں ٹھہر گئے کہ وہ اُن کے

استقبال کیلئے باہر آئیں گے۔ جب مسٹر ٹامسن کو اس کا علم ہوا تو وہ باہر آئے اور مرزا غالب سے کہا کہ مرزا صاحب جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کے اعزاز و مرتبہ کا پورا لحاظ رکھا جائے گا اور شایانِ شان استقبال کیا جائے گا مگر اس وقت آپ ملازمت کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں اس لئے آپ کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر مرزا نے جواب دیا کہ میں تو گورنمنٹ برطانیہ کی ملازمت اس لئے کر رہا ہوں کہ اس سے میرے مرتبہ اور اعزاز میں اضافہ ہو۔ اگر اسکے نتیجے میں میرے پہلے اعزاز میں بھی کمی ہو جائے گی تو میں ایسی ملازمت سے باز آیا۔ یہ کہہ کر واپس آگئے۔

مرزا غالب کو لوگ عموماً ایک رند خراباتی سمجھتے ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ شریعت کے ظاہری احکام کے پابند نہیں تھے مگر اس کے باوجود اسلام کے عقائد اور تعلیم پہ پورا ایمان رکھتے تھے۔ تمام عمر اپنے گناہوں پر اظہار افسوس کرتے رہتے اور اللہ تعالےٰ سے اپنی بخشش کی دعائیں مانگتے رہے۔

وفات مرزا غالب یوں تو ضعفِ پیری کی وجہ سے آخر عمر میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور عموماً پلنگ پر ہی لیٹے رہتے تھے مگر انتقال سے چند روز بیشتر حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ غشی کے دورے پڑنے لگے اور اسی حالت میں ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو فوت ہو گئے۔

شاعری

مرزا غالب کی شاعری کے دو دور ہیں ایک وہ جب اُس پر فارسی کا غلبہ تھا اور دوسرا وہ جب اُس غلبہ سے وہ آزاد ہو گئی تھی۔

مرزا کو فارسی زبان سے قدرتی لگاؤ تھا۔ فارسی کے بکثرت مطالعہ اور عبد الصمد[1] کی ہم جلیسی کی وجہ سے اُن کی زبان اور دل و دماغ پر فارسی الفاظ اور تراکیب نے

[1] اگر واقعی تعلق رہا ہے۔

غلبہ پا لیا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ فطری طور پر مشکل پسند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ابتدائی دور کی غزلوں میں بے انتہا مشکل الفاظ، فارسی تراکیب، بلکہ مصرعہ کے مصرعہ فارسی کے ہیں۔ فارسی کا یہ اثر کسی نہ کسی رنگ میں آخر دور تک قائم رہا۔ بطور نمونہ چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخششِ خوباں
خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا

اس مشکل پسندی اور اُن کی شاعری پر فارسی کے غلبے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُنہوں نے مرزا عبد القادر بیدلؔ کے کلام کا بکثرت مطالعہ کیا تھا۔ بلکہ ابتدائے عمر ہی سے بیدلؔ کا کلام اُن کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ اُن کے تتبع کا یہ اثر تھا جو اُن کی اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں مندرجہ بالا صورت میں نمودار ہوا۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ اُنکی انفرادیت بھی اس مشکل پسندی میں برابر کی شریک ہے۔ مرزا غالبؔ کی عادات و اطوار بلکہ اُن کی زندگی کا ہر پہلو عام رنگ سے مختلف تھا۔ عام شاعروں کا قاعدہ ہے کہ وہ عام الفاظ، عام تراکیب اور عام زمینوں میں غزل لکھتے ہیں مگر وہ شعراء جن کے مزاج میں انفرادیت ہوتی ہے اس عمومیت اور عام راستے سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں اور اپنے لئے کوئی نیا راستہ تلاش کرتے ہیں، بالکل یہی حال مرزا غالبؔ کا تھا۔ اُن کو قدرت نے بلند دماغ اور مخصوص مزاج دیا تھا جس کا تقاضا تھا کہ وہ عام راستہ سے بچ کر چلتے یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے شاعری میں استعمال ہونے والی عام تراکیب سے اجتناب برتا بلکہ زمینیں بھی نئی اختراع کیں، مشکل الفاظ، نئے استعارون اور جدید تشبیہوں کو رواج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے مخاطب جو عام فہم شعر سننے

کے عادی تھے اُن کی جدت پسندی بلکہ مشکل پسندی کو نہ سمجھ سکے اور بعض لوگوں نے انہیں اعتراضات کا ہدف بھی بنایا۔ چنانچہ اُن کے ایک معاصر حکیم آغا جان عیش کے مشہور قطعہ میں غالب کی اسی مشکل پسندی پر اعتراض کیا گیا ہے۔ قطعہ درج ذیل ہے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

آخر لوگوں کے مزاج، معاصرین کے اعتراض اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے مشوروں سے مجبور ہو کر اُنہوں نے یہ رنگ ترک کر دیا اور آسان گوئی کی طرف آ گئے۔

خصوصیاتِ کلام

مرزا غالب کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کے معترضین بھی اس امر کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ غالب اُردو زبان کا عظیم شاعر تھا جس نے عام راستہ اور عام رجحان سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا جادہ بنایا۔ اردو شاعری کو نئے نئے اسلوب دیئے خیالات کو رفعت بخشی اور اچھوتے مضامین داخل کر کے اُردو شاعری کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔

غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے انفرادیت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہر موقع پر اور ہر مضمون میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ عام رنگ سے ہٹ کر ایک خاص رنگ ضرور پیدا ہو جائے اُس کی یہ خصوصیت صرف ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔

ہماری شاعری میں اور خصوصاً غالب کے دور اور اُس سے پہلے کی شاعری میں بھی عشاق کے لئے سب سے بڑا ستم محبوب کی بے التفاتی اور تغافل سمجھا جاتا تھا اور اگر محبوب مہربان ہو جاتا تھا تو عاشق دُنیا کے بڑے سے بڑے ستم اور کڑی سے کڑی مصیبت کو بھی بھول جاتا تھا۔ عاشقی یا شاعری کی دُنیا میں اس خیال کو خواہ کتنی

ہی اہمیت کیوں نہ ہو مگر واقعاتی دنیا میں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محبوب کا تغافل انسانی زندگی کا بہت بڑا حادثہ اور اُس کا التفات بہت بڑی خوش بختی ہے مگر بقول فیض احمد فیض ؔ:۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

صرف محبوب اور اُس کی وفا کا نام ہی زندگی نہیں ہے۔ زندگی کے کچھ اور بھی مسائل ہیں جن سے انسان کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ غالب صرف فراق زدہ شاعر یا پامال راستہ کا راہی نہیں تھا۔ اُس کی نظر بہت وسیع تھی اُسکے خیالات میں رفعت تھی۔ اُسکے مزاج میں جدّت تھی۔ اُس کی شاعری میں حقیقت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے اس حقیقت کو آج سے بہت عرصہ پہلے پا لیا تھا جس کا فیض نے اپنے مندرجہ بالا مصرعہ میں اظہار کیا ہے۔ غالب نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیتے ہوئے اس خیال کو مندرجہ ذیل اسلوب سے بیان کیا۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں   تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غالب کے کچھ اور شعر جن میں اُس کی انفرادیت پوری طرح جھلک رہی ہے یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بےخبر سوتا   رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا   یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے   مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

کلام غالب کی دوسری خصوصیت خیال آفرینی ہے۔ غالب نے صرف الفاظ کے اُلٹ پھیر یا الفاظ کی بازیگری ہی کو منتہائے مقصود نہیں بنایا اور نہ اُس نے پامال خیالات کو نظم کر کے اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ دیوانِ غالب اس کا شاہد ہے ہمیں اُسکے یہاں قدم قدم پر ایسے اشعار ملتے ہیں جو اُس کے جدتِ خیال

اور خیال آفرینی پر دلالت کرتے ہیں جن میں سے بیشتر صرف اس کی اختراع ہیں یا کم از کم اُردو زبان ان خیالات سے پہلے پہلے روشناس ہوئی، اُسنے ہر جگہ جدت خیال کا سہارا لیا۔ اُس کی خیال میں بہت وسعت اور ندرت تھی چند شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے　　سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی　　میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

کلام غالب کی تیسری خصوصیت معانی آفرینی ہے۔ اُردو نظم کی تاریخ گواہ ہے کہ غالب سے پہلے اور غالب کے بعد اب تک کوئی شاعر اس اعتبار سے اُس کا ہم پلہ نہ پیدا ہو سکا۔ اُس کے دیوان کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس کے مندرجہ ذیل دعوے کی تصدیق کرنی ہی پڑتی ہے ؎

گنجینۂ معنیٰ کا طلسم اُس کو سمجھئے　　جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

دیوانِ غالب کی بیسیوں شرحیں جہاں اُسکی مشکل پسندی پر دلالت کرتی ہیں وہاں اس بات کی بھی شہادت دیتی ہیں کہ اُسکے ہر شعر میں معنی کے بے پناہ دریا بند ہیں اور ہر شارح اپنے غور و فکر کے مطابق اُسکے اشعار کے نئے نئے مطالب بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیئے ؎

رنگِ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے　　یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

مشہور شارح سعید صاحب کے خیال میں غالب کے اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عاشق کا رنگ شگفتہ دیدنی ہے اور چونکہ اے معشوق یہ تیری وجہ سے ہے اسلئے تجھے اپنے اس کارنامہ پر ناز کرنا چاہیئے۔ یہی شارح اس شعر سے ایک مفہوم اور پیدا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اے محبوب تیرا یہ رنگ شکستہ قابلِ دید ہے اور

تجھے اپنے انداز محبوبی کو بروئے کار لانا چاہیئے۔

حضرت بیخود کے خیال میں اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میرا اُڑا ہوا رنگ میرے دوست کی صبح بہار نظارہ ہے اور یہی وہ وقت ہے جب اُسکے گلہائے ناز کھلا کرتے ہیں۔ یہی بیخود صاحب اس شعر کا دوسرا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اے محبوب صبح کے وقت میرے مُنہ پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی دیکھ کر تو بھی اپنے ناز و انداز کے پھُول کھلانے میں مصروفِ ناز و انداز ہو جا۔

مولانا عبدالباری آسی کے خیال کے مطابق اس شعر سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ نظارۂ معشوق نے میرا رنگ اُڑا دیا ہے اور وہ رنگِ پریدہ مثلِ بہار اور پھولوں کا کھِلنا لازم و ملزوم ہیں اور وہ پھول نازِ معشوق کے پھول ہیں۔ یعنی معشوق جب اپنے نظارے سے میرا رنگ اُڑتا ہوا دیکھے گا تو اُسکو اپنے حسن و ادا پر ناز ہوگا اسکے علاوہ بعض اور شارحین نے اس شعر سے نئے نئے مطالب و مفہوم نکالے ہیں۔ یہ ایک شعر تھا جو بطور مثال یہاں درج کیا گیا۔ ورنہ اگر دیوانِ غالب کا ایک سرسری جائزہ لے کر بھی اشعار کے مطالب بیان کئے جائیں تو کئی ضخیم دفتر درکار ہونگے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس کا کلام اپنے اندر معنیٰ کی کتنی وسعت رکھتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر دیوانِ غالب سے چند ایسے اشعار پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے جن میں معنیٰ کے اعتبار سے غیر معمولی وسعت ہے ؎

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا — قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تری مژگاں کا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کلامِ غالب کی چوتھی خصوصیت شوخیٔ بیان ہے۔ غالب اپنے مزاج کے اعتبار سے بہت شوخ، زندہ دل اور بذلہ سنج انسان تھا۔ ہر حال میں خوش رہتا

تھا۔ خود بھی ہنستا تھا اور دوسروں کو بھی ہنساتا تھا۔ اُسکی فطرت اور مزاج کا رنگ اُسکی شاعری میں بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ وہی بات جسے دوسرے نہایت سنجیدگی سے ادا کرتے ہیں۔ غالبؔ مزاح کے پردے میں کہہ جاتا تھا جس سے ایک لطیف طنز کا پہلو بھی نکل آتا تھا۔ ایک شعر دیکھئے ؎

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد! مئے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

یہی بات سیدھے سادھے انداز میں یوں کہی جاسکتی تھی کہ اے زاہد تو شراب پینے سے انکار نہ کر یہ شہد نہیں کہ جس میں کوئی سرور ہی نہیں ہوتا ہے یہ شراب ہے، اسے پی کر تو کیف و سرور میں مست ہو جائے گا۔ اس طرح یقیناً معنویت کا ایک پہلو پیدا ہو جاتا مگر غالبؔ کے ذہنِ رسا اور شوخیٔ مزاج نے شہد کو مگس کی قے کہہ کر اُس کی تمام خوبی اور لذت کو خاک میں ملا دیا تاکہ زاہد کا دل اُس کی طرف سے بُرا ہو جائے در پردہ اُس نے شہد کا اور اُس کے ساتھ زاہد کے ذوق کا مذاق اُڑاتے ہوئے اُسے جھنجھلا اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ طنز و مزاح کا ایسا لطیف امتزاج اور کہاں مل سکتا ہے۔ اسی خصوصیت کے چند شعر اور دیکھئے۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں
کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

کلامِ غالبؔ کی یہ چند خصوصیات تھیں جو مندرجہ بالا سطور میں بیان کی گئی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا کلام گلہائے رنگ رنگ کا ایسا مجموعہ ہے جس کی رنگینی جس کی خوشبو اور جس کی بہار ہمیشہ قائم رہے گی۔ اُردو زبان کے ہر دور کا نقاد اُسے خراجِ تحسین پیش کرتا رہے گا۔ اور پھر بھی حق ادا نہ ہو گا۔

غالبؔ کی خطوط نویسی

وہ دور جو ۱۸۵۷ء پر ختم ہوتا ہے بغاوت سے بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے سپاہیوں نے بغاوت کی، اُن کے ہندوستانی افسروں نے بغاوت کی، نوابوں نے بغاوت کی، راجاؤں نے بغاوت کی۔ امیروں نے بغاوت کی، غریبوں نے بغاوت کی، شہریوں نے بغاوت کی، دیہاتیوں نے بغاوت کی اور یہاں تک کہ مرزا غالبؔ نے بھی بغاوت کردی۔ بظاہر یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ مرزا غالبؔ جیسے رندِ خرابات اور صلح کل شاعر کا بغاوت سے کیا تعلق؟ مگر حقیقت یہی ہے کہ غالبؔ اُس دور کا سب سے بڑا باغی تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہندوستانی عوام اور امراء ایک بیرونی طاقت کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے جو اُن کی مرضی کے خلاف اُن پر مسلط ہو گئی تھی اور غالبؔ نے شعر و ادب کے اُس سرمایہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ جو اُسکے مزاج شعر و ادب سے بالکل مختلف تھا اور اسوقت کے ماحول پر بڑی طرح مسلّط تھا۔ جس طرح بغاوت کا واقعہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا جو اچانک ظاہر ہو گیا تھا بلکہ یہ نفرت و حقارت کا ایک ایسا شدید جذبہ تھا جو غیر ملکی حاکموں کے خلاف سالہا سال سے ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا تھا۔ مرزا غالبؔ کی پیدائش بھی اسی دور میں ہوئی۔ جب اُس نے شعور کی منزل میں قدم رکھا تو ہندوستان کے ایک طبقہ کے دل و دماغ میں بغاوت کا جذبہ اُبھر چکا تھا جُوں جُوں غالبؔ کی عمر گذرتی گئی عوام کا احساسِ غلامی آتشِ بغاوت سے پھنکتا گیا۔ عوام نے غیر ملکی حاکموں کی آمد اور اُن کی ہوس ملک گیری پر غم و غصے اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انگریزی سامراج کے مظالم اور اپنی ذلت و محکومی کے احساس نے انہیں

بغاوت پر اکسایا اور آخر کار ایک دن ایسا بھی آگیا جب یہ غلام اپنے ظالم آقاؤں کے خلاف ہتھیار لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بالکل اسی طرح میرزا غالب بھی ایک طویل عرصے تک اُردو شعر و ادب کے اُس ضخیم دفتر کا مطالعہ کرتے رہے جس کے ایک بڑے حصّے نے انہیں بغاوت پر اکسایا۔ اُن کے زیرِ مطالعہ اُن سے پہلے کا ادب بھی تھا اور اُن کے معاصرین کے ادبی کارنامے بھی۔ اُردو شاعری کے مفروضات، اُس کا روایتی تصور، اُسکے بے جان قالب اُسکے پامال عناصر اور زندگی کے حقائق سے روگردانی۔ غرض ادب کے اُن پُرانے نظریات اور مہلک تصورات سے تنگ آکر غالب نے ان سب چیزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور اُردو غزل کو پامال روش سے ہٹا کر اور غیر صحت مند رجحانات میں سے بیشتر کو تبدیل کر کے اُسے ایسے رستہ پر ڈال دیا جس پر چل کر غزل کو نئے نئے موضوع ملے۔ اُس نے بات کرنے کے اچھوتے انداز سیکھے اور بحیثیت مجموعی غزل ایک زندہ اور جوان صنفِ ادب نظر آنے لگی۔

جس طرح غالب نے اُردو غزل کے مہلک اور پامال رجحانات کو تبدیل کیا۔ بالکل اسی طرح اُس نے اُردو نثر کے بھی اُن پُرانے طور طریقوں کے خلاف بغاوت کی جو حشو دزوائد اور غیر ضروری تکلفات سے پُر تھے۔ غالب کے خطوط اس بغاوت کے مکمل نمونے اور اُس کے منفرد رجحانات کے صحیح نمائندے ہیں۔ غالب سے پہلے اور خود غالب کے زمانے میں خط لکھنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ:-

> "بخدمت شریف، عالی جناب، آفتاب خطاب، آسمان جاہ دین پناہ، مخدوم و معظم جناب سید صاحب دام ظلکم۔ بعد ادائے آداب کے گذارش احوال یہ ہے کہ خط آپکا آیا۔ حالات مندرجہ سے آگاہی ہوئی یہاں پر سب طرح کی خیریت ہے۔ اور خیریت آپکی بارگاہِ خداوندی سے نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ....."

غالبؔ برس ہا برس تک لوگوں کو اس قسم کے غیر ضروری اور طویل القاب و آداب اور لایعنی تمہیدوں سے پُر خطوط لکھتے دیکھتا رہا۔ اُس کا باغیانہ جذبہ بھڑک اُٹھا۔ اُس نے اس فضول طرزِ تحریر کے خلاف بغاوت کردی اور فنِ خطوط نویسی کو ایسی صاف اور سیدھی ڈگر پر ڈال دیا۔

"کیوں صاحب روٹھے ہی رہوگے یا کبھی منوگے بھی۔ اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو......" یا

"جویائے حالِ دہلی والو! اسلام لو مسجد جامع در گذشت ہوگئی۔ چیلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دُکانیں بنالیں، انڈا، مُرغی، کبوتر بکنے لگا......"

خط کو مختصر اور ضروری القاب سے شروع کرنا اور بعض اوقات القاب کی قید اُٹھا کر حرفِ مطلب سے ابتدا کرنا۔ غالبؔ کی طرزِ خطوط نویسی کا سب سے بڑا اور ممتاز وصف اور اُردو نثر کی پامال قدروں کے خلاف سب سے بڑی اور سب سے پہلی بغاوت ہے۔ بےتکلفی، بےساختگی، الفاظ کا اختصار، مزاح اور شوخی کی چاشنی، اسلوبِ نگارش کی ندرت اور خط کو اس انداز سے لکھنا جیسے دو آدمی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ مکتوباتِ غالبؔ کی وہ خوبیاں ہیں جو غالبؔ سے پہلے فنِ خطوط نویسی میں عنقا تھیں جنہیں سب سے پہلے غالبؔ نے رواج دیا۔[1]

یوں تو فلسفہ و حکمت کے اسرار و رموز سے لے کر فنِ شاعری کی دقیقہ سنجیوں تک ایسا کوئی موضوع نہیں ہے جو غالبؔ کے خطوط میں نہ ہو۔ اس اعتبار سے مکتوباتِ غالبؔ علم و عرفان اور کائنات کی مختلف رنگا رنگیوں کا ایک ایسا مرقع ہیں جسے بجائے خود ایک کائنات کہنا مبالغہ سے خالی ہے۔ مگر مکاتیبِ غالبؔ جس چیز پر سب سے زیادہ وضاحت

---

[1] اس میں شک نہیں کہ غالبؔ سے پہلے ہی خطوط نویسی کا انداز بدل گیا تھا چنانچہ "انشائے سرور" اسکی واضح مثال ہے مگر یہ ضرور ہے کہ غالبؔ نے اسے اور آگے بڑھایا۔ غالبؔ کی سی شوخی، برجستگی اور بےساختگی اس سے پہلے مفقود تھی۔

سے روشنی ڈالتے ہیں وہ غالب کی سیرت اور اس کی زندگی کے وہ مختلف پہلو ہیں جنہیں
اگر ترتیب دیا جائے تو غالب کی جامع مستند اور خود نوشت سوانح حیات مرتب
ہو سکتی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں مکاتیب غالب سے چند ایسے حصّے پیش کیے جائیں
جو اُن کی سیرت کے بعض حصّوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور جن سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ غالب
کے ذریعہ سے فنِ خطوط نویسی میں کتنا بڑا انقلاب پیدا ہوا۔ اسکے ساتھ ساتھ مکاتیب
غالب کی وہ تمام خصوصیات بھی واضح ہو جائیں گی جن کا مندرجہ بالا سطور میں اظہار کیا گیا ہے

شوخی غالب کے خطوط سے قطع نظر جب ہم اُس کی ذات، عادات واطوار اور سیرت
کے مختلف پہلوؤں کو ٹٹولتے ہیں تو ہمیں اُسکی ایک خصوصیت ایسی نظر
آتی ہے جو ہر حال میں اور ہر وقت اُس کی ذات اور شخصیت کے آئینہ میں جھلکتی رہتی
ہے۔ یہ خصوصیت غالب کی وہ شوخی ہے جسے کسی طرح اُسکی ذات سے علیحدہ نہیں
کیا جا سکتا اور جو اُسکی فطرتِ ثانیہ تھی۔ غالب کی یہ شوخی اُس کی گفتگو میں بھی تھی اُسکی
شاعری میں بھی نمایاں تھی اور اُسکے خطوط کے آئینہ میں بھی جھلملاتی ہوئی نظر آتی ہے
چنانچہ بیماری کے ایام میں جب اُس کا چہیتا شاگرد میر مہدی مجروح اُس کے
پیر دابنے کی اجازت چاہتا ہے تو وہ اُسے یہ کہہ کر روک دیتا ہے کہ تم سیّد زادے
ہو اور میں ایک گنہگار بندہ۔ اتنے گناہوں کی موجودگی میں آخری وقت ایک اور گناہ
کا اضافہ کیوں کروں۔ مگر شاگرد بضد ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ آپ میرے اُستاد
ہیں اور میں آپ کا ایک ادنیٰ شاگرد۔ مجھے اس خدمت سے محروم نہ کیجیے۔ آخر بڑی
رد وکد کے بعد معاملہ یوں طے پاتا ہے کہ میر مہدی مجروح کو پیر دابنے کی اجازت
مل جاتی ہے مگر غالب کفارہ کے طور پر کچھ اُجرت دینے کا وعدہ کر لیتے ہیں۔
جب میر مہدی پیر داب چکتے ہیں تو غالب سے ازراہِ مذاق اپنی اُجرت طلب
کرتے ہیں۔ یہاں غالب کی وہ شوخی عود کر آتی ہے، جسے اُن کی فطرتِ ثانیہ

ار دیا گیا ہے اور وہ یہ کہہ کر صاف بچ نکلتے ہیں کہ
"کیا! اُجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہارے پیسے
دابے حساب برابر ہوگیا۔"

غالب کی یہی فطری شوخی اُس کی شاعری میں نمایاں ہے مگر یہاں آکر اُس میں طنز بھی شامل ہوگیا ہے اور ان دونوں چیزوں کے امتزاج سے ایک تیسری چیز پیدا ہوئی ہے جسے سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ:-

"بسیار شیوہ ہائے بتاں را کہ نام نیست"

غالب کی یہ شوخی مذاس کی گفتگو اور شاعری کے بعد اُس کے خطوط میں نظر آتی ہے غالب کے ایک عزیز اُن کی تنگدستی اور پریشان حالی دیکھ کر اُنہیں مشورہ دیتے ہیں کہ اگر آپ والئے دکن کی طرف رجوع کریں تو اُمید ہے کہ وہ آپ کی طرف ضرور توجہ فرمائیں گے۔ غالب اس مشورہ کا کیا جواب دیتے ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اُس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے نہ دیئے۔ مگر تین ہزار روپیہ سال اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ سات سو روپیہ سال میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سیکرٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریذیڈنٹ معزول ہوگئے۔ سیکرٹری گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مرگئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مرگئے۔ واجد علی شاہ، بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔

یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے گئی۔ ایسے طالع مربّی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

اب جو والئے دکن کی طرف رجوع کروں تو یاد رہے کہ متوسط مرجائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اُس کی ضائع ہو جائے گی اور والئے شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اُس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے ہل پھر جائیں گے۔"

طلب قرض غالبؔ جس قدر اپنی شاعری کے لئے مشہور ہیں، اُسی قدر قرض کیلئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی کا بیشتر حصّہ قرض دینے والوں کے رحم وکرم پر گذرتا تھا۔ ان کی شاعری کے بعد اُن کے خطوط اس قرض کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں ؂

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

لیکن جس طرح قیامت خیز صدموں کے وقت بھی اُن کی تفنن طبع اور شوخی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ اُسی طرح مقروض ہونے کی حالت میں بھی وہ خود بھی ہنستے تھے دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان جانکاہ تفکرات کو ہنسی مذاق میں اُڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کے نام ایک خط مقروض ہونے کی حالت میں بھی اُن کی شوخیٔ مزاج کی صاف غمازی کر رہا ہے۔ اور اُن کی تنگدستی کا پوری طرح آئینہ دار ہے۔ اس خط سے اُن کے جذبۂ غیرت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ خط نہیں ان پر انہیں کا زہر خند ہے۔

"جو دُکھ مجھے پہونچتا ہے کہتا ہوں کہ غالبؔ کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں ہے

سچ تو یوں ہے کہ غالبؔ مرا، ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کے بعد اُن کو جنّت آرام گاہ اور عرش نشین خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر۔ ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب آپ تو سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ اُکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔"

مرزا تفتہ کے نام خط۔

"یہ تمہارا دُعا گو اگرادر اُمور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج میں اُس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی بہت محتاج ہوں سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔۔۔۔۔"

غالبؔ کا یہ خط پڑھ کر کہہ دینا کہ وہ قرض مانگنے کے فن میں ماہر تھا اور اُس نے اس فن کو معراجِ کمال پر پہونچا دیا تھا۔ اُسی حالت میں صحیح ہو سکتا ہے جب پڑھنے والے کے دماغ سے غور و فکر کی قوت بالکل ہی مسلب ہو چکی ہو۔ کیونکہ اس خط کی مندرجہ ذیل عبادت غالبؔ کی سیرت کے اُس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جسے دیانت داری کہنا شاید زیادہ صحیح ہو وہ عبارت یہ ہے۔

"۔۔ جے پور سے اگر دو ہزار روپے ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا۔۔۔۔۔"

اس خط کے علاوہ غالبؔ کے بعض دوسرے خطوط سے بھی یہ بات واضح ہے

کہ اُسے قرض مانگنے کے ساتھ ساتھ اُس کی ادائیگی کی فکر بھی دامنگیر رہتی تھی اور کبھی کبھی وہ دن بھی طلوع ہوتا تھا جب وہ قرض ادا کرنے کے بعد بہت سبکدوشی محسوس کرتے تھے اور بڑی طمانیت قلب سے لکھتے تھے کہ

"...... ہنڈی میں بارہ دن کی میعاد باقی تھی چھے دن گذر گئے تھے۔
چھے باقی تھے مجھ کو صبر کہاں۔ بتی کاٹ کر روپیہ لئے قرض متفرق
سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہوا۔"

مدح میں اعتدال

مسلسل پریشانیوں اور لا محدود احتیاج کے عالم میں بڑے بڑے خود دار اور با اصول لوگوں کے پائے استقلال میں بھی لغزش آجاتی ہے اور خصوصاً اس حالت میں کہ جب ضرورت مند یہ محسوس کرے کہ اگر میں فلاں شخص کی ضرورت سے زیادہ تعریف کروں گا تو وہ خوش ہو کر میری حاجت براری کر دیگا تو مدح و توصیف کے وہ بے پناہ دفتر کھل جاتے ہیں کہ بقول مولانا حالی "خود ممدوح کو اپنی تعریف میں مزہ نہ آیا" مگر جب ہم غالب کی سیرت کے اس پہلو پر غور کرتے ہیں تو اُسکے رکھ رکھاؤ اور میانہ روی کو دیکھ کر اُسکے کردار کی بلندی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ غالب کے چہیتے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ جو اکثر و بیشتر غالب کی دامے درمے مدد کرتے رہتے تھے۔ اپنے دیوان فارسی پر غالب سے دیباچہ لکھوانا چاہتے تھے۔ غالب نے اُس پر مناسب اور جچے تلے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ مگر مرزا تفتہ نے اس سے کچھ زیادہ کی فرمائش کی۔ اس پر غالب نے مرزا تفتہ کو جو جواب لکھا۔ اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلط بیانی اور ممدوح کی ضرورت سے زیادہ تعریف کو غالب کسی حالت میں بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ خواہ مخاطب اُن کا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو اور خواہ اس سے مالی منفعت کی کتنی ہی اُمید کیوں نہ ہو۔ غالب مرزا تفتہ کو یوں جواب دیتے ہیں:۔

"... کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح لکھنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی تقریظ ملاحظہ کرو۔ اُسکی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوانِ حافظ کی بموجب فرمائش "جان جاکوب" بہادر کے لکھی ہے۔ اُس کو دیکھو فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شہزادہ یا امیرزادہ کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُسکی مدح نہ کرتا جتنی تمہاری کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر سے ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اُسکے عوض میں ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھی میری روش نہیں۔"

مے نوشی

غالب کی سیرت کا تیسرا پہلو جسکے لئے وہ بہت مشہور اور بدنام ہیں اُن کا شغل مے و مینا ہے۔ اُن کا یہ پہلو ایسا صاف اور کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے جس پر نہ کوئی حاشیہ آرائی کی جاسکتی ہے اور نہ اس باب میں کسی تاویل کی گنجائش ہے۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"... جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی ہے اور کل سے نری انگیٹھی پر گذارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف ..."

غالب کی مے نوشی کا سُراغ اُن کی ابتدائے عمر سے ملتا ہے اور آخر وقت تک جاری رہا گو وہ باقاعدہ پیتے تھے اور کھانا کھانے کے بعد یہ شغل جاری ہوتا تھا مگر اُن کے خطوط

سے ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میں بہت احتیاط برتتے تھے اور اعتدال کی حد سے تجاوز نہیں کرتے تھے اور آخر عمر میں تو وہ بہت زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ چنانچہ مولانا حالیؔ یادگار غالبؔ میں بیان کرتے ہیں کہ مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار اُنہوں نے مقرر کر لی تھی۔ اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اُس کو سخت تاکید تھی کہ رات سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔

آخر میں اُن کے قویٰ بالکل مضمحل ہو گئے تھے اور ضعف کا عارضہ بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے شراب کی مقدار میں بھی بہت کمی کر دی تھی اور سوتے وقت صرف پانچ روپے بھر وزن کر کے پیتے تھے۔ شاید اسی احتیاط کا تقاضہ تھا کہ وہ ابتدائے عمر ہی سے شراب میں عرق گلاب ملا لیا کرتے تھے تاکہ اُس کی حدت کم ہو جائے۔ اپنی فارسی غزل کے ایک شعر میں بھی وہ اپنی اسی عادت کا یوں تذکرہ کرتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوئے اوست   آمیختن بہ بادہ صافی گلاب را

اُن کے خطوط سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شراب میں گلاب ملا کر پینے کے عادی تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"..... آج میرے پاس سینتالیس ۴۷ روپیے نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں ....."

خوفِ خدا

خواہ گلاب ملا کر، خواہ تھوڑی یا بہت وہ پیتے آخر عمر تک رہے۔ مگر وہ اپنے اس فعل پر نادم بہت تھے۔ بلکہ آخر میں تو اُنہوں نے اپنی گنہگاری اور اس قسم کی بے اعتدالیوں پر اظہار افسوس کیا ہے۔ چنانچہ میاں دادخاں سیاح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفرِ دور دراز درپیش ہے
زادِ راہ موجود نہیں ہے۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخش دیا
تو خیر۔ اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ
جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجود ذوقِ مئے و مینا اور شاہد پرستی کے غالب کے دل میں خدا کا خوف تھا۔ وہ خود اپنی اس روش کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ مگر چونکہ عادت سے مجبور تھے اسلئے اپنے مشاغل ترک نہیں کر سکتے تھے۔

مکاتیبِ غالب کو پیشِ نظر رکھ کر اُن کی سیرت کے صرف پانچ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ سطورِ مندرجہ بالا میں کئے گئے دعوؤں کی تصدیق ہو سکے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی سیرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اُن کے خطوط روشنی نہ ڈالتے ہوں۔ مکتوباتِ غالب کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے جسے اُردو زبان و ادب کا مؤرخ کسی حالت میں نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

مولانا حالی کی شاعری

حالی اس دور کی یادگار ہے جب ہندوستان سخت قسم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُس نے انحطاط کے دور میں آنکھ کھولی۔ اسی دور میں پروان چڑھا اور ایسے ماحول میں اُس کی شاعری کا آغاز ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے کلام کا ایک حصہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور دم توڑتے ہوئے معاشرے کا ترجمان ہے ؎

کرتے کیا؟ پیتے اگر مے نہ عشاء سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

شبِ وعدہ ہے بارِ عام اُن کے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

نہ چھیڑوں تذکرہ وصلِ عدو کا
اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو

تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو
عذر اُن کی زبان پہ آنے لگے

اس دور میں حالی وصلِ عدو کی داستانیں مزے لے لے کر سناتے ہیں، دیِ جاناں کی دربانی کرتے ہیں، آتش و رشک میں جلتے ہیں۔ لیکن ملک کے حالات تیزی سے بدلتے ہیں خدا کا ایک بندہ (سرسید احمد خاںؒ) قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھاتا ہے حالی کا قومی احساس بھی بیدار ہوتا ہے وہ بھی سرسید کا دامن پکڑ لیتے ہیں، اُنکے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ وہی مضامین جو پہلے دور میں اُنکی شاعری میں بڑے طمطراق سے باندھے جاتے تھے۔ وہ داستانیں جو مزے لے لے کر سنائی جاتی تھیں۔ اب قلم زد ہو جاتی ہیں۔ نگاہ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ خیالات بلندی کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ اب حالی ایک جدید ادبی تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں اُن کی غزلوں میں رفعتِ خیال اور جذبات کے اظہار میں اعتدال نظر آتا ہے۔ وہ تغزل کے ساتھ ساتھ ایسے مضامین نظم کرنے کی "بدعت" کا بھی ارتکاب کرتے ہیں جو "کنگھی چوٹی" سے

مختلف ہیں ؎

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا — جس گھر سے سر اٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت، کیا زاہدوں کا تقویٰ — جو گنج تو نے تاکا، اُس کو لٹا کے چھوڑا

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے — جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

ہوئے تم نہ سید سے جوانی میں حالیؔ — مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

یہی دَور ہے جس میں اُن کی غزل گوئی غیر معمولی کروٹ لیتی ہے۔ پھر یہی وہ دَور ہے جس میں نظم گوئی کا اظہار ہوتا ہے۔ اخلاقی، واقعاتی اور افادی نقطۂ نظر کی حامل نظمیں انہیں ایک مصلح شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ قوم کی غفلت، پستی اور تباہ حالی کا مرثیہ لکھا جاتا ہے۔ خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کیلئے ہی اُن کا شہرۂ آفاق مسدّس تصنیف ہوتا ہے (''سرسید کی تحریک اور مسدّس حالیؔ'' اسی مجموعے میں کسی دوسری جگہ دیکھئے) اُن کی معرکتہ الآرا نظم ''شکوہ ہند'' اسی سوزِ نہاں کی ترجمان اور اُردو شاعری میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ یہی وہ چراغ ہے جس سے ایشیا کے عظیم شاعر علامہ اقبالؔ نے اپنا چراغ روشن کیا۔ غرض حالیؔ کی شاعری تنزّل پذیر ہندوستان اور پھر ترقی کی طرف بڑھتے ہوئے ہندوستان دونوں کی حقیقی ترجمان ہے حالیؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد دوسری بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی فطرت اور مزاج میں ابتدائے عمر سے بعض صحت مند عناصر تھے۔ جن کا عکس اُن کی شاعری کے پہلے دور میں بھی نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے ابتدائی دَور کے کلام میں بعض ایسے رجحانات بھی ہیں جو جرأت اور اُن کی قبیل کے شعراء کے یہاں تو بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر حالیؔ کے یہاں نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ان غیر صحت مند رجحانات اور خیالات کو بیان کرنے کے لئے اُنہوں نے

جو اسلوب اختیار کیا وہ جرأت سے کہیں بہتر اور مختلف ہے وہ کھیل کھیلنے کے باوجود بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے ہیں کہ ؎

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

اُن کی شاعری کے پہلے دَور میں بھی وہ گھٹیا پن اور وہ بازاریت نہیں ہے جسکے چھینٹوں سے اُردو شاعری کا دامن داغدار ہو گیا ہے۔ اُن کی ابتدائی شاعری میں بھی ہمیں ایسے اشعار بڑی کثرت سے ملتے ہیں جو اُن کے تابناک مستقبل کی طرف نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ شعر دیکھیے ؎

مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائیگا

حالیؔ نشاطِ نغمۂ و مئے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

حالیؔ زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تو نے

یہ تو حالیؔ کی شاعری کے دو مختلف ادوار کا فرق تھا جو آپ کو دکھایا گیا۔ ملکی حالات کے نشیب و فراز کا عکس تھا جو اُن کی شاعری میں جھلکتا ہوا نظر آیا۔ اُن کے صحت مند رجحانات تھے جو تلاش کر کے آپ کے سامنے رکھے گئے۔ اب بحیثیت فن اُن کی شاعری کا مطالعہ کیجئے اور نقد و نظر کی ترازو میں رکھ کر کوئی فیصلہ کیجئے۔

ان کی شاعری میں خواہ پہلے دَور سے تعلق رکھتی ہو یا دوسرے دَور سے یا آخرِ عمر سے۔ ہر دور میں ایک بات بہت صاف اور واضح صورت میں نظر آتی ہے اور وہ ہے اُن کا خلوص درد مندی اور جذبہ کی صداقت یہی وجہ ہے کہ اُن کے بیشتر شعر دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں اسی خلوص اور درد مندی کا نتیجہ ہے جو اُن کے اشعار میں تاثر کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اُن کے یہاں ایک ایسی کیفیت ہے جسے درد مندی

کہنا زیادہ صحیح ہے۔ مندرجہ ذیل شعر پڑھئے اور خاص طور پر آخری شعر توجہ سے پڑھیئے ؎

گر صاحب دل ہوتے تو سُنکر مری بیتابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح!
کچھ ہم سے سُنا ہوتا، پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے در گذرے، وہ چاہے سو کر گذرے
گر آج نہ تم آتے، کیا جانئے کیا ہوتا

کل حالیؔ دیوانہ، کہتا تھا کچھ افسانہ
سُننے ہی کے قابل تھا، تم نے بھی سُنا ہوتا

۲۔ آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں، اور بھائی بہت

اُسکے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

۳۔ ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

حالیؔ کے کلام کی دوسری خوبی اُن کے اندازِ بیان کی سادگی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں دونوں میں عام فہم زبان، آسان اور سُبک الفاظ استعمال کئے ہیں۔ نظموں میں اس لئے کہ اُن کے مخاطب عربی و فارسی کے جید علماء سے زیادہ عوام تھے جن کے لئے عالمانہ اصطلاحوں کی بجائے آسان انداز بیان زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ غزلوں میں اسلئے کہ وہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے بہت زیادہ متاثر تھے اور دونوں نے ایک ساتھ تقریباً سات سال گذارے تھے۔ دوسرے اس لئے کہ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب اور اُردو شعر کے بہت بڑے نقاد بھی تھے۔ اُردو شاعری کے حُسن و قبح پر پوری نظر رکھتے تھے اور بقول خود ؎

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو، تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ شعر کے دل گداز ہونے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اُسکے انداز بیان میں زیادہ سے زیادہ سادگی ہو۔ جو مشکل الفاظ سے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ مرزا غالبؔ کے شاگرد نہ صرف شاگرد

بلکہ شاگردِ رشید تھے اور غالب کی مشکل پسندی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے مگر اس کے باوجود حالی نے اس معاملے میں اُستاد کی پیروی نہیں کی اور اپنے لئے ایک علیحدہ راستہ بنایا اور اندازِ بیان میں زیادہ سے زیادہ عام فہمی اور سادگی پیدا کی۔ ویسی ہی سادگی جو آخر میں غالب نے بھی اختیار کی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حالی کے یہاں مشکل الفاظ سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ہیں اور ضرور ہیں مگر وہاں جہاں وہ مجبور تھے۔ بعض جگہ غالب کا اثر بھی نظر آتا ہے مگر ان الفاظ کی تعداد محدود ہے۔ اُن کا عام رنگ وہی تھا جسے سادگی اور آسان گوئی سے تعبیر کرنا چاہیئے ان کی اس خوبی کے ثبوت میں یہاں مثالیں دینا بے سود ہے کیونکہ اس سے پہلے اُن کے جو اشعار درج کئے گئے ہیں ان میں سے بیشتر اس خیال کی ہم نوائی کریں گے۔ اُن کی نظموں میں بھی اندازِ بیان کی سادگی موجود ہے۔ چنانچہ اُن شہرہ آفاق "مسدس شکوہ ہند"، "بیوہ کی مناجات" اور بعض دوسری نظمیں ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

غرض یہ کہ اُن کی غزلیں حسنِ بیان، لطفِ زبان، جذبات نگاری، سوز و گداز سادگی و صفائی کے نہایت اعلیٰ نمونے ہیں۔ اور اُن کی نظمیں خالصتاً افادی نقطۂ نگاہ کی حامل ہیں۔ اُنہوں نے شاعری کو ملک و قوم کی اصلاح کا ذریعہ بنایا وہ "ادب برائے زندگی" کے سب سے پہلے مبلغوں میں سے تھے۔ اُنہوں نے "چھوٹوں کا بڑا بن جانا" "مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر"، "ایک خود پسند امیرزادے کی تضحیک"، "آزادی کی قدر"، "اسراف"، "خود ستائی"، "شادی قبل از بلوغ"، "بے اعتدالی"، "فضول خرچی کا انجام" اور "فلسفۂ ترقی" وغیرہ نظمیں لکھ کر ہماری شاعری کا رُخ ہی موڑ دیا اُنہوں نے غزل کو سفلہ جذبات سے پاک کیا اور نظم کو نئے نئے موضوعات دیئے۔ اسی اعتبار سے وہ اُردو شاعری کے بہت بڑے محسن تھے اور تاریخ نظم اُردو میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

سرسید کی تحریک اور مسدس حالی

انیسویں صدی عیسوی مسلمانانِ ہندوستان کی ہلاکت و بربادی کا جو پیغام لے کر آئی تھی وہ ۱۸۵۷ء میں انہیں موصول ہوگیا۔ مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ آخری سنبھالا لیکر ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔ مغلوں کی عظمت کا آخری اور دھندلا سا نشان رنگون کے زنداں میں اپنے مقدور سے شکوہ کرتا ہوا مٹ گیا۔ ملک و مال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی عزت و آبرو اور بے شمار جانیں تلف ہوگئیں۔ ہر طرف ایک سناٹا چھا گیا بچے کھچے مسلمان دم بخود ہوگئے۔ ہر سمت یاس و جمود طاری ہوگیا۔ اور بظاہر مسلمان قوم میں زندگی کے نشانات بالکل معدوم ہوگئے کہ دفعتہً اسی سناٹے میں ایک آواز گونجی اور چشم زدن میں اطرافِ ہندوستان میں پھیل گئی ؎

رہوگے یونہی فارغ البال کب تک ۔ نہ بدلوگے یہ چال اور ڈھال کب تک

رہے گی نہی بود پامال کب تک ۔ نہ چھوڑوگے تم بھیڑیا چال کب تک

بس اگلے فسانے فراموش کردو

تعصب کے شعلے کو خاموش کردو

یہ آواز حالی کی تھی جسے بیس سال تک بقولِ خود "شاعری بدولت جھوٹا عاشق بننا پڑا، ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت و جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکوں ہلا ڈالا۔ کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کرّوبیان کے کان بہرے ہوگئے۔ شکایتوں کی بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہوگیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔ یہاں تک کہ

آپ اپنے سے بدگمان ہو گئے ــــ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اُٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدانِ قیامت میں اکثر گذر ہوا، بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔۔۔۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بیزار رہے، پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بُت پوجے، زنار باندھا، قشقہ لگایا۔ زاہدوں پر پھبتیاں کہیں۔ واعظوں کا خاکہ اُڑایا، دیر اور بت خانے کی تعظیم کی، کعبہ اور مسجد کی توہین کی، خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں۔۔۔۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں کوئی سفیدی باقی نہ چھوڑی۔"

حالی نے اپنے مسدس کے دیباچے میں یہ الفاظ صرف عبارت آرائی یا اپنا زورِ قلم دکھانے کے لئے نہیں لکھے۔ بلکہ یہ ایک سفید بھی طنز سے بھرپور جو اُس دور کی شاعری اور شاعروں کی روش سے متاثر ہو کر کی گئی تھی۔ اُردو شاعری کا سرمایہ جن مفروضات پر مشتمل تھا۔ حالی نے بہت ہی دلنشین اور لطیف پیرایہ میں بیان کیا۔ اُن کی یہ تنقید صرف دوسرے شعراء پر نہیں تھی۔ بلکہ اُنہوں نے اپنے آپ کو بھی اس کا نشانہ بنایا۔

"بیسویں کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں۔"

وہ چکر جس میں حالی تیلی کے بیل کی طرح بیس سال سے چالیس سال تک پھرتے رہے، اُسکی حقیقت کیا تھی خود حالی کے ان شعروں سے اُسکی کیفیت کا اندازہ کیجئے ؎

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے　　پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

عشق اُس وقت سے سر پہ ترے منڈلاتا تھا　　گودیوں میں تھا تجھے جب کہ کھلایا جاتا

اک جرعۂ شراب نے کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانہ پیر مغاں ہے اب

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے مگر یاں جی کچھ اے زاہد اچاٹ!

چشم بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ
غیرت عشق سے ابتک وہ خبردار نہیں

یہ چند شعر ہیں جو کلام حالی سے نقل کئے گئے ہیں۔ ورنہ ان کے بیس سالہ دور کی شاعری میں ایسے شعروں کی کمی نہیں۔ بتیس سال کے خیالات میں یکدم تبدیلی پیدا ہو گئی اور وہ حالی جو پہلے کہتا تھا کہ

بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے خبر کچھ
بہر نماز نعش پہ آنا ضرور تھا

نہ چھیڑوں تذکرہ وصل عدو کا
اگر سمع مبارک پہ گراں ہو!

اب یوں کہنے لگا کہ

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کو اپنے "محو نالۂ جرس کارواں" رہنے کا احساس کیوں اور کیسے ہوا؟ انہیں کے الفاظ میں سنئے وہ نگاہ اٹھا کر دیکھا دائیں بائیں۔ آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا۔ جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لئے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور ذہن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو۔ ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔

چند روز اس تردد میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا۔ دوسرا پیچھے ہٹتا تھا ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے۔ ایک دشوار گذار رستے

میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں
اور بہت سے افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں پیروں میں چھالے
پڑے ہیں۔ دم چڑھ رہا ہے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو اُن
سب کا راہنما ہے۔ اسی طرح تازہ دم ہے نہ اُسے راستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھو
چھوٹ جانے کی پرواہ ہے۔ نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے اُسکی چتونوں میں غضب کا
جادو بھرا ہے کہ جسکی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اُس کے ساتھ
ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی"
وہ اولوالعزم انسان جسکی ایک نگاہ حالی پر پڑی اور اپنا کام کر گئی کون تھا۔ حالی کے اپنے
الفاظ میں "یعنی سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ ۱۳۱۵ھ" سر سید احمد خاں نے جنہوں نے ہندوستان
کے مسلمانوں کو گرداب تباہی میں پھنسا ہوا دیکھ کر ناخدائی کے لئے کمر باندھی اور جن اُس
وقت اُس طوفان زدہ سفینے کی ناخدائی کی جب یہ آخری ہچکولے کھا کر ڈوبنے والا تھا
سر سید احمد خاں کی تحریک کسی فوری یا ہنگامی جوشش کا نتیجہ نہ تھی جو ایک ہنگامہ
لے کر اُٹھی اور ہنگامے کی طرح ختم ہو گئی۔ بلکہ یہ ایک سلجھے ہوئے اور ٹھنڈے
دماغ کے مسلسل غور و فکر کا نتیجہ تھی۔ جس نے ہندوستان کے مسلمانوں
کی کایا پلٹ دی۔ محسن الملک، وقار الملک، نذیر احمد، شبلی اور حالی سر سید
کی سر کردگی میں ان پانچ آدمیوں نے مسلمان قوم کی تعمیر کا بیڑہ اُٹھایا اور
ہر ایک نے اپنے شعبہ میں مسلمانوں کی ترقی اور بقا کے لئے ٹھوس کام کرنا
شروع کر دیا۔ سر سید کو احساس تھا کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے ہندوستان کی دوسری
اقوام خصوصاً ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے انھوں نے مسلمانوں میں

انگریزی تعلیم اور خصوصاً علوم جدیدہ کو رواج دینے کے لئے ایک علیحدہ دار العلوم کے قیام کی کوشش شروع کر دی ایسے دار العلوم کی کوشش جس میں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والے صرف انگریز ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ وہ اسلامی روایات کے بھی حامل ہوں چنانچہ نواب محسن الملک اور وقار الملک نے رفقائے کار کی حیثیت سے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں سرسید کا ہاتھ بٹایا اور فراہمی چندہ کی مہم میں سرسید کے دست راست کی حیثیت سے اُن کا پورا ساتھ دیا ......

.... کالج اور پھر یونیورسٹی کے قیام کے بعد اُس کے استحکام اور ترقی میں سرسید کے بعد اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ یہی دو آدمی ہیں۔ وقار الملک اور محسن الملک۔

سرسید کو اس کا بھی احساس تھا کہ اُردو زبان میں مسلمانوں کا علمی سرمایہ بہت ہی محدود ہے اور جو ہے وہ بھی بہت کچھ اصلاح طلب ہے۔ چنانچہ شبلی نے اس کام میں سرسید کا ہاتھ بٹایا اور اپنی متعدد علمی و ادبی اور تاریخی و مذہبی تصانیف سے مسلمانوں کی علمی بے مائگی کو دور کر کے اُردو زبان کے لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا۔

مولوی نذیر احمد نے اپنی مخصوص اور چٹ پٹی زبان میں مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ غلط رسوم و رواج اور مسلمانوں کی معاشرتی پستی کو دور کرنے میں مولوی نذیر احمد کی لٹریری خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جس ایک شخص سے سرسید نے یہ سارے کام لئے۔ وہ خواجہ الطاف حسین حالی ہیں۔ حالی نے سرسید ہی کی تحریک سے اپنے معرکۃ الارا "مسدس مدوجزر اسلام"

میں وہ تمام خصوصیات جمع کردیں۔ جو نواب وقار الملک، محسن الملک، شبلی، مولوی نذیر احمد اور خود سر سید نے مسلمانوں میں پیدا کرنی چاہی تھیں، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مسدس حالی میں سر سید کی تحریک کے اثرات کہاں تک موجود ہیں سر سید کی تحریک کا تجزیہ کرلینا مناسب ہوگا۔

اگر ہم پورے غور و فکر سے کام لیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ سر سید کی تحریک کے چار بنیادی عناصر تھے۔

اوّل:۔ مسلمانوں میں اُن کی تباہی اور ادبار و نکبت کا احساس پیدا کیا جائے اور اُن کے آباؤ اجداد کی شان و شوکت سے اُن کی حالت زار کا مقابلہ کرکے غیرت دلائی جائے۔ دوم۔ دینی علوم کے ساتھ اُن میں دنیوی علوم، انگریزی اور خصوصاً علوم جدیدہ کو رواج دیا جائے۔ سوئم۔ مسلمانوں کے عقائد میں بعض ایسی چیزیں داخل ہوگئی ہیں جن کا مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ان غیر ضروری اور مہلک عقائد اور رسم و رواج کو ترک کردیا جائے۔ چہارم مسلمانوں میں انگریزی سے نفرت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے۔ اُسی کا نتیجہ ہے کہ وہ مغرب کی بعض اچھی چیزوں کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ قدامت پرستی اور اپنی پہلی حالت پر اڑے رہنے کا جذبہ نہایت خطرناک ہے اسے فوراً ختم کردینا چاہیئے۔ ورنہ مسلمانوں کی ترقی ناممکن ہے۔

انھیں عناصر اربعہ پر سر سید نے اپنی تحریک کی عمارت تعمیر کی تھی۔ آیئے دیکھیں مسدس حالی میں یہ عناصر کہاں تک موجود ہیں۔ سر سید کی تحریک کا پہلا اور بنیادی عنصر کہ مسلمانوں میں اس بات کا احساس پیدا کیا جائے کہ وہ اپنے

آباؤ اجداد کی تمام شاندار روایات کو بھلا چکے ہیں۔ یہ عنصر ہمیں ان کی تحریروں اور تقریروں میں بھی ملتا ہے۔ دراصل یہی وہ احساس ہے جو کسی قوم کو اس کی بیداری اور ترقی پر آمادہ کرتا ہے۔ سرسید نے یہ حکیمانہ نکتہ تقریباً اپنی ہر تقریر میں بیان کیا ہے۔ اس وقت ان کی وہ تقریر ہمارے سامنے ہے جو انہوں نے قومی تعلیم اور قومی ہمدردی کے عنوان پر ۲۳ جنوری ۱۸۸۴ء کو لدھیانہ کے ایک اجتماع عام میں ارشاد فرمائی تھی اس تقریر میں انہوں نے اس نکتہ پر روشنی ڈالی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"جس قوم کو یہ خیال ہوا کہ ہم تنزل کی حالت میں ہیں اور اس کے ساتھ اس میں کچھ تحریک بھی پیدا ہوئی تو یہ پہلی سیڑھی ترقی کی ہے"۔

یہی اہم نکتہ انھوں نے ذرا وضاحت سے اپنی پٹنہ کی تقریر میں ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو بیان کیا تھا۔

"کوئی بے عزتی اور بے غیرتی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنے سلف کے ایسے خلف ہوں جن سے ہمارے اسلاف کی نام آوری کو بھی بٹہ لگے۔ دیکھو تمام ہندوستان میں تمہاری قوم کا کیا حال ہے سب قوموں سے زیادہ جاہل، سب قوموں سے زیادہ ذلیل، سب قوموں سے زیادہ نظروں سے گری ہوئی۔ سب قوموں سے زیادہ مفلس۔ ہاں جو چیز کہ سب قوموں سے زیادہ اُن کے پاس ہے وہ کیا ہے خود اپنی قوم سے بغض و عداوت، کینہ و حسد، خود اپنی قوم کی بدخواہی و بداندیشی۔ قومی عزت، قومی ہمدردی، قومی افتخار کا ہم میں نام بھی نہیں"

حالی کے مسدس میں بھی مسلمانوں کے تنزل کا احساس سب سے زیادہ ملتا ہے۔ سرسید کی طرح حالی نے بھی اپنے مسدس کی بنیاد اسی اہم نکتہ پر رکھی ہے

چنانچہ عرب کے زمانہ جاہلیت اور پھر عہد اسلام کا فرق دکھانے کے بعد
حالیؔ نے مسلمانوں کی اس دور کی پستی کو نہایت ہی دردناک پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا وہ اُمت لقب جس کا خیر الامم تھا

نشان اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آباء کو ہم سے گہن ہے ہمارا قدم ننگ اہل وطن ہے

بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایان اعزاز ہیں ہم نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم

نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصّہ ہمارا ہے سوداگری میں

مسلمانوں کو اُن کی پستی اور پسماندگی کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں کی تحریک میں جابجا ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جن کے ذریعہ سے انھوں نے مسلمانوں کے اسلاف کی شوکت و عظمت یاد دلاکر انھیں ترقی پر اُبھارا ہے۔ چنانچہ پٹنہ کے ایک اجتماع میں جو ۲۶ر مئی ۱۸۷۳ء کو منعقد ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر کے مندرجہ ذیل حصّہ میں اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آپ صاحبوں میں سے جو اس وقت موجود ہیں بہت سے صاحب ایسے ہونگے جنہوں نے اپنے باپ دادا کی عزت اور حشمت آنکھوں سے دیکھی ہو گی۔ اُن کی خوبیاں اور اُن کے اخلاق، اُن کی متانت اور اُن کا وقار بخوبی یاد ہوگا۔
اور اگر کسی نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہوگا تو ہزاروں آدمی اُن کے دیکھنے والے موجود ہوں گے۔ اُن کی خوبیاں بطور کہاوتوں کے اور اُن کی فیاضیاں بطور حکایتوں کے لوگوں میں مشہور ہوں گی۔ اب تم اپنے حال کا اپنے بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو اور دیکھو وہ کیا تھے اور تم کیا ہو؟"
جب ہم مسدس حالی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سر سیّد کی تحریک کا یہ عنصر بھی اس میں ملتا ہے۔ اور مسلمانوں کی تنزلی کے احساس کے بعد یہ احساس سب سے زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ مندرجہ ذیل بند اس احساس کی بڑی خوبصورتی سے ترجمانی کرتے ہیں۔

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں — مہیا کئے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں — انھیں کر دیا رشک صحن گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

یہ ہم وار سڑکیں، یہ راہ مصفا — دو طرفہ برابر درختوں کا سایہ
نشاں جا بجا میل و فرسنگ کے برپا — سر رہ کنویں اور سرائیں مہیا
انھی کے یہ سب نے ہیں چربے اتارے
اسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

مجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے خلافت کو زبردزبر جا کے دیکھے

جلال اُن کا کھنڈروں میں یوں ہے چمکتا

کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

اس کے بعد سرسید کی تحریک کا اہم عنصر مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور علوم جدیدہ حاصل کرنے کی تلقین سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد اُن کی ساری مساعی کا دائرہ چکر لگاتا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں سارا زورِ بیان اسی نکتے کی وضاحت پر صرف کردیا۔ سرسید کے دور میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جن کا دعویٰ تھا کہ ہمارے آباؤ اجداد نے جن علوم کے سرمائے ورثہ کے طور پر چھوڑے ہیں ان میں اس قدر وسعت اور افادیت ہے کہ اب مزید علوم حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزوں سے نفرت کے جذبے نے بھی لوگوں کو انگریزی زبان سے استفادہ کرنے سے باز رکھا تھا اور علمائے کرام اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچا رہے تھے۔ سرسید وہ پہلے انسان تھے جنھوں نے بے پناہ مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بتایا کہ اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے علوم کے جو بیش بہا خزانے چھوڑے ہیں وہ ہمارے لئے بہت مفید ہیں مگر جدید ضرورتوں کے تحت ہمیں انگریزی زبان اور اُس زبان سے تعلق رکھنے والے علوم بھی سیکھنے پڑیں گے ورنہ اس سرزمین پر باعزت زندگی گذارنا ہمارے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ (۱۸۹۶ء) میں انھیں خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"اے صاحبو! تم یقین کرو جو علوم ہمارے بزرگوں کے پاس تھے وہ شل ایک

بیج کے تھے۔ وہ اب ایسے پھلے پھولے ہیں کہ مثل تناور درخت کے ہو گئے ہیں اور پہچانے نہیں جا سکتے کہ یہ وہی علوم ہیں جو ہمارے بزرگوں کے پاس تھے اور جو نئے ایجاد ہوئے ہیں وہ تو نئے ہی ہیں اُن کا بیج بھی ہمارے بزرگوں کے پاس نہ تھا۔ اور غلطیاں جو ہمارے بزرگوں کے علوم میں معاف کیجئے گا۔ ہمارے بزرگوں کے علوم میں نہیں بلکہ یونانیوں کے علوم میں بہ سبب ابتدائی زمانے کے تھیں اور اب ظاہر ہو گئی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور ترقی یافتہ علوم ہماری دسترس میں موجود ہیں تو ہماری کیا شامت ہے کہ ہم انھیں یونانیوں کی غلامی میں اپنی تمام عمر۔ اب کیا کریں؟"

حالیؔ سرسید کے انھیں خیالات کو لے کر چلے ہیں اور انھوں نے اپنے مسدس میں جگہ بہ جگہ مسلمانوں کی قدیم علوم سے شیفتگی اور نئے علوم سے بے انتہا نفرت کا شکوہ کیا ہے۔ یہ بند خاص طور سے قابل غور ہیں۔

وہ تقویم پارینہ یونانیوں کی — وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی
یقین جس کو ٹھیرا چکا ہے نکمی — عمل نے جسے کر دیا آکے ردّی

اُسے وحی سے سمجھے ہیں ہم زیادہ
کوئی بات اس میں نہیں کم زیادہ

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے — وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے — کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے

جمی ہیں دلوں میں ارسطو کی رائیں
جواب وحی اترے تو ایماں نہ لائیں

سرسید کی تحریک کا تیسرا جزو مسلمانوں کی رسم و رواج کی اصلاح کرنا تھا۔ اس سے

اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی تحریک کتنی ہمہ گیر اور مسلمانوں کے ہر شعبہ کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ یہ رسم و رواج جو کچھ تو ہندوستان میں برس ہا برس سے رہنے کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی ہمسایہ قوم کے زیر اثر اختیار کر لئے تھے اور کچھ بگڑے ہوئے عقائد کا نتیجہ تھے۔ ان غلط قسم کے رسم و رواج نے جہاں مسلمانوں کے خیالات کو انتہائی مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ وہاں ان رسوم کے موقعوں پر اسراف زر نے اُن کی مالی حالت خراب کر کے انھیں قلاش کر دیا تھا۔ وہ روپیہ جو قومی کاموں میں صرف کر کے مسلمان اپنی قومی زندگی کی تعمیر کر سکتے تھے۔ اُس کا بیجا استعمال اُنھیں روز بروز پستی اور ذلت کیطرف دھکیل رہا تھا۔ سر سید نے اس صورتِ حال کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔ اُن کے غلط قسم کے مذہبی عقائد کی "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ سے اصلاح کی اور معمولی معمولی موقعوں پر اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر روپیہ خرچ کرنے کی افسوسناک حرکت کو اپنی تقریروں کے ذریعہ سے روکا۔ انہوں نے مو اخر الذکر صورت کی اصلاح کا وہ طریقہ آج سے ستر سال پہلے اختیار کیا۔ جو ہمارے رہنما اور حکام آج اختیار کر رہے ہیں۔ یعنی شادی بیاہ اور دعوتوں کے موقعوں پر کم سے کم روپیہ خرچ کرنا اس طرح پس انداز کی ہوئی رقم قومی تعمیر کے کاموں میں صرف کرنا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ دعوتوں میں کم سے کم آدمیوں کو بلایا جائے اور کم سے کم روپیہ خرچ کیا جائے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سر سید کی اسی تحریک کا اثر ہے جس کے ماتحت انھوں نے مختلف شہروں کے مسلمانوں کی طرف سے اپنے اعزاز میں دی جانے والی دعوتوں میں شرکت کرنے سے انکار کر کے وہ روپیہ علی گڑھ کالج میں

تعمیر و ترقی کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ غرض یہ کہ انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کر کے مسلمانوں کے اجتماعات میں ان خیالات کا بڑی بیباکی سے اظہار کیا چنانچہ انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۸۷۳ء کو مرزا پور میں اور اس کے بعد ۲۸۔ دسمبر ۱۸۹۰ء کو شاہجہانپور میں ایجوکیشنل کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنی فاضلانہ اور پُر مغز تقریر میں جہاں مسلمانوں کو دوسرے امور کی طرف توجہ دلائی۔ وہاں تقریبات کے موقعوں پر اصراف زر کی بھی مخالفت کی انہوں نے فرمایا کہ

"اُن لغو اور بیہودہ فضولیات سے جو شادیوں اور برادریوں میں کرتے ہیں دست کش ہونا اور اپنی اولاد کی تعلیم پر متوجہ ہونا اور اس روپے کو جو فضولیات میں خرچ کرتے ہیں اپنی اولاد کی تعلیم پر خرچ کرنا چاہیئے"

(تقریر ایجوکیشنل کانفرس منعقدہ شاہجہانپور)

چنانچہ جب ہم مسدس حالی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں سرسید کے ان خیالات کے بہت کافی اثرات ملتے ہیں۔ حالی نے اپنی اس معرکتہ الآرا نظم میں جگہ بہ جگہ مسلمانوں کی بدرسموں غلط رواجوں، مذموم روایتوں، شادی بیاہ اور میلوں ٹھیلوں کے موقعہ پر اپنی دولت کو پانی کی طرح بہانے پر سرسید کے خیالات کی کتنی صحیح ترجمانی کی ہے۔

طبیعت اگر لہو بازی پہ آئی — تو دولت بہت سی اس میں لٹائی
جو کی حضرت عشق نے رہنمائی — تو کردی بھرے گھر کی دم میں صفائی

پھر آخر لگے مانگنے اور کھانے
یونہی مٹ گئے یاں ہزاروں گھرانے

عمارت کی بنیاد ایسی اٹھائی | نہ نکلے کہیں ملک میں جس کا ثانی
تماشوں میں ثروت بڑوں کی اڑائی | نمائش میں دولت خدا کی لٹائی

چھٹی بیاہ میں کرنے لاکھوں کے ساماں
یہ ہیں ان کے ساماں یہ ہیں ان کے ارماں

سرسید کی تحریک کا تیسرا اہم جزو یہ تھا کہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق ہمیں بھی اپنی روزمرہ زندگی اور اپنے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنی چاہئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک کی دوسری اقوام کے شانہ بشانہ باوقار طریقے سے زندگی بسر کریں۔ سرسید مرحوم نے مختلف موقعوں پر اپنے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ زمانہ جامد نہیں ہے جو کسی ایک حالت پر قائم رہے یہ ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں رہنے والے بھی حسب ضرورت اس کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں۔ سرسید مرحوم کا یہ اشارہ تھا اس امر کی جانب کہ مسلمان مفلس اور ادبار زدہ ہونے کے باوجود ابھی تک اس زمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ جب وہ ہندوستان کے مطلق العنان حاکم تھے۔ جب وہ دنیا کی کسی قوم کو اپنے سے بڑا تو کیا اپنا ہمسر بھی نہیں سمجھتے تھے۔ جب دنیا اُن کے رسم ورواج اور عادات واطوار، اُن کی زبان اور اُن کا طرز معاشرت اپنانے میں فخر سمجھتی تھی۔ مگر اب جبکہ اُن کی بساط حکومت اُلٹ چکی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ اپنی طرز زندگی کو حاکم قوم کے رسم ورواج کے مطابق بنائیں مگر صرف وہاں تک جہاں تک اسلام سے تصادم نہ ہوتا ہو۔ انھوں نے اپنے ان خیالات کا اظہار پٹنہ کے ایک اجتماع میں بھی کیا تھا جو ۲۶ مئی ۱۸۷۳ء کو منعقد ہوا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ

"آپ کے بزرگ جس زمانہ میں تھے انہوں نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق بنالیا تھا۔ اس لئے وہ دولت اور حشمت اور عزت سے نہال تھے اور جس زمانے میں کہ ہم تم ہیں۔ ہم نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق نہیں بنایا اس لئے نکبت اور ذلت میں ہیں۔ پس اگر ہم اپنے میں وہ چیزیں پیدا کریں جو اس زمانے میں لائق اور قابل اور معزز بنانے کے لئے ضروری ہیں تو ہم بھی اپنے زمانے میں دولت و عزت سے مالامال ہوں گے۔ دیکھو زمانہ دوڑتا جاتا ہے۔ اگر ہم اُس کے ساتھ نہ چلیں گے تو ضرور پیچھے رہ جائیں گے۔"

حالی نے بھی اپنے مسدس میں سرسید کے انھیں خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے جس کے اشارے سرسید کی تحریک میں ملتے ہیں۔

جو گرتے ہیں گر کر سنبھل جاتے ہیں وہ پڑے زد تو بچ کر نکل جاتے ہیں وہ
ہر اک سانچے میں جاکے ڈھل جاتے ہیں وہ جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ

ہر اک وقت کا مقتضیٰ جانتے ہیں
زمانے کے تیور وہ پہچانتے ہیں

مگر ہے ہماری نظر اتنی اونچی کہ یکساں ہے واں سب بلندی و پستی
نہیں اب تک اصلا خبر ہم کو یہ بھی کہ ہے کون مردار کتنا ترقی

جدھر کھول کر آنکھ ہم دیکھتے ہیں
زمانے کو اپنے سے کم دیکھتے ہیں

زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارا | کہ ہے آشتی میں مری یاں گذارا
نہیں پیروی کو میسر ی گوارا | مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارا

سدا ایک ہی رُخ نہیں ناؤ بہتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

غرض حالی کا مسدس سر سید کی تحریک کا کامیاب ترین ترجمان اور اُس پر پوری طرح حاوی ہے۔ وہ باتیں جو سر سید نے موثر نثر میں کہہ کر قوم کی حالت بدلنے کی کوشش کی تھی حالی نے انہیں کو موثر نظم میں بیان کر کے قوم کی رگوں میں گرم لہو دوڑا دیا

نوٹ:۔ اس مقالے میں سر سید کی بعض وہ تقاریر بھی شامل کر لی گئی ہیں جو مسدس کی تصنیف کے بعد کی ہیں۔ اس کا مقصد صرف سر سید کے خیالات پر روشنی ڈالنا تھا۔

اکبر الہ آبادی کی شاعری

غزل گوئی اکبر الہ آبادی نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی، قطعات بھی اور رباعیات بھی، ترجیع بند بھی مثنویات بھی اور ایک مسدس "گنج پنہاں" بھی۔ "حکایت زلف و رخسار اور آرزوئے بوسہ" سے اُن کی شاعری کا آغاز ہوا اور قوم کی رگوں میں طنز کے نشتر چبھوتے ہوئے اُسی کا اختتام۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ جدال و قتال سے تقریباً گیارہ سال پہلے پیدا ہوئے۔ اُس زمانے میں اردو شاعری کا جو رنگ تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ابتدائی غزلیں بلکہ تقریباً چالیس سال تک کی عمر کی کہی ہوئی غزلیں اُسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں جو اُس عہد کے لئے مخصوص تھا۔ چند شعر دیکھئے۔

تصور اُنکے عارض کا زبس رنگین و نازک تھا
پری بن کر ہمارے شیشۂ دل میں اُتر آیا

دل مرا اُن پہ جو آیا تو قضا بھی آئی
درد کے ساتھ ہی ساتھ اُس کی دوا بھی آئی

ہوئیں آغازِ جوانی میں نگاہیں نیچی
نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

مگر اُن کی عشقیہ شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک چیز کا اندازہ ضرور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اُن کی شاعری میں نقالی اور آورد کا نشان تک نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ صرف اور صرف غزل گوئی کے لئے ہی پیدا کئے گئے تھے۔ جیسے یہ ساری کیفیات و واردات اُن پر گذر چکی تھیں۔ اُن کے آخری دور کا کلام اور خصوصاً وہ

حصہ جہاں انہوں نے قومی مسائل کو اپنی شاعری میں سمیٹا ہے اگر اُن کی غزل گوئی کے مقابلے میں رکھا جائے اور کسی انجان شخص سے کہا جائے کہ شاعری کے یہ دونوں نمونے ایک ہی شخص کے کلک گوہر بار کا نتیجہ ہیں تو شاید وہ کبھی یقین نہیں کرے گا ذرا آپ یہ شعر پڑھئے۔

آپ کے سر کی قسم میرے سوا کوئی نہیں ۔۔۔ بے تکلف آیئے کمرے میں تنہائی تو ہے

اور پھر یہ شعر دیکھئے۔

شوق لیلائے سول سروس نے اُس مجنوں کو ۔۔۔ اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلوں کو!

کیا ان دونوں شعروں میں کسی حیثیت اور کسی اعتبار سے کوئی بھی علاقہ ہے؟ اکبر الہ آبادی کی یہی حیثیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے کہ انہوں نے حسن و عشق کے نغمے بھی سنائے اور قوم کی اصلاح کا ناخوشگوار فرض بھی ادا کیا مگر ہر میدان میں اپنے کمال فن کے نقوش ثبت کر دئے اُن کی غزلیں خواہ ابتدائے جوانی کی کہی ہوئی ہوں یا دم توڑتے ہوئے شباب کے دور کی یکساں طور پر جذبات آفرینی، سادگی وسلاست اور شستگی، زبان کی آئینہ دار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی دور میں اُن کے یہاں معاملہ بندی کی جھلک ملتی ہے مگر اُس میں عامیانہ پن نہیں ہے اکبر کا سخت سے سخت نقاد بھی باوجود تلاش و تحقیق کے اس قسم کے دو چار شعر ہی نکال سکے گا۔

آپ کے سر کی قسم، میرے سوا کوئی نہیں ۔۔۔ بے تکلف آیئے کمرے میں تنہائی تو ہے

مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا نہ صرف یہ کہ کلام میں پختگی آتی گئی۔ بلکہ طرز ادا میں ندرت اور جذبات کے بیان میں حسن بھی پیدا ہوتا گیا۔ خیالات میں وسعت اور

بلندی بھی پیدا ہوتی گئی خیالات و الفاظ کی روانی برجستگی اور بیساختہ پن ہر دور میں قائم رہا۔ اُن کے دوسرے اور پھر تیسرے دور کے کلام سے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں تاکہ اُن کی غزل گوئی کے ارتقا کا پتہ چل سکے۔

ہوں فریبِ ستمِ یار کا قائل اکبرؔ! ۔۔۔ مرتے مرتے نہ کھُلا یہ کہ جفا ہوتی ہے
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا ۔۔۔ بلبل گلِ تصویر پہ شیدا نہیں ہوتی
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام ۔۔۔ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا ۔۔۔ بت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا
اک جھلک اُنکی دیکھ لی تھی کبھی ۔۔۔ وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا
سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا ۔۔۔ اچھا ہوا، مزہ تو محبت کا مل گیا

اکبرؔ نے غزل میں بیان ہونے والے تمام مضامین پر طبع آزمائی کی۔ نہ صرف یہ کہ انہیں چھوا بلکہ اُن کی تہہ میں ڈوب کر ایک سے ایک آبدار موتی نکالے اور غزل کے دامن میں نہایت سلیقے سے سجا دیئے۔ اُن کے یہاں معشوق کے ناز عشق کے نیاز، ہجر کا غم، وصل کی خوشی، نشۂ مے، تلاشِ حق، تصوف اور دنیا کی ناپائداری۔ غرض کیا مجاز اور کیا حقیقت ہر قسم کے جذبات و خیالات کی منہ بولتی تصویریں ملتی ہیں۔ ایسی تصویریں جو اصل کے عین مطابق ہیں۔

غزل گوئی کے بعد طنز و مزاح اکبر کا دوسرا میدان ہے اور بعض طنز و مزاح نقادوں کے خیال میں یہی اُن کا اصل میدان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ طنز و مزاح کے میدان میں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوتے ہیں غزلیں اکبرؔ سے پہلے بھی لکھی گئیں اور اکبر کے بعد بھی اُردو نظم کی تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ اس میدان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جنہوں نے اکبرؔ الہ آبادی سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ مگر جہاں تک طنز و مزاح کا سوال ہے یہ درست ہے کہ وہ

اکبر سے پہلے بھی موجود تھا مگر اُن سے پہلے کسی شاعر نے اُسے مستقلاً کسی صنف کی
حیثیت نہیں دی تھی - اور نہ اُس سے معاشرے کی اصلاح کا کام لیا تھا - اکبر کے بعد بھی
طنز و مزاح سے کام لیا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی کو وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جیسی دستار
اکبر کے سر بندھی - نہ اُن سے پہلے نہ اُن کے بعد - اکبر کی طنزیہ شاعری کئی شعبوں میں تقسیم
کیجا سکتی ہے انہوں نے سیاست کو بھی موضوع بنایا مذہب کو بھی - تمدن و معاشرت کو
بھی اور تعلیم کو بھی نئی روشنی، علوم جدیدہ اور سرسید کی تحریک بھی اُن کے طنزیہ نشتروں
کی زد میں آ گئی - بعض جگہ انہوں نے قدامت پسندی سے کام لیا بعض جگہ کسی قدر ترقی
یافتہ خیالات کا ثبوت دیا اور بعض جگہ بڑی دور اندیشی اور دور بینی سے کام لیا - اس
میں شک نہیں کہ وہ بنیادی طور پر مسلمان تھے اور مسلمان بھی خالص مشرقی اقدار
مشرقی تمدن کے علمبردار - انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی پرانی تہذیب
و تمدن کو مٹتے اور نئی تہذیب اور مغربی تمدن کو جنم لیتے دیکھا تھا - اُن کی پرورش
اور تعلیم و تربیت خالص اسلامی ماحول میں ہوئی تھی - مسلمانوں کی پہلی سی شوکت
و عظمت نہ سہی مگر اُس کے دھندلے سے نقوش انہوں نے ضرور دیکھے تھے - وہ
اُن لوگوں میں سے تھے جو مسلمانوں کو اُن کے شاندار ماضی کی طرف واپس لے
جانا چاہتے تھے - بزرگوں کی تہذیب و تمدن، معاشرت، مذہب اور اُن کے
چھوڑے ہوئے علوم کا ورثہ اکبر کو ہر حال میں عزیز تھا - ان چیزوں کو وہ مسلمانوں
کی میراث سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان انہیں سینے سے لگا کر رکھیں - مگر
حالات بڑی سرعت سے تبدیل ہو رہے تھے - پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں - نئی
قدریں جنم لے رہی تھیں سرسید اسکول کے لوگوں کے نزدیک ہی تہذیب و تمدن اور
مغربی علوم کو اپنانے ہی میں مسلمانوں کی ترقی کا راز مضمر تھا - اس لئے وہ بہت
تیزی سے ان چیزوں کو اختیار کر رہے تھے - نظریات کا یہی تصادم اکبر کی ظریفانہ شاعری

کا محرک بنا۔ اس کو اُن کی شاعری کا پس منظر قرار دینا چاہیئے۔ مگر اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے حریفوں پر چوٹیں کرتے ہوئے معاشرے کی خامیوں پر نشتر زنی کرتے ہوئے۔ لوگوں کو مخالف کیمپ کیطرف جاتے دیکھتے ہوئے جو حربے استعمال کئے اُن میں ابتذال اور پھکڑ کو بالکل راستہ نہیں دیا۔ چوٹیں کیں، بڑی بھرپور، مگر بہت لطیف۔ انہوں نے دل کے پھپھولے پھوڑے، غبار نکالا مگر تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چند شعر دیکھئے۔

فکر ساری کی ہے نہ کنگن کی!!	اب تو دھن ہے اُنہیں فرنگن کی
رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں	کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں	فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز	جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی	اب ہے شمعِ انجمن، پہلے چراغِ خانہ تھی

اکبر کی ظریفانہ شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس صنف میں بھی فن اور اُس کے سارے لوازمات کا پورا خیال رکھا ہے۔ خیالات کی روانی، الفاظ کی بندش زبان کی صفائی، برجستگی اور بے ساختگی کا اتنا ہی اہتمام کیا ہے جتنا اپنی غزلوں میں ان کی ظریفانہ شاعری میں شائید ایک شعر بھی ایسا نہ ہو جو سست کمزور اور ڈھیلا ڈھالا ہو۔ اسطرح انہوں نے ظریفانہ شاعری کا مقام بلند تر کر دیا ہے۔ اور اُسے باوقار بنایا۔

اکبر کی ظریفانہ شاعری کی تیسری قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس میدان میں جو کچھ کہا وہ خالصتاً اُن کے ذہن و فکر کی پیداوار ہے۔ انہوں نے اردو زبان کے دوسرے شعراء کیطرح اپنے پیش رو اُستادانِ فن کے چھوڑے ہوئے ورثہ سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ کیونکہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اکبر سے پہلے اردو زبان کے کسی شاعر نے ان خیالات کیطرف توجہ ہی نہیں کی جنہیں اکبر نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اور اگر کہیں کہیں موضوع بنایا گیا تو انداز بیان اکبر سے بالکل مختلف تھا۔ اکبر کو کسی سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے جو کچھ کہا وہ انہیں کی ذہنی اپج کا نتیجہ تھا۔ اُن کی انفرادیت ان سب پر غالب ہے

اکبر کی ظریفانہ شاعری کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے قافیوں سے بڑا فائدہ اُٹھایا۔ کہیں اردو زبان کے الفاظ اور کہیں انگریزی زبان کے الفاظ کو اس خوبصورتی سے قافیوں میں نظم کیا کہ پورا شعر پڑھنے والے کے دل میں اُترتا چلا گیا۔ دل و دماغ سے نیکر ہونٹوں تک کبھی قہقہوں اور کبھی تبسم کی لہریں رقص کرتی چلی گئیں۔ کچھ شعر دیکھئے:

ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ	اُبھار رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی قم سے آپ
فکر ساری کی ہے نہ کنگن کی ! ! !	اب تو دھن ہے انہیں فرنگن کی :
ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں	کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں
ہجر کی شب یونہی کاٹو بھائیو	اُن کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو
سینے ادھر ایسے کہ سہیں جور رفل بھی	کان اُن کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

اکبر ظریفانہ شاعری کی پانچویں خصوصیت بلاغت اور اشاریت ہے۔ انہوں نے مختلف فرقوں، طبقوں اور مختلف معاشرتوں کا حال بیان کرنے کیلئے اُن کے چند ترجمان منتخب کر لیے ہیں جنہیں اپنی شاعری میں "شیخ"، "برہمن"، "بدھو"، "وفاقی" اور "جمن" وغیرہ وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان مختلف ناموں میں سے ہر نام اپنے پیچھے بہت بڑی دنیا لئے ہوئے اسطرح اُنہوں نے

لے رائفل

صرف ایک لفظ میں پوری کائنات بند کردی ہے۔ یہ اکبرؔ کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی پر دلالت کرتا ہے۔ چند شعر دیکھئے۔

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں ‏ ‏ اک مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

شانِ نمازِ اکبرؔ، شاہانہ ہو چلی ہے ‏ ‏ مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاقی

عقل نے اچھی کہی کل ٹاؤن ہال مجلس رائے سے ‏ ‏ مجھ کو ملنا چاہیئے ہم سب کو ملنا ہے تو آ

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے ‏ ‏ کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

اردو شاعری میں داغ کا مقام

اردو ادب کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لینے سے بھی یہ بات بخوبی واضح ہو جائیگی کہ ہمارے شاعروں میں داغ کی شاعری کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے میں بڑی فیاضی سے کام لیا گیا بعض نقادوں نے اُسے دم توڑتے ہوئے معاشرے کا نمائندہ قرار دیا اسکی عریانی اور بیباکی قابلِ اعتراض ٹھیرائی بعض کے نزدیک اس نے اپنی سختی اور ترش کلامی سے مومن کا لگایا ہوا محبت کا وہ باغ اُجاڑ دیا جسے شبنم سے سینچا گیا تھا اور جس میں بادِ صبا کی سی نرمی اور پھول کی پنکھڑی جیسی لطافت تھی۔ بعض نے اُس کی علمی کم مائیگی کو ہدف بنایا اور بعض نے تو اُس کی ذات پر سے اسطرح نقاب کشائی کی کہ اس کی اندرونی زندگی اور اس کا حسب نسب بھی انتہائی گھناؤنی شکل دکھانے لگا۔ لیکن داغ کیطرف سے مدافعت کرنے والے بھی حیرت اور طرفگی کے نمونے دکھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

داغ کی صحت مندانہ شاعری کے ثبوت میں انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا اُس کی پارسائی کو قدسیوں کیلیئے بھی قابلِ رشک قرار دیا گیا اور متاخرین و معاصرین کے کلام سے اُس کے کلام کا مقابلہ کرکے کلامِ داغ کو حرفِ آخر بتایا گیا۔

تنقید و تنقیص اور مدح سرائی کی اس ہنگامہ آرائی میں بہت کم ایسے تھے جنھوں نے داغ کا صحیح مقام متعین کرتے ہوئے افراط و تفریط دونوں سے دامن بچایا ہو۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو داغ ایک فنکار تھا اور فنکار کی کامیابی کا ایک ہی معیار ہے کہ وہ جس چیز کی تصویر کشی کرے۔ اُس میں اپنی انفرادیت اور فنکارانہ ہوشیاری سے حقیقت کا ایسا رنگ بھردے جسے اصل سے جدا کرتے

وقت قوتِ تجزیہ خستگی محسوس کرنے لگے داغ کا اصل مقام یہی ہے اس سے ہٹ کر وہ کچھ بھی نہیں۔
داغ کی شاعری میں ہجر بھی ہے اور وصال بھی، شیفتگی بھی ہے اور بے نیازی بھی
نیاز مندی بھی ہے اور خودداری بھی، یاس بھی ہے اور شگفتگی بھی غرض ......
وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو اردو شاعری کا سرمایۂ نازش قرار دی جاتی ہیں اور
جو ہمیں داغ سے پہلے اردو شاعری میں بکثرت ملتی ہیں۔ داغ کی خوبی یہ ہے کہ اس
نے پامال چیزوں میں اپنے فنکارانہ کمال سے وہ رنگ آمیزی کی ہے کہ وہ بالکل
نئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس نے جس جذبہ کی ترجمانی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
اسی کی فطرت کا خمیر صرف اسی جذبہ سے تیار کیا گیا تھا۔

اردو شاعری میں یاس و حسرت اور خستگی کا سرمایہ اتنا زیادہ ہے کہ جس کا
ایک جگہ سمیٹنا بھی مشکل ہے۔ ہماری شاعری پہ ایک دور تو ایسا آیا تھا جب وہ سوائے
شکست آرزو کے اور کچھ نہیں تھی۔ میر اس دور کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ میر کی
شاعری اسقدر یاس انگیز کیفیت اور اتنی شدت لیے ہوئے تھی کہ سودا جیسا
پرشوکت شاعر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سودا جو کبھی کہتا
تھا کہ سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت   خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے۔
یوں کہنے لگا۔

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات   اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

میر نے یاسیات کا کوئی موضوع اور کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا تھا جس میں گنجائش
باقی ہو اور جس پر طبع آزمائی کرتے وقت طبع آزمائی کرنے والوں کو اپنی ناکامی
اندیشہ کا دامن گیر نہ ہو۔ مگر جب داغ نے اسی کیفیت کو اپنے اشعار میں سمویا
تو ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس سے پہلے کسی نے اس موضوع کو چھوا تک نہیں
تھا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ بعض شعروں کی کیفیت تو آپ کا احاطہ کرے گی۔

برسوں سے لگ رہی تھی لبِ بام ٹکٹکی ——— تھک تھک کے گر پڑی نگہِ انتظار آج

کرنی پڑیں فراق میں تیمار داریاں ——— ہاتھوں میں ساری رات دلِ ناصبور تھا

رہ رو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے ——— اسمیں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

دل برباد ہی آباد ہوئے عشق و جنوں ——— کوئی بستی نہیں بہتر مرے ویرانے سے

کچھ ترا شوق، کچھ تری حسرت ——— اور رکھا ہی کیا ہے اب ہم میں

دل، کہ ویرانہ ہو گیا بالکل ——— اب بھی ہے تیری آرزو اسمیں

بچھ گئیں سجدے میں مانگی ہیں ——— کوئی اللہ کے سوا نہ ... سنئے

مگر اس رنگ کے شعر داغ کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یاس وحسرت اور نیازمندی داغ کی فطرت میں نام کو نہیں تھی وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک شوخ و شنگ اور بے باک شاعر تھے۔ یاس وحسرت سے اس طبعی بعد کے باوجود انہوں نے جہاں جہاں اس جذبہ کی تصویر کشی کی ہے اُس میں سے کسی ایک جگہ بھی تصنع یا نقالی کا گمان تک نہیں ہوتا ہے۔ داغ کا یہی مقام اور اُن کا سب سے بڑا کمال ہے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ داغ سے پہلے اُردو شاعری کے دفتر کا اچھا خاصہ حصہ رنگِ میرؔ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس جذبہ کی بہتات کا ردعمل بھی ہونا لازمی تھا چنانچہ جرأت اور اُن کے بعد داغ کی شاعری کو میرؔ کی شاعری کا ردِ عمل ہی قرار دینا چاہیئے۔ جرأت نے یاس وحسرت کے خلاف صف آرائی ضرور کی۔ وہ میرؔ کی یاس سے بغاوت کر کے شوخ و شگفتہ اور رنگین خیالات تو نظم کر گئے مگر اُن کے اندازِ بیان میں وہ تیور اور تیکھا پن نہ آسکا جو اُن کے بعد اُنہیں کے گروہ کے شاعر داغ کو نصیب ہوا۔ پھر یہ بات اور بھی غور طلب ہے کہ جرأت کے کلام کا بڑا حصہ عریانی اور سفلی جذبات پر مشتمل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ داغ کا کلام بھی عریانی اور عامیانہ جذبات سے پاک نہیں ہے مگر ان کے یہاں جرأت کے مقابلے میں یہ عناصر نسبتاً کم ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ داغ نے ان جذبات کے اظہار کے لیئے جو زبان اختیار کی ہے وہ انہیں گوارا بنا دیتی ہے۔

غالب کے بعد داغ نے اردو شاعری کو انوکھا انداز بیان اور بہت حسین تیور دئے۔ اس کا وار اس قدر بھرپور ہوتا ہے کہ مدِ مقابل کے لیئے کہیں جائے فرار نہیں رہتی ہے۔ کچھ شعر دیکھئے۔

شریر آنکھ، نگہ بیقرار، چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لیئے

گالیاں غیر کو دیتا ہوں اسکو تم خاموش
میں بھی دیکھوں تو بڑے بات نہ کرنے والے

اس ڈھب سے ملاقات کیا کیجئے کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور

ہم اب سے لیں گے بوسہ گل تیرے سامنے
کیا ایسا لعل ہے ترے لب میں لگا ہوا

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

جا ڈھبی کیا کرو گے مہر و وفا!
بار ہا آزما کے دیکھ لیا

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو
اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

رقیبوں کے ہاتھوں سے محشر کے دن
تمہیں چھین کر میں اگر لے گیا!

نفرت ہے صرف وصل سے اچھا یونہی سہی
لو اور کوئی بات سنو وہ نہیں سہی

داغ کی شاعری کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں کوئی شوخ و طناز بیٹھا ہوا چٹکیاں لے رہا ہے اور وہ بلبلا بلبلا کر انتقاماً دوسروں کے چٹکیاں لے رہا ہے۔ اُس کی شوخی اور ... چھیڑ چھاڑ کی زد سے معشوق کے ساتھ ساتھ شیخ و واعظ بھی تنگ نہ بچ سکے۔ مگر اُس نے میر کی طرح ان بزرگوں کو گالیاں نہیں دیں۔ اردو شاعری میں شیخ و واعظ پر جس قدر

پھبتیاں کہی گئیں ہیں اُن میں غالب اور داغ یہ دو شاعر ہیں جنھوں نے طنز کے بہت لطیف پہلو اختیار کئے ہیں۔ غالب کے شعر

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد — مَے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اور داغ کا یہ شعر

لے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی — عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لئے

شاید اردو شاعری کے طنز و مزاح کا سارا دفتر ان تین شعروں اور خاص طور پر داغ کے شعر کا جواب پیش نہ کر سکے۔

داغ کے چند شعر اور ملاحظہ فرمایئے جو اسی خصوصیت کے حامل ہیں اور دیکھئے کہ اس نے اس طائفہ پر کیسی کیسی بھرپور مگر لطیف چوٹیں کی ہیں۔

مَے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد! — کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

کچھ تذکرۂ عشق رہے حضرتِ ناصح — کانوں کو مزہ دیتی ہے گفتارِ محبت

اتنا تو بتا دے مجھے اے ناصحِ مشفق — دیکھا ہے کہ اُس ماہ لقا کو نہیں دیکھا

کلام داغ کے نقاد داغ پر ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ محبوب کو مخاطب کرتے وقت اُسکا اندازِ تخاطب نامناسب حد تک سخت ہو جاتا ہے۔ اُسنے معشوق کو ایسی جلی کٹی سنائی ہیں جو حسن کی نازک طبیعت پر گراں گذرتی ہیں اس بات کے دو پہلو ہیں۔

اوّل ۔ داغ سے پہلے اور اسکے دور میں بھی دنیائے شاعری میں وہ عاشق سب سے زیادہ سرفراز اور عاشق صادق سمجھا جاتا تھا جو اپنے آپکو معشوق کے قدموں میں گرا دیتا تھا۔ داغ نے عاشقی کی اس رسم کہنہ کے خلاف بغاوت کی

اس نے حسن کا احترام تسلیم کرتے ہوئے عشق کے لئے بھی ایک مقام متعین کیا وہ اپنے آپ کو عشق کے بلند مقام سے گرتا ہوا دیکھنا کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اور غالبؔ کی طرح ؎

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

جب داغؔ حسن کو وفا سے عاری پاتا تھا تو اس کا جذبۂ انتقام مشتعل ہو جاتا تھا اور وہ پکار اٹھتا تھا۔

نہیں ہوتی بندے سے اطاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد و دولت زیادہ!

کیا مٹے گا کوئی حسیں نہ کہیں۔
جی بہل جائے گا کہیں نہ کہیں!

آپ کے سر کی قسم داغؔ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا۔

اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ داغؔ عشق کی دنیا کا بہت تجربہ کار اور "بندۂ آزما" شاعر تھا۔ وہ معشوقوں کی نفسیات سے خوب واقف تھا۔ انہیں راہ پر لگانے کے بہت سے گر جانتا تھا اور غالبؔ کی طرح کبھی کبھی طعنوں سے بھی اپنا کام نکال لیتا تھا۔ محبوب کو اُس کے حسن کی غیرت کا واسطہ دے کر اپنی طرف متوجہ کرنا دنیائے حسن و عشق کی سیاست کا ایک نفسیاتی نکتہ ہے جسے داغؔ بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور اس میں اُس نے اپنی فنکاری کا پورا زور صرف کیا ہے کچھ شعر دیکھئے۔

تم غیر کی تعریف کرو قہر خدا ہے
معشوق کو یوں بندۂ احسان نہیں دیکھا

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں!!
تم نہ ملتے تو دوسرا ہوتا

جاؤ بھی کیا کرو گے مہر و وفا
بارہا آزما کے دیکھ لیا

ہم اب سے لیں گے بوسۂ گل تیرے سامنے
کیا ایسا لعل ہے ترے لب پر لگا ہوا

داغؔ کی تمام خوبیوں اور اُن کی فنکارانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے

اس کی دو خامیوں کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اوّل اس کے ہاں گہرائی بالکل نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے محسوسات کی تہہ میں ڈوب کر نکلتا تو شاید اردو غزل کو ایسے افکار دے جاتا جنہیں حاصل کر کے یہ صنف فلسفے اور عشق کا نہایت حسین اور لطیف امتزاج بن جاتی اور اسکا سہرا داغ کے سر رہتا۔ غالب کے بعد داغ کو دوسرا غالب کہا جاتا اس کی دوسری خامی یہ ہے کہ وہ شکست و ریخت کے دور میں پیدا ہوئے اور اسی دور میں زندگی گذارنے کے باوجود اپنے ماحول کی سسکتی ہوئی آواز۔ محسوس نہیں کر سکا اس نے اپنے دور کے مقتضیات کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ اپنے معاشرے کی نبضوں کو بالکل نہیں ٹٹولا۔ اس کے دور میں اُسکا گرد و پیش انقلاب کے زلزلوں سے کانپتا رہا مگر وہ اپنی راگنی میں گمن رہا۔ داغ کی شاعری میں سوائے ایک شہر آشوب کے اور کوئی ایسی چیز نہیں ملتی ہے جسے دیکھ کر یہ کہا جائے کہ اُسنے وقت کی آواز کی طرف بھی توجہ دی۔ داغ کی یہ کسی خامی ہے جسے اردو ادب کا مؤرخ شاید کبھی معاف نہیں کریگا۔

علامہ اقبال اور اُن کی شاعری

ابتدائی حالات

علامہ اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ آبائی وطن کشمیر تھا آپ کے اجداد کشمیری پنڈتوں کی "سپرو" گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کے والد ماجد نیک سیرت، پاکباز اور صوفی منش انسان تھے۔ اس خاندان کو اسلامی تعلیمات اور تصوف سے بہت گہرا لگاؤ تھا۔

تعلیم و تربیت

سن شعور کو پہنچنے کے بعد علامہ مرحوم کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر کچھ عرصہ مکتب میں پڑھتے رہے۔ اس کے بعد مشن اسکول سیالکوٹ میں داخل کر دیے گئے۔ یہاں شمس العلما علامہ میر حسن جیسے بزرگ اور فاضل زمانہ شفیق اُستاد کے فیض تربیت نے اُن کے جوہروں کو چمکانا شروع کیا۔ علامہ اقبال نے تعلیم کے ابتدائی مرحلے نمایاں اور اعزازی کامیابیوں سے طے کیے۔ چنانچہ پانچویں، آٹھویں اور دسویں جماعتوں کے امتحانات اوّل نمبر میں پاس کیے اور سرکاری وظیفہ کے مستحق قرار پائے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد علامہ مرحوم کو مشن کالج سیالکوٹ میں داخل کر دیا گیا۔ اس کالج میں ایف۔ اے کیا اور بی۔ اے کے امتحان میں آپ انگریزی اور عربی میں اوّل نمبر پر کامیاب ہوئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد آپ نے فلسفہ کے طالب علم کی حیثیت سے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ خوش قسمتی سے آپ کو مسٹر ٹامس آرنلڈ جیسا فاضل اور شفیق اُستاد مل گیا۔ جس نے علامہ اقبال کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اُن کی طرف پوری توجہ کی۔ علامہ اقبال کی خداداد صلاحیت

اور ذہانت اور پروفیسر آرنلڈ کی خاص توجہ کا نتیجہ یوں ظاہر ہیں کہ علامہ مرحوم نے فلسفہ کا امتحان اوّل نمبر میں پاس کر لیا۔

پوزیشن کی روانگی ہر چند کہ علامہ اقبال ایم اے کر چکے تھے۔ اور وہ بھی اوّل نمبر پہ معاش کی طرف سے بھی سکون حاصل ہو گیا تھا۔ کیونکہ آپکی ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہو کر آپ کو ایم۔اے کالج لاہور میں پروفیسر کی جگہ دیدی گئی تھی اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کے منصب پر فائز ہو گئے تھے۔ مگر جن لوگوں کے دماغوں میں بلندی خیالوں میں رفعت اور نظر میں وسعت ہوتی ہے وہ پہلی یا دو چار منزل پر پہونچ کر نہیں بیٹھ رہتے ہیں بلکہ اُن کا عزم بلند انھیں سر گرم کار رہنے پر مجبور رکھتا ہے۔ بالکل یہی حال علامہ اقبال کا تھا۔ فلسفہ میں اوّل نمبر پر ایم اے پاس کر لینے کے بعد بھی اُن کے ذوق تعلیم کی تشنگی باقی رہی چنانچہ آپ مزید تعلیم حاصل کرنیکے لئے ۱۹۰۵ء میں انگلستان تشریف لے گئے۔ اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری لے کر تعلیم کو اوج کمال پر پہونچا دیا۔ دوران قیام یورپ میں آپ نے قانون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اسکے علاوہ لندن اسکول آف پولیٹیکل سائنس سے بھی اس مضمون کی سند لی اس طرح کامیاب کامران ہندوستان واپس آئے۔

مشاغل حیات یورپ سے واپس آکر علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور اپنی اعلیٰ قابلیتوں سے طلبہ کو فیض پہونچاتے رہے۔ مگر اُن کی آزاد طبیعت غلامی کا اور وہ بھی انگریز کی غلامی کا بار برداشت نہ کر سکی اور وہ اٹھارہ ماہ کے بعد مستعفی ہو کر قانون کی پریکٹس کرنے لگے ۱۹۱۳ء کے بعد اپنی علالت کی وجہ سے پریکٹس بھی ترک کر دی۔

سیاسی سرگرمیاں یوں تو علامہ اقبال کی ساری زندگی ملک و ملت کی خدمت میں بسر ہوئی اور اُن کا پیغام محوِ خواب غفلت مسلمانوں کے لئے بانگِ درا کا کام کرتا رہا۔ مگر انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں ۱۹۲۶ء میں قدم رکھا۔ جب وہ پنجاب لیجس لیٹو اسمبلی کی ممبری کیلئے کھڑے ہوئے اور دوٹوں کی بہت بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ کی صدارت کے فرائض انجام دے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے انگلستان تشریف لے گئے۔ اس سلسلے میں فلسطین، روم، قاہرہ اور ہسپانیہ جاکر اسلام کی شوکتِ رفتہ کے کھنڈرات بھی دیکھے ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ والی افغانستان کی دعوت پر افغانستان تشریف لے گئے۔ ہندوستان کی تاریخ سیاست اُن کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کرسکے گی کہ انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے قوم کے سامنے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ جس میں تھوڑے سے اضافہ کے بعد قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی غیر معمولی قابلیت، تدبیر اور قائدانہ صلاحیت سے کام لے کر اُسے عملی جامہ پہنایا۔

وفات ۱۹۳۰ء کے بعد سے علامہ اقبال کی صحت خراب رہتی تھی ابتدا میں آواز بیٹھ گئی، گردے کی تکلیف ہوئی پھر نقرس کی شکایت پیدا ہوگئی کھانسی اور ضعفِ قلب کی تکالیف بھی لاحق ہوگئی اور ۲۱ اپریل کو صبح کے پانچ بجے انکے دل میں ایسا دورہ اُٹھا کہ محبت اسلام میں تڑپنے والا یہ پُرخلوص دل ہمیشہ کیلئے ساکت ہوگیا۔

شخصیت علامہ اقبال اپنے دور کے بہت بڑے فاضل انسان تھے انھیں اردو عربی، فارسی، انگریزی اور جرمن زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ وہ غیر محدود مطالعہ کے مالک تھے۔ قرآن اور حدیث سے بے پناہ عشق تھا۔ اسلام کی محبت اُنکی فطرت کا جزو لاینفک تھا۔ بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مہمانوں سے بہت

خندہ پیشانی سے ملتے تھے - ہر شخص سے اُس کے منصب اور مرتبے کے مطابق گفتگو کرتے تھے - بہت زندہ دل اور بذلہ سنج انسان تھے - اُن کی محفل میں بیٹھنے والے کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے - بہت خود دار اور درویش صفت تھے

تصانیف علامہ اقبال کی اصل حیثیت جس سے انہوں نے حقیقی شہرت حاصل کی اُن کی شاعرانہ حیثیت ہے - انہوں نے اپنے پیغامات کے مندرجہ ذیل مجموعے قوم کی رہنمائی کیلئے چھوڑے ہیں -

اردو نظم - بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم،

فارسی نظم - اسرار خودی، رموز بیخودی، پیام مشرق، زبور عجم، گلشن راز جدید، بندگی نامہ، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (مع مسافر) ارمغان حجاز (اس میں کچھ اردو کلام بھی شامل ہے)

علامہ مرحوم کی اردو، فارسی نظموں کے علاوہ اُن کی نثر کے مندرجہ ذیل قابل قدر کارنامے بھی قابل ذکر ہیں -

اردو نثر - علم الاقتصاد

انگریزی نثر - ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، ایران میں فلسفہ، مابعد الطبیعات کا ارتقا - اسلام کا مذہبی تخیل -

جرمن - تاریخ عالم (غیر مطبوعہ)

شاعری

علامہ اقبال اردو زبان کے اُن چند شعراء میں سے تھے جن کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو نئے خیال، نئی تراکیب، نئے موضوعات اور انداز بیان کے نئے اسلوب ملے - علامہ مرحوم سے پہلے یا اُن کے دور میں ہمیں صرف دو شخصیتیں نظر آتی ہیں

جنھوں نے وقت کی مروجہ شاعری سے ہٹ کر ایک نیا راستہ بنایا۔ یعنی حالیؔ اور اکبرؔ
ان دو بزرگوں کے بعد علامہ اقبال وہ تیسرے شخص تھے جنھوں نے رخ و گیسو اور
کنگھی چوٹی کی شاعری کو خیر باد کہہ کر۔ وقت کے اہم موضوعات منتخب کئے۔ قوم کی
مردہ رگوں میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کی سعی کی۔ اور اپنے پیغام کو ایسے انداز سے
پیش کیا جو آج تک انھیں کے لئے مخصوص ہے۔ علامہ اقبال کے طرز ادا میں بڑی
انفرادیت ہے۔ ان کی یہ خوبی اس قدر واضح ہے کہ آپ خواہ ان کا ایک شعر اردو زبان
کے پچاس شعروں میں شامل کر کے اردو شاعری کے معمولی اور ابتدائی طالب علم کے
سامنے رکھ دیجئے وہ بہ آسانی ان کا شعر انتخاب کر کے آپ کے سامنے رکھ دے گا۔
علامہ نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی لکھیں مگر اس طرح کہ انھوں نے ان کے
قالب کو یکسر بدل ڈالا۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے مولانا حالیؔ، اکبرؔ اور شمس العلماء
مولوی محمد حسین آزاد نے بدلا تھا۔ علامہ مرحوم کی نظمیں اور غزلوں دونوں میں
ان کے مخصوص پیغام کے ساتھ ساتھ۔ بہت درد بہت سوز اور بہت تڑپ ہوتی ہے
اور وہ درد اور سوز و کرب جو ان کے دل کو بیقرار رکھتا تھا۔ وہ اسے اپنے قاری کے
دل میں منتقل کرنے میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

شاعری کے مختلف دور

اردو شاعری میں یاس و امید کی کشمکش اور ہنگامہ آرائی
غالب کے بعد اقبال کے یہاں (ابتدائی دور میں) سب سے
زیادہ ملتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے
سیاسی ماحول کا تغیر و تبدل ہے۔ اقبال کی اردو شاعری کا آغاز بقول سر عبدالقادر
مرحوم ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے ہوتا ہے
یہ دور تمام اسلام اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بہت نازک دور
تھا۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ آخری سنبھالا لے کر کبھی کا خاموش ہو چکا تھا۔

ہندوستان کی دونوں قومیں انگریزی طاقت کے شکنجے میں جکڑی جا چکی تھیں مسلمانوں جو کبھی وارث تخت جم و کئے تھے ایک ایک دانے کو محتاج پھر رہے تھے۔

اقبال جو فطرت کی طرف سے حساس اور دردمند دل لے کر آئے تھے اور جو مسلمانوں کو اس بلندی پر دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کی طرف وہ تیرہ سو برس پہلے روانہ ہوئے تھے۔ اب انہیں تحت الثریٰ کی پستیوں میں دیکھ کر دل شکستہ ہو رہے تھے۔ اقبال کی شاعری کا یہ دور کسی قدر یاس و حسرت لئے ہوئے ہے۔ اس دور میں ان کی شاعری ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے۔ اس دور کی شاعری میں ان کے یہاں اُمید کا تصور بہت دھندلا ہے۔ گوشۂ تنہائی کی تلاش اور میدان عمل سے علیحدگی کے اثرات نمایاں ہیں۔ چنانچہ "بانگِ درا" کی وہ نظم جس کا عنواں "ایک آرزو" ہے ایسے ہی خیالات کی آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب ... کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا ... ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری ... دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گذاروں ... دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

مگر ہنگامۂ شورش سے فرار اور عزلت نشینی کی آرزو کے ساتھ ساتھ اقبال کے یہاں اس دور میں امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی نظر آتی ہے جو آگے چل کر ایک نئی دنیا کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ اسی نظم کا آخری شعر اس خیال کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے ... بیہوش جو پڑے ہیں، شاید انھیں جگا دے

اقبال کا یہ جذبۂ انسان دوستی اُن کی مشہور نظم "تصویر درد" میں پوری طرح اُجاگر ہو جاتا ہے۔ مگر یہیں سے اس جذبہ کی حدبندی شروع ہوتی ہے۔ اور وہ اقبال جو "ایک آرزو" اور "آفتاب صبح" میں تمام انسانوں کا ہمدرد اور

بہی خواہ نظر آتا ہے۔ جو انسانیت کی خراب حالی پر یکساں آنسو بہاتا ہے "تصویر درد" میں صرف اہل وطن کی حالت زار پر اظہار تاسف کرتے ہوئے انھیں بیدار کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو　　کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں　　تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے　　عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال کی شاعری کا یہاں تک مطالعہ کرنے کے بعد ایک قاری کے ذہن میں کچھ اس قسم کا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال اپنے گرد و پیش سے مایوس ہو گئے تھے۔ گو اُن کی فطرت میں بلندی اور انسان دوستی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مگر ماحول میں ان چیزوں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ غالب کی طرح ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

اس دنیا سے دور ــــ کسی ایسی دنیا کی تلاش میں تھے۔ جہاں شور و شر و ہنگامہ ہُو، نہ مختلف قوموں کی باہمی چپقلش ہو، نہ مذہبی آویزش ہو۔ یہ تو ماحول کا اثر تھا۔ جو ہر فطری شاعر پر پڑتا ہے۔ مگر اقبال ایسا صاف اور آئینے کی طرح روشن قلب لے کر آئے تھے جس پر راستے کے موڑ سے کچھ اُس طرف کا بھی عکس پڑتا تھا۔ یاس اور ناامیدی کی ہر تاریک وادی کے بعد انھیں اُمید کا ایک دھندلا سا دیا بھی نظر آتا تھا۔ جسے وہ اپنی رہنمائی کا منتظر پاتے تھے۔ یہاں پہونچ کر اقبال کی وہ پہلی کیفیت ختم ہو جاتی تھی اور وہ بہ طرز نو انسانیت کو اپنا حیات افزا پیغام دیتے تھے ابتدا میں اُن کا پیغام دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والے انسانوں کے لئے تھا۔

مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا اقبال کے تجربات اور مشاہدات کی دنیا وسیع ہوتی گئی۔ انھیں محسوس ہوتا گیا کہ انسانیت کی سب سے زیادہ دردناک آواز ہندوستان سے اٹھ رہی ہے۔ سمندر کے لیٹرے خشکی پہ چڑھ دوڑے ہیں اور مادر وطن ان کے قدموں تلے کراہ رہی ہے۔ اقبال کا یہی احساس "تصویر درد" کا محرک ہوا۔ اور انہوں نے ہندوستان میں بسنے والی تمام قوموں کو ایک رشتہ یعنی رشتہ اخوت میں منسلک ہونے کی تلقین کی۔ بالکل اسی طرح جیسے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اور قائد اعظم محمد علی جناح (ابتدا میں) نے بھی کوشش کی تھی۔ اقبال کے خیال میں بھی مادر وطن کی حفاظت کے لئے اس کے تمام سپوتوں کا متحد ہو جانا ایک ناقابل تسخیر قلعہ بنانے کے مترادف تھا۔ اس ناقابل تسخیر قلعہ کی بنیاد انہوں نے "نیا شوالہ" لکھ کر قائم کی۔ یہ وہ منزل تھی۔ جہاں پہونچ کر انسان دوست اقبال وطن دوست اقبال بن گیا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

آ غیرت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس کے بعد اقبال کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ دور ۱۹۰۵ء سے

۱۹۰۸ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ زمانہ ان کے قیام انگلستان کا ہے۔ اس دور میں اقبال کی شاعری ایک نیا موڑ مڑتی ہے۔ اس دور میں وطن کی محبت پر اسلام کی محبت پر اسلام کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہی اقبال جو "نیا شوالہ" بنا کر پر امید ہو گیا تھا کہ آزادی کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ اب شیخ و برہمن مل کر امن و آشتی کے گیت گائیں گے۔۔۔ ہند کے برہمنوں کی روش دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں اور بہت دکھے ہوئے دل سے پکار اٹھتے ہیں۔

اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کے گیت آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانوں کے لئے

اس دور میں آکر اقبال کو احساس ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے فرقہ پرست رہنما ملک و قوم کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ ایک ڈھونگ ہے ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگال کے بعد اس کی تنسیخ کے ہنگاموں نے اقبال کو یہ نظریہ قائم کرنے پر مجبور کیا کہ برادران وطن کی نیتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ چنانچہ اب ان کی شاعری کا موضوع "نیا شوالہ" کی بجائے "وہی کہنہ حرم" قرار پایا۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

اقبال کے موضوع شاعری کی تبدیلی میں ہندوستان کی سیاسی کشمکش کے علاوہ چند اور باتیں بھی شریک ہیں۔ انگلستان کے زمانہ قیام میں اقبال کو برطانوی سیاست کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یورپ میں بیٹھ کر انہوں نے انگریزوں کی شاطرانہ چالیں دیکھیں اور اسلامی سلطنتوں پر یورپی اقوام اور خصوصاً انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا جائزہ لیا۔ یورپ میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے کھنڈرات دیکھ کر ان کی اسلامی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور وطن دوست اقبال اب اسلام دوست اقبال کی اس دور کی شاعری میں مشرق و مغرب کی کشمکش

اور اسلامی تہذیب و تمدن سے شیفتگی کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ چنانچہ "عبدالقادر کے نام" ایک نظم میں یہ عناصر کافی نمایاں ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

اس دور میں اقبال کی شاعری ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے۔ اس میں غم و الم اور سوز و گداز ہے۔ اس دور میں اقبال تہذیب اسلامی کے عزادار نظر آتے ہیں "طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" اور "صقلیہ" میں اقبال کا جذبۂ اسلام دوستی ایک خلش، ایک چبھن اور ایک کسک . . . لئے ہوئے ہے۔ مگر اس دور میں اقبال صرف نالہ و فریاد پر اکتفا نہیں کرتے ہیں۔ اسلامی اصولوں اور اسلام کے نظام حیات کا گہرا مطالعہ کرنے اور اسلامی کردار کی روح کو ٹٹولنے کے بعد اقبال کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو گئی تھی کہ دنیا کے تمام نظام آپس میں ٹکرا ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے صرف اسلام کا نظام ہی ایسا نظام ہے جو دنیا کی صحیح رہنمائی کرے گا۔ اور اسے حقیقی آزادی عطا کر دے گا۔ امید و یقین کی اس منزل میں پہونچ کر اقبال نے کہا۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اقبال اپنی شاعری کے تیسرے دور میں جو اُن کی وفات تک قائم رہا۔ خالص اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی نظام حیات کے داعی و نقیب رہے ہے۔ اس دور میں اُن کی چند نظموں کے سوا باقی تمام نظمیں کسی آنے والے دور کا اعلان کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر عہد نو کی آمد کے اس اعلان میں بھی اقبال کے یہاں یاس و امید کی کشمکش اور ہنگامہ آرائی پورے زور شور سے موجود ہے۔ یہ دور جنگ عظیم اول سے کچھ بعد کا دور ہے اس دور میں مسلمان حکومتیں اپنی خود غرضی و نااتفاقی کی وجہ سے ایک ایک کر کے یورپی طاقتوں کا شکار ہو رہی تھیں۔ مغرب مشرق پر پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ اقبال کی اس دور کی نظموں میں کچھ اس قسم کے اثرات ملتے ہیں۔

غرۂ شوال

دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر ہماری آج ناداری بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ اُن کی گرفتاری بھی دیکھ

بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی [illegible] ہو
امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری [illegible] دیکھ

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی عبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

شمع اور شاعر

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر اُن کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں ناامیدِ نورِ ایمن ہو گئیں

یہ تو تھے حال کے اثرات جو اقبال نے ماحول سے قبول کئے۔ لیکن جیسا کہ سطور مندرجہ

باب میں عرض کیا جا چکا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطالعہ کی بناء پر اقبال کو بحیثیت قوم مسلمانوں کا مستقبل روشن نظر آیا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ مغربی طاقتوں سے زک اٹھا کر مسلمان بھی اپنی پہلی اور موجودہ حالت کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔ اور اسلامی اخوت کی طرف قدم بڑھانے لگے تھے۔ مسلمانوں کے اسی سوچ اور فکری ٹھیراؤ نے اقبال سے کہلوایا۔

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی — ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی
مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز — بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیمایان ہند! — پھر سلیمیٰ کی نظر دیتی ہے پیغام خروش

اور

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی۔
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک — بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود — پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

کلام حسرت موہانی کی بعض خصوصیات

گزشتہ صدی کے آخری دور تک ہماری شاعری پر مایوسی کے بادل اور قنوطیت کے گھنیرے اندھیارے بُری طرح چھائے ہوئے تھے۔ وہ شمع جسے ولی کی شیریں کلامی غالب کی عظمت فکر اور مومن کی رنگینی بیان نے روشن کیا تھا یاس کے تند و تیز جھونکوں سے بجھنے لگی تھی۔ اسی کی وجہ مغلیہ سلطنت کے انحطاط میں تلاش کی جائے یا انگریزی سلطنت کے اقتدار میں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ یاس اور قنوطیت ہماری شاعری کا مزاج ثانی بن چکی تھی اور شاید اسی کے رد عمل کے طور پر قلندر بخش جرأت اور ان کے بعض معاصرین نے اور آگے چل کر امیر اور داغ نے اس قنوطیت سے بغاوت کی حسرت موہانی بھی انھیں باغی شعراء میں ہیں۔

حسرت کا تمام کاروبار شعر کاروبار عشق تک محدود ہے۔ عشق بھی وہ جو ایک گوشت پوست کے انسان کو دوسرے گوشت پوست کے انسان سے ہوتا ہے حسرت نے عشق کیا ہو یا نہ کیا ہو یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر حسرت کی غزلوں کا مطالعہ کرنے والا ضرور اس منزل پر پہونچ جاتا ہے۔ جہاں حسرت ایک تجربہ کار خوش باش اور کامیاب عاشق معلوم ہوتے ہیں۔ یہی اُن کا کمال اور سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ حسرت سے پہلے ہمیں دو قسم کا عشق ملتا تھا۔ ایک نالہ و شیون کا اور دوسرا رندی و شاہد بازی کا۔ ایک ہر وقت روتا اور منہ بسورتا رہتا تھا اور دوسرا سر محفل کھل کھیلتا تھا۔ ایک فلک ناہنجار کو کوستا تھا۔ اور دوسرا معشوق کے جسم عریاں سے حظ اٹھاتا تھا۔ یعنی ایک میر کا عشق اور دوسرا جرأت کا۔ اور یہ دونوں قسم کے عشق متاخرین کے دور تک قائم رہے میر کے عشق کو غالب نے فکر کا لباس پہنایا اور اسکے فلسفہ غم کو عظمت بخشی۔ جرأت کے عشق

کو داغ نے ہوسناکی کا لباس پہنایا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ سستا اور بازاری بنا دیا حسرت کا عشق بھی جرأت و داغ ہی کی قسم کا ہے۔ مگر ان سے بہت مختلف حسرت بھی ایک گوشت پوست کے انسان سے محبت کرتے ہیں اور جرأت و داغ بھی۔ مگر حسرت بے باک ہیں۔ ہوس کار نہیں۔ اور جرأت و داغ پھکڑ اور نرے ہوس کار۔ حسرت بیباکی کی حد سے تجاوز کرنے کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے ہیں۔

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتہً

اور دوپٹہ سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

پڑی تھیں بزم رقیباں میں تم پہ کیا اُفتاد
کہ بات بھی نہیں تم سے بنائی جاتی ہے

مگر جرأت و داغ کم سے کم جو کہتے ہیں وہ یہ ہے۔

شب خواب میں جو اُسکے دہن سے دہن لگا
کھلتے ہی آنکھ کانپنے سارا بدن لگا

بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرت شوق
آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھئے

کچھ جھائیاں ہمیں نظر آتی ہیں خیر ہے!
رکھا ہے تم نے غیر کے زانو پہ گال کیا جرأت؟

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

(داغ)

جرأت و داغ اور اس قبیل کے تمام شعرا کے یہاں یہ بازاری عشق اور نارواچھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع سے آخر تک ملتا ہے۔ مادی یا جسمانی عشق میں معشوق سے اظہار تمنا کرتے وقت رکاکت اور ابتذال کا آجانا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے عاشق اپنے محبوب کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات حد سے اس قدر تجاوز کر جاتا ہے کہ عام حالات میں اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر جیسا متقی اور عابد شب زندہ دار بھی جب اس کے کوچے میں آتا ہے تو اس قدر عریاں ہو جاتا ہے۔

کہتا ہے اُن سے آئینہ صبح شبِ وصال
ہے ہے یہ رات بھر میں تری شکل کیا ہوئی

ایک سے ایک حسینوں میں ہے اچھا لیکن
ہتّے چڑھ جائے جو اپنے وہی مال اچھا ہے

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

امیر اُبھرا جو وہ جوبن پتہ دل کا ملا مجھکو
یہی دونوں اُچکے چور تھے چوری یہیں نکلی

جوبن اُبھار پر ہے چمن کو نہ جائیے
بادِ صبا لگائیگی چوری انار کی

لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اس قسم کے ماحول میں آنکھ کھولنے والا حسرت جو مادی عشق کرتا ہے محبوب کے جسم کی پرستش کرتا ہے مگر ان آلودگیوں سے کس طرح دامن بچا جاتا ہے۔ حسرت کے سارے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کا سخت سے سخت نقاد بھی صرف ایک یا دو جگہ حسرت پر انگشت نمائی کر سکے گا۔ اور ان میں سے ایک مقام یہ ہے۔

حائل جو بیچ میں تھی رعنائی تمام شب
اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

دل خوب جانتا ہے کہ تم کس خیال سے
کرتے رہے عدو کی برائی تمام شب

پھر شام ہی سے کیوں دہ پلے تھے چھپڑا کے ہاتھ
دکھتی رہی جواں کی کائی تمام شب

لیکن اگر غالب کے یہ عریاں شعر ؎

لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگمان ہو جائیگا

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے   کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اُس کی عظمت کو کم نہیں کر سکتے ہیں تو حسرتؔ کے ان چند شعروں کی بنا پر ان پر بھی ہوسناکی اور رکاکت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا اور نہ اُن کی شاعرانہ عظمت پر حرف آسکتا ہے۔ کیونکہ اُن کی تمام تر عظمت اسی میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے مشرق کی عام شاعری سے ہٹ کر ایک ایسا راستہ اختیار کیا ہے۔ جس میں کانٹے کم اور پھول زیادہ ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حسرتؔ کی شاعری میں صرف قہقہے ہی قہقہے ہیں۔ یا انھوں نے تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھا ہے۔ نہیں اُن کے یہاں قہقہوں کے ساتھ ساتھ آنسو بھی ملتے ہیں۔ مگر بے موقع اور بلا ضرورت نہیں۔ مگر یہ آنسو نہیں نقال اور مصنوعی عاشق کے آنسو نہیں بلکہ ایک درد مند اور پُر خلوص عاشق کے آنسو جو ضبط کی انتہائی کوشش کے بعد فطرتِ انسانی سے مجبور ہو کر بہتے ہیں اور اس طرح کہ دیکھنے والا انہیں اپنے آنسو سمجھتا ہے۔ حسرتؔ کا یہ احساس غم بہت گہرا ہے "اصلیت" کا پرتو لئے ہوئے ہے۔ وہ فانی کی طرح ہمیں موت اور گورِ کفن کے مناظر دکھا کر مایوسی کے دامن میں نہیں لے جاتے ہیں۔ ان کے غم میں گہرائی ہے، خلش ہے، چبھن ہے، مگر اس کے باوجود شگفتگی اور نکھار بھی ہے اور ایک ایسی کیفیت ہے جسے "نشتریت" کہنا زیادہ صحیح ہے   نتیجہ ہے ان کی داخلی اور خارجی کیفیات کے امتزاج کا۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آرزو تیری برقرار رہے
دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا!
تم جفا کار تھے کرم نہ کیا
میں وفادار تھا خفا نہ ہوا

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا
وہ وضعِ پارسا اس کی وہ عشقِ پاکباز اس کا

شرحِ بے مہریٔ احباب کہوں کیا حسرت
رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہونچا کتا

اتنا تو آتا ہے بھی جی میں کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت!
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

عرض کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے

پھر کہئے کس اُمید پہ ہم زندگی کریں
جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجئے

حسرت کی دوسری خصوصیت جسے ان کی شاعری کی جان کہنا چاہیئے احساس کی شدت یا تجربہ کی گہرائی ہے۔ جس کی فراوانی نے انہیں مجسّم احساس بنا دیا ہے۔ حسرت بھی محسوس کرتے ہیں اور ان کے ہمعصر اصغر گونڈوی بھی مگر حسرت اور اصغر میں فرق یہ ہے کہ حسرت کا احساس لطیف اور نازک ہونے کے ساتھ ساتھ شدید بھی ہے۔ مگر اصغر کا احساس لطیف اور نازک تو ہے شدید نہیں۔ شدت کی اسی کمی نے انہیں گرمیِ جذبات سے محروم کر دیا ان کے یہاں رنگینیِ خیال تو ہے مگر وہ آگ نہیں جس کے شرارے حسرت کے دل میں پوشیدہ ہیں۔ اور یہ کمی اتنی بڑی کمی ہے جو شاعر کو اپنے ماحول اور گرد و پیش سے علیحدہ کر کے خیالی دنیا کا شاعر بنا دیتی ہے۔ جہاں اُس کا تو گذر ہو سکتا ہے مگر دوسروں کا نہیں اسی شدتِ احساس نے حسرت کو خیالی دُنیا میں جانے سے بچا لیا۔ اور وہ اس دنیا کے شاعر ہو گئے جس کے مومن اور نسیم دہلوی تھے۔ مگر حسرت کا احساس بعض جگہ مومن اور نسیم کے مقابلے میں زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اُس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اس میں اک شان فراغت بھی ہے راحت کے سوا

سب سے شوخی ہے اک یہیں سے حیا!
اے فریب نگاہ یار یہ کیا؟

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

نگاہ ناز بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے
تغافل ہائے پیدا میں، نوازش ہائے پنہاں میں

شب وہی شب ہے دن وہی دن ہیں
جو تری یاد میں گذر جائیں

حسرت کی تیسری خصوصیت انداز بیان کی دلکشی ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جس نے داغ کو ہوسناک اور پھکڑ ہونے کے باوجود کامیاب اور مقبول شاعر بنا دیا۔ بات کتنی ہی اچھی ہو لیکن انداز بیان میں دلکشی اور تنوع نہ ہو تو وہ مسجد کے مولوی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے۔ موجودہ دور کے عظیم شاعر اقبال کی مقبولیت اور عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ اگر خیالات کی بے باکی اور ندرت کے ساتھ ساتھ ان کی طرز ادا میں شگفتگی اور دلکشی نہ ہوتی تو ان کی کامیابی میں شبہ تھا۔ اسی طرح اگر حسرت کے انداز بیان میں بھی وہ تیکھاپن اور تنوع نہ ہوتا جو انہیں مومن، نسیم اور تسلیم کے تتبع سے حاصل ہوا تو ان کے شعر کا وار اس قدر بھرپور نہ ہوتا۔ حسرت کی یہ خصوصیت ان کے کلام میں قدم قدم پر ملتی ہے اور بعض شعر تو اس خصوصیت کا حسین مرقع ہیں۔ کچھ شعر دیکھئے۔

بے تابیاں ہیں عام کہ اس حسن شوخ نے
دنیا سے محو صبر کا مضمون کر دیا!

کب یہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے گنہگار نہیں
ہاں مگر اتنی جفا کے بھی سزاوار نہیں

نہ سہی آپ جفا سے جو نہیں باز آتے
جائیے جائیے اب ہم کو بھی اصرار نہیں

لطف کر لطف اے سراپا ناز
تجھ پہ رنگینیٔ بہار نثار
ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریٔ دل
التفات انکی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا!
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
دفورِ اشکِ پیہم سے ہجومِ شوقِ بیحد سے
مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری

حسرت کی چوتھی خصوصیت مشاہدے کی گہرائی ہے۔ اور یہ خصوصیت بھی انکی دوسری خصوصیات کی طرح بہت گہری اور نمایاں ہے اور ان کی شاعری کے خدوخال سمجھنے میں بہت ممد ثابت ہوئی ہے۔ ان کی یہ قوتِ مشاہدہ جس نے ترقی کی آخری منزل طے کرکے "تصویر گری" کا مقام حاصل کرلیا ہے۔ ماہرینِ فنونِ لطیفہ کے اس قول کی پوری طرح تصدیق کرتی ہے کہ شاعری تمام فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ لطیف اور نازک فن ہے "شاعری کو مصوری پر اسی لیئے ترجیح دی جاتی ہے کہ مصور اور اس کا نقش محتاج ہے مناظر کا، اشیاء کا، صفحہ قرطاس کا، قلم اور موٹے قلم کا، مختلف رنگوں اور ان کے امتزاج کا اور یہ ساری چیزیں مادی مرئی اور بآسانی دستیاب ہو جانیوالی ہیں۔ مگر شاعری نام ہے احساس کی شدت، مشاہدے کی گہرائی، تجربہ کے نکھار اور انداز بیان کی شگفتگی کے حسین امتزاج کا اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک چیز بھی مادی یا مرئی نہیں ہے مصور کا نقش اس وقت تک زندہ ہے جب تک ہمارے سامنے ہے یا صفحہ کاغذ پر محفوظ ہے۔ اور صفحہ کاغذ کی زندگی ظاہر ہے کہ کتنی عارضی اور کتنی ناپائیدار ہے۔ مگر شعر زندہ رہے گا اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک ہم زندہ ہیں یہی وجہ ہے کہ آج سے ہزار برس پہلے کی بنائی ہوئی تصویر کا دستیاب ہونا ناممکن ہے۔ اور اگر انتہائی تلاش و کاوش کے بعد مل گئی بھی تو کسی عجائب گھر میں۔ بوسیدہ حالت میں کہ اسکا حسن ضائع ہو چکا ہوگا۔ رنگ اڑ چکا ہوگا۔ مگر آج سے ہزاروں سال پہلے کا شعر بآسانی دستیاب ہو سکتا ہے۔ ہر صاحب

فوق کے دماغ میں اسی حسن و رنگ اور آب و تاب کے ساتھ جس حسن و رنگ اور آب و تاب کے ساتھ اس وقت تھا۔ جب ذہن شاعر نے اُسے تخلیق کیا تھا شاعری اور مصوری کی اس لمبی چوڑی بحث میں اُلجھ جانے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حسرت کی شاعری کا وہ رُخ جسے تصویر گیری سے موسوم کیا گیا ہے اس قابل ہے کہ اُسے مصوری کا ہم پایہ یا اس سے اونچا کہا جا سکے۔ صرف ایک مثال سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ حسرت کتنے اونچے درجے کے مصور تھے۔

کیا کیجئے بیاں اس تن نازک کی حقیقت
خوشبو میں ہے "گل بو" تو لطافت میں ہے "شب رنگ"

ایک کامیاب مصور حسن کا انتہائی دل آویز مرقع تو تیار کر سکتا ہے۔ وہ رنگوں کے امتزاج کے ساتھ اسکی رعنائی اور برنائی کی ایک کامیاب تصویر تو کھینچ سکتا ہے موئے قلم کی جنبش سے اس میں لطافت و نزاکت تو پیدا کر سکتا ہے۔ مگر کیا وہ "گل بو" اور "شب رنگ" کی تصویر بنا دینے پر بھی قادر ہے یہی وہ مقام ہے جہاں مصور کا قلم ٹوٹ جاتا ہے اور شاعر کا ذہن اپنی پوری رعنائی کے ساتھ حرکت میں آتا ہے اور احساس کی رہنمائی میں حسن کا وہ کامیاب اور زندہ شاہکار بنا دیتا ہے کہ ع

نقش کو اپنے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہے

اسی خصوصیت کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں

رعنائی پیرہن ہوئی خوبیِ جسم تازہ تن
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

پیرہن اسکا سادہ و رنگین
یا عکس مے سے شیشہ گلابی

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے!

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے۔

وہ جھ سے کھلیں کیا کہ تکرار اٹھ نہیں سکتی
محجوب ہیں پیمائش داماں میں لگے ہیں

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی ! مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

وہ شرماۓ بیٹھے ہیں گردن جھکاۓ غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا

حسرت کی پانچویں خصوصیت انکی غزلوں میں تسلسل اور تاثر کی یکسانیت ہے مخالفین غزل کیطرف سے بڑی شدت سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ غزل کے اشعار مختلف النوع تاثر کے حامل ہوتے ہیں۔ایک شعر جو فضا قائم کرتا ہے دوسرا اسے ختم کر دیتا ہے۔اور اسطرح سامع کے ذہن اور احساس کو ہر شعر یا چند شعروں کے بعد ایک ناگوار دھچکا لگتا ہے۔قطع نظر اس سے کہ غزل میں تسلسل یا تاثر کا نہ پایا جانا اپنی جگہ عیب ہے یا نہیں۔اگر ہم متقدمین اور متاخرین کی غزلوں کا ایک سرسری جائزہ بھی لیں تو ہم بہت سے شعرا کی غزلوں میں تسلسل ملے گا میر کی غزلوں میں وہ تسلسل نہ سہی جسکی مخالفین غزل توقع رکھتے ہیں۔لیکن ان کی اکثر غزلوں میں چند شعروں کے بعد ایسے شعر ضرور ملتے ہیں جو آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں۔اور جنہیں میر نے اپنی کلیات میں قطعوں کا نام دیا ہے۔

مثال کے طور پر کلیات میر کی پہلی غزل کا یہ مشہور قطعہ۔

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آگیا ! یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

تاثر کی یکسانیت کی بہترین مثال ہے میر کے بعد اس تسلسل کا ارتقا شروع ہوتا چنانچہ یہ ارتقاء بہادر شاہ ظفر کی غزلوں میں نمایاں شکل اختیار کر لیتا ہے ظفر کی وہ مشہور غزل جسکا مطلع یہ ہے۔

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا۔

یا ان کی دوسری غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

اسی تسلسل کی ارتقائی صورتیں ہیں۔ ظفر کے علاوہ یہ ارتقاء غالب کی غزلوں میں
بھی ملتا ہے۔ اُن کے یہاں تو اس ارتقاء نے ایک مستقل عنوان کی حیثیت قائم کرلی
ہے۔ دیوانِ غالب میں ایک دو نہیں بلکہ بہت سی غزلیں ہیں جن کے مطلعوں کو ان
غزلوں کا عنوان کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ ان غزلوں کے مطلع جس مفہوم کا اعلان
کرتے ہیں بقیہ شعر اس مفہوم پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ باعتبار معنی ہر شعر دوسرے
سے پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل مطلعوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائیگی

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

غالب کے بعد ان کے شاگرد حالی اور حالی کے معصر مولانا محمد حسین آزاد کی
غزلوں میں بھی ہمیں کسی حد تک تسلسل نظر آتا ہے۔ چنانچہ حالی کی دو غزلوں کے یہ مطلعے

کاٹنے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح — جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ — ہے زمیں اُنکی الگ اور آسماں سب سے الگ

اور مولانا آزاد کی دو غزلوں کے یہ مطلعے

چاک چاک اپنا گریباں غم میں تھا سو ہوا — ٹکڑے ٹکڑے کبھی داماں نہ ہوا تھا سو ہوا
لایا ہے رنگ آبِ رُخ بوستاں نیا — گلشن نیا ہے باغ نیا، باغباں نیا

اُسی تسلسل کا پتہ دیتے ہیں جس کی ابتداء میر[1] اور اُن کے بعض ہم عصروں نے کی
تھی۔ اور جس نے غالب کی غزلوں میں مستقل عنوان کی شکل اختیار کرلی تھی۔ مگر
غالب کے بعد تسلسل کا یہ ارتقا کچھ رک سا گیا ہے۔ حالی اور آزاد کی جن غزلوں کا
ذکر کیا جا چکا ہے۔ اول تو اُن میں سے اکثر کو غزلوں کا نام دینا ہی غلط ہے کیوں کہ
ان میں سے تقریباً ہر غزل تغزل سے عاری اور غزل کی کیفیت سے یکسر خارج ہے

[1] میر سے پہلے ولی کے یہاں بھی تاثر کی یکسانیت کے کچھ نمونے ملتے ہیں (ایجام)

البتہ حالی کی بعض غزلیں ضرور ایسی ہیں جن میں تغزل بھی ہے اور تسلسل بھی مگر اُن کے یہاں بھی ایسی غزلیں شاید دو تین سے زیادہ نہ ہوں۔ آزاد اور حالی کے علاوہ اُنکے ہم عصروں میں سے کسی کے یہاں بھی یہ تسلسل نہیں پایا جاتا۔ اس لیئے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کے بعد یہ تسلسل قریب قریب ختم ہوگیا تھا۔ حالی اور آزاد کے بعد جن الشعراء کا کلام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ ان میں سے حسرت ہی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اس تسلسل کو دوبارہ قائم کیا۔ حسرت کی غزلوں میں نہ صرف تسلسل پایا جاتا ہے بلکہ اس تسلسل نے ایک علیحدہ صنف کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اُن کی غزلیں ایک ایسی فضا قائم کردیتی ہے جسمیں حسن و عشق کے کردار ایک ایک کرکے ایک ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے سے گذرنے لگتے ہیں اور ہم کدو کاوش اور ناہمواری محسوس کئے بغیر شاعر کی داستان عشق بہت آسانی سے مرتب کرسکتے ہیں۔ آپ حسرت کی یہ غزل پڑھیئے۔

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہوجایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہوجایئے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجئے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہوجایئے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجئے کچھ جواب
دیکھ لیجئے اور تغافل آشنا ہوجایئے

مجھ سے تنہائی میں گر ملیئے تو دیجئے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہوجایئے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر کج ادا ہوجایئے

جی میں آتا ہے کہ اُس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملیئے پھر کبھی اور بے وفا ہوجایئے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اُس سراپا ناز سے کیونکہ خفا ہوجایئے

اور دیکھیئے کہ مطلع نے جو مفہوم ظاہر کیا ہے کیا باقی شعروں نے اس کی وضاحت نہیں کردی ہے اور کیا آخری شعر کسی نتیجہ پر نہیں پہونچاتا ہے۔ دراصل یہی تو وہ خصوصیت تھی جسے غالب نے ایک مستقل صنف بنانے کی کوشش کی تھی مگر

مگر جان کے جانشینوں کے ہاتھوں پوری طرح پروان نہ چڑھ سکی اور جسے حسرت نے منتہائے کمال پہ پہونچا دیا۔ حسرت کے یہاں اس خصوصیات کی حامل ایک دو نہیں بلکہ بےشمار غزلیں ملتی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے غالب کے چھوڑے ہوئے کام کو مکمل کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

حسرت کی ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ اُن کی ایک "خامی" کیطرف بھی توجہ دلائے بغیر تنقید و تبصرہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور وہ "خامی" انکے یہاں فکر اور گہرائی کی کمی ہے۔ خامی کا لفظ اس لیئے استعمال کیا گیا ہے کہ بعض فاضل نقاد اسے اُنکی خامی قرار دیتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ اُنکی شاعری میں فکر اور گہرائی ناپید ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سطحی معاملات میں گفتگو کی ہے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر شخص کا ایک میدان ہوتا ہے اور اُسی میدان میں وہ اپنے جوہر دکھا سکتا ہے۔ جب اس میدان سے نکل کر وہ دوسری وادی میں قدم رکھتا ہے تو اسکی طاقتیں جواب دے دیتی ہیں۔ حسرت جس دنیا کے آدمی تھے انہوں نے اس دنیا کی باتیں کی۔ بلکہ اسے تو اُن کی ہوش مندی کہنا چاہیئے کہ انہوں نے اس کوچے میں قدم ہی نہیں رکھا جسمیں گامزن ہونے کے بعد وہ اپنے نقادوں کے اعتراضات اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے۔ انہوں نے حسن صورت اور اسکے متعلقات کو بہت قریب سے دیکھا اور فلسفہ کی بھول بھلیوں میں پڑے بغیر نہائیت سادگی اور بے تکلفی سے اُسکا اظہار کر دیا۔ یہی اُن کا کمال اور اُن کی خوبی تھی اور اس پہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

تاریخِ نظمِ اردو

نظم اُردو کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور امیر خسرو سے شروع ہوکر محمد قلی قطب شاہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا دور ولی سے شروع ہوکر شاہ حاتم پر ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرا دور میر و سودا سے لیکر ناسخ و آتش تک پھیلا ہوا ہے اور چوتھا دور ذوق و غالب سے لیکر انیس تک ...... اور پانچواں دور امیر و داغ سے لیکر موجودہ عہد تک شمار ہوتا ہے۔ اب ان میں ہر دور کی مختصر سرگذشت سُن لیجے۔

پہلا دور امیر خسرو کو اُردو زبان کا پہلا شاعر اور اُن کے دور کو نظم اردو کا پہلا دور کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جدید تحقیق کے مطابق امیر خسرو سے پہلے کسی اُردو شاعر کا سراغ نہیں ملتا۔ امیر خسرو پٹیالی ضلع ایٹہ (یوپی) کے رہنے والے ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے اور حضرت نظام الدین اولیاء کے منظورِ نظر مریدوں میں سے تھے۔ عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کے عالم اور فارسی زبان کے قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو شاعری کا آغاز کیا اُس زمانے میں اردو زبان بالکل ابتدائی دور سے گذر رہی تھی علماء فضلا کی علمی زبان فارسی تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان میں جو شعر کہے ان پر فارسی کا اتنا غلبہ تھا کہ ایک مصرعہ فارسی زبان میں اور دوسرا اردو زبان میں تھا بعض شعروں کے مصرعہ آدھے فارسی اور آدھے اردو میں ہوتے تھے مثال کے طور اُن کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں درازچوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اسکے علاوہ انہوں نے بہت سی پہلیاں، انمل اور کہہ مکرنیاں بھی لکھیں چند آپ بھی دیکھئے۔

اک سجن موراَمن للچاوے ۔ مُنہ چومے اور بات بناوے
ہونٹھن لاگ سبھی رنگ کھینچا ۔ اے سکھی ساجن نہ سکھی نیچا!

انمل:-

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا ۔ آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اسی دور میں کچھ اور شعراء بھی ملتے ہیں جن میں کبیر داس افضل جھنجھانوی تلسی داس اور میر جعفر زٹلی قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے کبیر داس اور تلسی داس کی شاعری میں اُس دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے زبان کی کافی ترقی کے نشانات ملتے ہیں اور ان دونوں بزرگ شاعروں کے یہاں درد تاثر اور کسک بھی پائی جاتی ہے جس سے اُن کی انسانی ہمدردی اور معاشرت پر تنقید کا بھی سراغ ملتا ہے چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ماٹی کہے کمہار کوں، تو کیا موندے موہیں ۔ اک دن ایسا ہوئیگا میں روندوں گی توہیں
مسافر ہے جنہوں نے دل لگایا ۔ انہوں نے سب جنم رو تے گنوایا (افضل)
مایا کو مایا ملے کر لمبے لمبے ہاتھ ۔ اور تلسی گریب کی کوئی نہ پوچھے بات (تلسی داس)
گیا اخلاص عالم سے، عجب یہ دور آیا ہے ۔ ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں بیچ وفاداری ۔ محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹھ میں کھوئی ۔ اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

جعفر زٹلی شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں تھے۔ مگر اس کے باوجود اُن کے
کلام میں نیاپن پایا جاتا ہے چنانچہ اُن کے مندرجہ بالا مطلع کی زبان الفاظ کا انتخاب اور
اور اُس کے مخصوص مزاج میں موجودہ دور سے بھی تھوڑا ہی سا فرق نظر آتا ہے
البتہ چونکہ اُسوقت تک اردو شاعری ردیف و قوافی اور الفاظ کے قواعد مرتب نہیں
ہوئے تھے اس لئے اس قسم کی خامیاں ضرور موجود ہیں۔ چنانچہ جعفر زٹلی کی مندرجہ
بالا نظم میں جو انہوں نے اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اُس دور کی طوائف الملوکی
سے متاثر ہو کر کہی تھی قافیے سرے سے ندارد ہیں صرف ردیف پر اکتفا کی گئی ہے۔
دوسرے شعر میں لفظ "تمجانیوں" کا الف وزن سے زیادہ ہے تیسرے شعر میں عمر کی
میم متحرک نظم کی ہے۔ ان نقائص کے علاوہ جو ابتدائی دور سے تعلق رکھنے کی وجہ
سے نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں۔ زٹلی کی یہ نظم واقعات کے بیان، محاکات اور اپنے
تاثر کے اعتبار سے اس دور کو دیکھتے ہوئے بہت اونچی اور قابل قدر نظم ہے۔ اور سب سے
اہم بات یہ ہے کہ وہ ہزل گو تھے مگر حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے واقعاتی نظم
کہی جو اُن کی حقیقت نگاری کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور ہمیں بتاتی ہے کہ اردو
شاعری کے پہلے دور میں بھی وقت کے اہم موضوعات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔
ان لوگوں کے بعد دکن کے فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نام آتا ہے سلطان
اپنے دور کا بہت بڑا شاعر تھا جس کی نظموں اور غزلوں کا کلیات ہمارے
سامنے ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان
شاعر تھا۔ سلطان محمد قلی کے یہاں نسبتاً بہت رنگینی اور حلاوت ہے اس
کی وجہ اُسکی رنگین مزاجی اور شاہد بازی ہے جسکا اندازہ اس کا کلیات
دیکھنے سے ہوتا ہے اُس نے اپنے کلیات میں اپنی بہت سی منظورِ نظر عورتوں
کا پیاریوں کے نام سے ذکر کیا ہے اور اُن میں سے ہر ایک کے حسن و جمال

کی تعریف کی ہے۔ چونکہ وہ ایک مطلق العنان فرماں روا تھا حسن و جمال کا شیدا راگ و رنگ کا دلدادہ ۔ اور اُن چیزوں کے حصول کیلئے اُسے کسی قسم کی دقت بھی پیش نہیں آتی تھی یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں یاس و حسرت، حزن و ملال اور رنج و اندوہ کا عنصر برائے نام ہے۔ سلطان محمد قلی کے یہاں غزل کے ساتھ موسموں میلوں اور حالات واقعات پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ اسلیے یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ اُس نے اردو شاعری کو موضوع کے اعتبار سے وسعت دینے میں بہت نمایاں کام کیا۔ سلطان موصوف کے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں تاکہ اُس کے رنگ کا اندازہ ہو سکے۔

امیداں باغ میں تجہ کوں لگے ہیں تازہ میوے ~~~ شکر کر میوے کھا کہ توں پیا وطن اپنے تو تھی دل سوں لگا ہے

قطب شہ بندہ گنہگار اب آ ہے[1] ~~~ سب کر دیاراں دی ہو گا ثواب

سلطان محمد قلی کے زمانے میں اور اُس کے قریب کے عہد میں چند اور شعراء کے نام بھی ملتے ہیں جن میں سے احمد دکنی، غواصی، قطبی، جنیدی، سلطان عبداللہ، ابن نشاطی، امین اور فضلی وغیرہ قابل ذکر لوگ ہیں۔ انکی شاعری کے رنگ الفاظ کے انتخاب اور اسلوب بیان میں محمد قلی سے زیادہ فرق نظر نہیں آتا ہے۔ ان لوگوں نے مثنویات اور مذہبی پند و وعظ پر مشتمل نظمیں لکھیں حسن و عشق کی داستانیں بھی نظم کیں اور فارسی سے منظوم ترجمے بھی کئے جن میں سے قطبی کی مثنوی تحفۃ النصائح، جنیدی کی مثنوی ماہ پیکر اور لطیف کا ظفر نامہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دوسرا دور نظم اُردو کا دوسرا دور ولی دکنی اور اُن کے معاصرین پر مشتمل ہے۔ ولی دکن کے مشہور شہر اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اُس وقت شمالی ہندوستان پر محمد شاہ رنگیلے کی برائے نام حکومت تھی۔ مگر اُن کے ابتدائی زمانے میں اورنگ زیب

[1] اس شعر کے متعلق شک ہو کہ یہ کہیں محمد قلی کے بھتیجے سلطان قطب شاہ کا تو نہیں ہے۔ (پیام)

سریر آرائے حکومت تھا وہ دوبارہ دہلی گئے۔ پہلی بار اورنگ زیب کے زمانے میں اور دوسری بار محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں۔ ولی کو اردو زبان کا پہلا شاعر قرار دینا چاہئیے اسلیئے کہ اس نے اس زبان میں غزل لکھی جو موجودہ زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی اور امیر خسرو اور محمد قلی قطب شاہ وغیرہم کی زبان سے بہت مختلف تھی۔

ولی سے پہلے اردو شاعری اور اردو زبان پر دکنی، برج بھاشا، ہندی اور سنسکرت کے اثرات غالب تھے۔ ولی پہلا شاعر ہے جس نے بحیثیتِ مجموعی اردو زبان اور اردو شاعری پر سے ان زبانوں کے اثرات زائل کئے اور بہت صاف شستہ اور شیریں زبان میں محبت کے رسیلے نغمے چھیڑے، سلاست، روانی اور سادگی ولی کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں انہوں نے فارسی کے سبک اور ہلکے پھلکے الفاظ بھی اردو شاعری میں داخل کئے۔ اور ہندی، برج بھاشا، دکنی اور فارسی کے مشکل بھونڈے اور بھدے الفاظ کو خارج کیا۔ ان کے بعض شعر تو اردو شاعری کے موجودہ رنگ (زبان کے اعتبار سے) سے بہت حد تک ملتے جلتے ہیں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

دل ہوا ہے مرا خراب سخن   دیکھ کر حسن بے حجاب سخن
بزم معنی میں سرخوشی ہے اُسے — جس کو ہے نشۂ شراب سخن

شوخ آتا نہیں ہزار افسوس   مکھ دکھاتا نہیں ہزار افسوس
مطرب نغمہ سازِ محفلِ عشق — تان گاتا نہیں ہزار افسوس

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہونگا   جادو ہے ترے نین غزالاں سوں کہونگا
زخمی کیا ہے دل تری پلکاں کی انی نے   یو زخم ترا خنجر و پیکاں سوں کہوں گا

ولی کے معاصرین میں سراج اورنگ آبادی، عزلت اور عاجز خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان میں سے سراج اورنگ آبادی سب سے زیادہ مشہور ہوئے اور ان کی شاعری کو سب سے زیادہ بقائے دوام حاصل ہوئی۔ سراج کی شاعری ایک دکھے ہوئے دل کی پکار معلوم ہوتی ہے۔ درد و غم سوز و گداز

اور تاثر جسقدر اُن کی شاعری میں ہے اُن کے معاصرین بلکہ اُن سے پہلے کے دور میں بھی نظر نہیں آتا۔ سراج کی زبان بھی نسبتاً صاف اور زیادہ ترقی یافتہ ہے دلی کے بعد وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ اُن کی مشہور غزل کے دو شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا	مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی	نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

شرف الدین مضمون، شاہ مبارک آبرو، سراج الدین علی خان آرزو، شاکر ناجی، غلام مصطفیٰ خان یکرنگ، مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ ظہور الدین حاتم بھی اسی دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دور میں بھی اُردو شاعری میں کسی حد تک انقلاب آیا۔ ہندی اور دکنی آمیز الفاظ، کوں، ہوں، آنجھو اور "یو" وغیرہ متروک ہو گئے اور اُن کی جگہ، کو، سو، آنسو اور یہ استعمال کئے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ مبالغہ بھی پیدا ہو گیا۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا	صبر ایوب کیا گریہ یعقوب کیا

(صفتِ ایہام)

کرے ہے دار کو کامل بھی سرتاج	ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

(تجنیسِ مرکب)

مفت سودا ہے ارے یار کہا جاتا ہے	آمرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے

(اشرف علی خاں فغاں)

دریائے اشک اپنا جب سر برابر مارے	طوفانِ نوح بیٹھا گوشے میں موج مارے

(سراج الدین علی خاں آرزو)

تیسرا دور نظم اُردو کے تیسرے دور میں میر و سودا اور ان کے معاصرین شامل ہیں

یہ دور اُردو شاعری کا حقیقی دور تھا۔ یہی دور تھا جس میں اُردو زبان اور شاعری تجربات کی بھٹی میں پڑنے کے بعد کندن بن کر نکلی۔ زبان نہایت سلیس اور شستہ بیان نہایت دلکش اور متنوع۔ موضوعات میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی۔ بات کہنے کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کئے گئے۔ غزل کے ساتھ ساتھ مثنویاں، قصیدے، قطعات اور رُباعیاں بھی لکھی گئیں اور یہ سب نئے رنگ میں اس نئی زبان اور نئی اُردو شاعری کا ابوالآبا میر تقی میر تھا جس نے اُردو شاعری کو اُس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں وہ آج بھی جلوہ گر ہے۔ اُردو شاعری کا موجودہ دور گو موضوعات کے اعتبار سے بہت آگے بڑھ گیا ہے مگر الفاظ کی ہیئت، اسلوب نگارش اور زبان و بیان کے اعتبار سے آج بھی میر کے خرمن کی خوشہ چینی کر رہا ہے۔ اور موجودہ شعرا میں مثلاً اثر لکھنوی، ابن انشاء اور ناصر کاظمی خاص طور سے میر کی زبان اور اسلوب نگارش کی بھی تقلید کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر اور اُس کا دور اُردو شاعری کی تاریخ میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اب میر کے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت ۔۔۔ اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ۔۔۔ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا!

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ۔۔۔ دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

لگ میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے ۔۔۔ کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر ۔۔۔ بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

میر کے ہم عصر سودا نے بھی اُردو نظم کو گوہر ہائے گراں بہا سے مالا مال کیا۔ اگر میر نے اُردو غزل کو نازک آبگینہ عطا کیا۔ دردمندی اور دلسوزی سے روشناس کیا سادگی اور خلوص دیا تو سودا نے شوکتِ الفاظ بلندیٔ خیال زورِ بیان اور بندش

الفاظ کے کمالات دکھا کر تاریخ نظمِ اردو کی قابلِ قدر خدمت انجام دی اور اردو شاعری کا دامن اپنے بلند پایہ قصائد سے مالا مال کیا۔ میر درد نے تصوف کے مضامین بیان کرکے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا۔ اسرار و معارف کے دریا بہائے اور پاکیزہ غزل گوئی کے اچھوتے شاہکار پیش کئے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

(سودا)

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

(سودا)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(درد)

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

(درد)

اسی عہد کے لوگوں میں بقا، میر ضاحک، میر فاخر مسکیں اور میر سوز کا نام بھی قابلِ ذکر ہے ان میں سے میر سوز زبان کی حلاوت، سادگی اور "بے تکلف پن" کے لئے مشہور تھے۔ اس دور میں قصائد اور ہجویات کا بھی بہت زور تھا میر نے بھی قصائد لکھے اور سودا نے بھی مگر میر اپنی خودداری، کا استغنا اور دل شکستگی کی وجہ سے اس میدان میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ البتہ ذوق کے قصائد کا چمن خوب پھلا پھولا وہ اپنے زورِ بیان شوکتِ الفاظ، ندرتِ خیال اور جدتِ تشابیہ کی وجہ سے جن کی اس میدان میں ضرورت ہوتی ہے۔ نہ صرف کامیاب رہے بلکہ اردو زبان کے قصیدوں کو معراجِ کمال پہ پہونچا کر انہیں فارسی قصائد کا ہم پلّہ بنا دیا۔ میر نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ مثنویات کیطرف بھی توجہ کی۔

گو اُردو شاعری کے پہلے دور میں دکن کے شعراء نے مثنویاں لکھیں مگر اُن میں سے بیشتر غیر زبانوں کے تراجم پر مشتمل ہیں۔ پھر یہ کہ چونکہ دورِ اوّل سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے اُن میں وہ لذت اور دلکشی نہیں ہے جسے موجودہ دور کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ میر تقی میرؔ وہ پہلا شاعر ہے جس نے مثنویوں کے قابلِ ذکر اور قابلِ قدر سرمائے کو اُردو شاعری میں داخل کیا۔ انہوں نے چھوٹی بڑی بتیس ۳۲ مثنویاں لکھیں جن میں سے مثنوی "شعلۂ عشق" اور "دریائے عشق" بہت مشہور ہوئیں۔ باوجودیکہ میرؔ کے سامنے مثنویات کا کوئی قابلِ ذکر ذخیرہ نہیں تھا جو اُن کی رہنمائی کرتا مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پھر بھی انہوں نے اس صنف میں حیرت انگیز کمال حاصل کیا۔ ان کی مثنویوں کے بہت سے شعر آج تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں یہ اُن کی کامیابی کی بہت بڑی دلیل ہے۔

شاعر:

مندرجہ بالا لوگوں کے بعد اس دور کے قابلِ ذکر شعراء میں قلندر بخش جراتؔ، شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشاء اللہ خاں انشاءؔ، میر حسنؔ، انعام اللہ خاں یقینؔ، حکیم ثناء اللہ فراقؔ، میر شیر علی افسوسؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ شامل ہیں۔ اُردو شاعری کا یہ دور جسے یہاں تیسرے دور سے موسوم کیا گیا ہے تاریخِ نظم اُردو میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہی دور ہے جس میں اُردو زبان و ادب کے باکمال شعرا پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی گلکاریوں سے چمن اردو کو گلہائے رنگ رنگ سے مالا مال کر دیا۔ ایک طرف جراتؔ نے زبان کو شوخی اور بیباکی عطا کی تو دوسری طرف مصحفیؔ اور ناسخؔ نے زبان کو صاف کیا۔ بھونڈے اور نامانوس الفاظ کو ترک کیا۔ انشاءؔ نے مزاح کی چاشنی داخل کی۔ یقینؔ کی بلندی پرواز عطا کی۔ میر حسنؔ نے مثنوی کے کوچے میں قدم رکھ کر اسے منتہائے کمال کو پہونچا دیا۔ اُن کے بعد دیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی "گلزارِ نسیم"۔۔ ان مثنویوں کی وجہ سے اُردو شاعری میں

میں بعض ایسے شعر داخل ہو گئے جو رہتی دنیا تک خراجِ تحسین وصول کرتے رہیں گے
ان مثنویوں کا کمال یہ ہے کہ بظاہر تو یہ معاملاتِ حُسن و عشق پر مشتمل قصے کہانیاں ہیں
مگر درحقیقت ان نظموں میں ان شاعروں نے شاعرانہ کمال اور فن کی چابکدستی سے
کام لیکر مناظرِ قدرت، طرزِ معاشرت، مخصوص طبقوں کی اصطلاحیں، زبان کی
شگفتگی اور بیان کی دل آویزی کے فنکارانہ مظاہرے کئے ہیں۔

چوتھا دور نظمِ اُردو کا چوتھا دور غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، نواب مصطفیٰ خاں
شیفتہ اور اُن کے معاصرین پر مشتمل ہے۔ اس دور میں اُردو
شاعری ترقی کی معراج پر پہونچ چکی تھی۔ ذوقؔ اپنے زورِ بیان اور شوکتِ الفاظ
سے اسے قوت و شوکت عطا کر رہا تھا۔ روزمرہ اور محاورے نظم کر کے اسے بول
چال کی شاعری بنا رہا تھا۔ غالبؔ اپنی بلندیٔ پرواز، ندرتِ خیال اور حکمت
و دانش کے اسرار و رموز بیان کر کے اسے گہرائی اور آفاقیت عطا کر رہا تھا۔ اس
دور میں ہماری نظم ہجر و وصال کی لذتوں سے کچھ آگے بڑھ گئی تھی۔ اسے غالبؔ
جیسا نکتہ سنج شاعر مل گیا تھا جس نے اپنی نکتہ آفرینیوں سے اس میں نئے نئے مضامین
داخل کئے۔ اسے طنز و مزاح عطا کیا۔ تصوف، اخلاقیات، استغنا، خودداری اور
فطرت شناسی کے مضامین سے روشناس کر کے اُردو شاعری کو قابلِ قدر اور
دنیا کی ترقی یافتہ اصنافِ نظم میں لا کر کھڑا کیا۔ ان سب پر اُس کی دردمندی
خلوص اور انفرادیت مستزاد ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجیے

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

دیوارِ بارِ منتِ مزدور سے ہے خم ۔۔۔ اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ۔۔۔ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے

اس دور کے قابلِ ذکر لوگوں میں انیس اور دبیر بھی شامل ہیں۔ ان دونوں باکمال شاعروں نے مرثیے لکھ کر اُردو نظم کو وسعت عطا کی اور اپنے نقطہ نظر سے مذہب کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی بھی ناقابلِ فراموش خدمت کر گئے۔ مرثیہ کی صنف انیس اور دبیر سے پہلے بھی موجود تھی چنانچہ دکن سے اس کی ابتدا ہو چکی تھی پھر میر اور سودا نے بھی مرثیے لکھے۔ میر ضاحک اور میر حسن سے بھی کچھ مرثیے منسوب ہیں۔ میر خلیق اور میر ضمیر کے ہاتھوں مرثیے نے کسی قدر ترقی کی مگر دبیر اور اُن سے زیادہ انیس نے اُسے معراجِ کمال پر پہونچا دیا۔ حضرت امام حسین کے واقعۂ شہادت کے ساتھ ساتھ صبح کا منظر، گرمی کی شدت، پیاس، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، میدانِ جنگ کا نقشہ غرض مرثیے کے ذریعے خود اُردو شاعری میں نئے نئے موضوع داخل کر کے اس کی وسعت میں اضافہ کیا۔ میر انیس کے مرثیے خاص طور پر قوتِ ایجاد و اختراع زورِ بیان اور شوکتِ الفاظ کے اعتبار سے اُردو زبان و ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں اور اُردو نظم کے دفتر میں بہت بڑا اضافہ قرار دئے جاتے ہیں۔

پانچواں دور نظم اُردو کا پانچواں دور امیر و داغ سے شروع ہوتا ہے سید ضامن علی جلال، شیخ امیر اللہ تسلیم، خواجہ الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ اقبال، اسماعیل میرٹھی، علامہ شبلی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، مولانا محمد علی جوہر، ریاض خیر آبادی اور حسرت موہانی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر تین شعرا داغ، امیر اور جلال نے غزل کی نوک پلک درست کرنے زبان اور محاورے

کی صحت اور فن عروض کے اعتبار سے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ داغ نے زبان و بیان کے اعتبار سے غزل کو نئے تیور دئے۔ ان کے یہاں ایسے شعروں کی کمی نہیں ہے جن میں گفتگو کا ایسا انداز ہے مثلاً

غیر جاتا تھا وہاں، میں نے یہ کہہ کر روکا
تجھ سے کچھ جان نہ پہچان کہاں جاتا ہے!

اُن کے یہاں شوخی معاملہ بندی، زبان اور محاورے کا تو لطف ہے مگر فلسفہ و منطق اور حکمت کے اسرار و رموز نہیں ہیں۔ وہ یکسر شاہد دنیا کے شاعر تھے اُنکی شاعری زندگی، جوانی، رنگینی اور رعنائی کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتی ہے انہوں نے غزل کو اُس کے لغوی معنی دیئے اور اُسکی مکمل تصویر پیش کیں۔ چند شعر دیکھئے۔

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

امیر کا رنگ شاعری بھی داغ سے علیحدہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا پہلا رنگ یعنی لکھنوی رنگ چھوڑ کر داغ کی پیروی کی اور اُسمیں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ وہ داغ کے مقابلے میں بہت بڑے فاضل انسان تھے فن اور عروض پر داغ سے کہیں زیادہ عبور رکھتے تھے اس لئے اُن کا کلام داغ کے مقابلے میں اغلاط سے پاک ہے اُن کی زبان بہت منجھی ہوئی ہے۔ اُنھوں نے محاوروں اور الفاظ کی صحت کا بہت خیال رکھا ہے مگر ان کے یہاں داغ کی غزل کے تیور اور زبان کا وہ لطف نہیں ہے چند شعر دیکھئے۔

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کمسن کے لئے

فصل گل آئی ہے یوں ہم تم ملیں اے گلبدن
جیسے کلیاں نکلی ہیں شاخوں سے سر جوڑے ہوئے

رتبہ شہید عشق کا گر حاصل جائیے
قربان ہو ہو کے قربان جائیے

مگر اُن کے یہاں ایسے شعر کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی داغ کی تقلید میں۔ البتہ انھوں نے نعت گوئی میں بہت بلند مرتبہ حاصل کیا۔ محسن کاکوروی۔ حالی، بیان یزدانی، اور مولانا ظفر علی خاں یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اردو زبان میں نعت گوئی کو ایک مکمل صنف کی حیثیت دی اور اسے منتہائے کمال پر پہونچا دیا۔ امیر و داغ اور جلال کے بعد اُن کے شاگردوں نے بھی اُردو شاعری میں قابل قدر اضافے کیئے۔ چنانچہ امیر کے شاگردوں میں ریاض خیرآبادی جلیل مانکپوری اور دل شاہجہانپوری نے داغ کے شاگردوں میں علامہ اقبال، احسن مارہروی بے خود دہلوی، نوح ناروی جگر مرادآبادی، سیاب اکبرآبادی اور رسا رامپوری نے بہت شہرت حاصل کی ریاض نے اُردو شاعری میں خمریات پر بعض لازوال شعر داخل کیئے شاعری کو زندگی جوانی اور زندہ دلی سے ہمکنار کیا، جلیل نے نہایت صاف ستھری زبان استعمال کی، دل شاہجہانپوری نے غزل کو پاکیزگی سنجیدگی اور گہرائی ودیعت کی، علامہ اقبال نے اُردو شاعری میں نئے نئے مضامین کا اضافہ کیا، اسے زلف و رخسار کے پھندے سے نکال کر زندگی کے موڑ پہ لا کھڑا کیا، وقت کے اہم تقاضوں سے روشناس کیا ملک و ملت کی خدمت کرنے کا ذریعہ بنایا اور انسانیت و عالم اسلام کو اپنا حیات آفریں پیغام دیا۔ اُنھوں نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی ایسے اسکول کی جس سے موجودہ دور کے ہر شاعر نے درس حیات لیا۔ علامہ اقبال کی قومی و ملی نظمیں آج ہر شخص کی زبان پہ ہیں۔ علامہ اقبال نے اردو شاعری میں جو نیا راستہ اختیار کیا اسکی بنیاد حالی اور اکبر نے رکھی تھی۔ حالی ابتدا میں اسی پرانی غزل گوئی کے علمبردار تھے مگر سر سید احمد خاں کی تحریک پر انھوں نے "مسدس اسلام" لکھ کر اپنے بعد آنے والے شعراء کے لیئے ایک نیا راستہ بنایا۔ اکبر آلہ آبادی بھی کچھ عرصے تک غزل کے میدان میں اپنے جوہر دکھاتے رہے مگر وقت کے تقاضوں، نئے

حالات، نیا ماحول اور نئی نئی تحریکات سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی اپنا رنگ بدل
دیا اور طنز و مزاح کے نشتروں میں قوم کو درس حیات دینے لگے۔ شیخ امیر اللہ تسلیم
کے شاگردوں میں سے مولانا حسرت موہانی آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑتی
ہوئی غزل کو زندگی کی رعنائیاں عطا کر دیں۔ حسرت کی غزل پرانی اور نئی
شاعری کی درمیانی کڑی ہے ان کے یہاں دونوں کا بہت لطیف امتزاج ہے
انھوں نے حسن اور اس کے متعلقات کو بہت قریب سے دیکھا اور بہت
دلنشین اور دلکش انداز سے بیان کیا۔ ان کے علاوہ اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی
فانی بدایونی اور سیماب نے بھی اردو غزل کو اپنے خونِ جگر کی آمیزش سے
زندہ رکھنے کی کوشش کی۔

جدید شاعری

علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، شبلی نعمانی اور جوش ملیح آبادی
ان چار شاعروں نے ایک جدید اسکول کی بنیاد ڈالی جو بہت
کچھ حالی اور اکبر کی کوششوں کا مرہون منت تھا۔ سبق آموز نظمیں واقعاتی
شاعری، حقیقت نگاری اور وقت کے اہم موضوعات اس جدید شاعری کے
بنیادی اجزاء تھے۔ یہیں سے ترقی پسندانہ شاعری کی ابتداء ہوئی۔ سرمایہ و محنت
کی کشمکش اور طبقاتی جنگ سے متاثر ہو کر علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز
فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، مخدوم محی الدین
اور احسان دانش وغیرہ نے مزدوروں کی ترجمانی کی اور ملک و ملت کی دکھتی ہوئی
رگ پر ہاتھ رکھ کر وہ اہم فریضہ انجام دیا جسے انجام دئے بغیر اردو نظم کی
تاریخ نا مکمل رہتی اور ہم اسے دنیا کی ترقی یافتہ اصنافِ ادب میں پیش کرنے سے
قاصر رہتے۔ یہ موضوع تشنہ رہ جائے گا اگر عظمت اللہ خاں اور حفیظ جالندھری کا ذکر نہ کیا
جائے۔ عظمت اللہ خاں نے اپنے میٹھے اور رسیلے بولوں سے اردو نظم کو حلاوت عطا کی

اردو زبان میں گیت لکھ کر ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا حفیظ نے بھی چھوٹی اور مترنم بحروں میں گیت لکھے اس کے علاوہ اور بھی زندگی آمیز نظمیں لکھیں اور خصوصاً شاہنامہ اسلام لکھ کر اردو نظم کے موضوعات میں ایک اور موضوع کا اضافہ کیا۔ آرزو لکھنوی نے خالص اردو الفاظ استعمال کر کے غزل میں ایجاد و اختراع کا باغ لگایا۔ عربی فارسی کے مشکل الفاظ کی جگہ ہندی کے آسان اور سبک الفاظ داخل کئے اختر شیرانی نے رومانی نظمیں لکھیں اور اردو شاعری میں پہلی بار معشوق کو عورت کے لباس میں پیش کیا۔

ہمارے موجودہ شاعر ہمارے موجودہ شاعروں میں اثر لکھنوی، رضا علی وحشت، فراق گورکھپوری، ماہر القادری، عبد المجید عدم، سیف الدین سیف، حفیظ ہوشیار پوری، احمد ندیم قاسمی، عارف عبد المتین، عابد صوفی تبسم، رضا ہمدانی، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، ناصر کاظمی، شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، عظیم قریشی، جگناتھ آزاد وغیرہ اردو نظم کی تاریخ میں بیش از بیش اضافے کر رہے ہیں ان لوگوں کے ہاتھوں غزل اور نظم دونوں میں انقلاب آ رہا ہے اور یہ انقلاب خوش آئندہ ہے۔

لہ راقم الحروف کے خیال میں حفیظ کا شاہنامہ شاعرانہ اور فنی اعتبار سے کوئی بلند اور قابل قدر کوشش نہیں ہے۔ اور نہ یہ ان کا شاعرانہ مرتبہ متعین کرتا ہے۔ البتہ ان کے گیت اور دوسری نظمیں ضرور قابل تعریف ہیں۔

تاریخِ نثرِ اُردو

اُردو نثر کی تاریخ بھی نظم کی طرح دکن ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی ابتداء عربی و فارسی نثر کی کتابوں کے ترجمے سے ہوئی جو پند و نصائح مذہبی رسالوں اور چھوٹی چھوٹی کتابوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے شیخ عین الدین اور حضرت خواجہ گیسو دراز کی کتابیں اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ "معراج العاشقین" (مصنفہ حضرت خواجہ گیسو دراز) اور "حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے تصنیف کا ترجمہ "نشاط العشق" اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ اس کے بعد شاہ برہان الدین جانم نے "جل ترنگ" اور "گل باس نامی" کتابیں لکھیں۔ وجہی نے "سب رس" لکھ کر اردو نثر کی تاریخ میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ "سب رس" ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے اس کے بعد ۱۷۳۲ء میں فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "روضۃ الشہداء" کا ترجمہ کیا۔ میر محمد عطا حسین تحسین نے امیر خسرو کی شہرہ آفاق فارسی زبان کی کتاب "قصہ چہار درویش" کو "نوطرز مرصع" کے نام سے اردو نثر کے قالب میں ڈھالا۔

اگر اس دور کو نثر اُردو کا پہلا دور کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس دور میں طبع زاد تصانیف کی طرف توجہ نہیں کی گئی صرف ترجموں پر اکتفا کی گئی۔ جو کتابیں دکن میں ترجمہ کی گئیں اُن میں دکنی الفاظ کی کثرت ہے۔ اور جو شمالی ہندوستان میں ترجمہ کی گئیں اُن میں ہندی سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ بکثرت شامل ہیں میر محمد عطا حسین تحسین کی "نوطرز مرصع" میں فارسی اور عربی زبانوں کے مشکل الفاظ کی بھرمار ہے۔ ان تصانیف کی عبارتیں مقفیٰ اور مسجع ہیں جن کا سمجھنا ہر شخص

کے بس کی بات نہیں ہے۔

دوسرا دور نثر اردو کا دوسرا دور فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شروع ہوتا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام بہت عرصے سے ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس میں وہ اپنا کاروباری دفتری اور حکومت کا کام انجام دے سکیں اور اس زبان کو ہر طبقے میں یکساں طور پر سمجھا جا سکے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے اردو زبان کو منتخب کیا اور اس کی ترویج و ترقی میں مصروف ہو گئے اور اسے تصنیفی زبان بنانے کے لئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ ۱۸۰۰ء میں، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، مرزا علی لطف اور للو جی لال جیسے اہل قلم نے اردو نثر کی لازوال کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ میر امن کی باغ و بہار ترجمہ قصہ چہار درویش "باغ اردو" ترجمہ "گلستان" (مصنفہ شیخ سعدی) اور ۱۸۰۶ء میں "آرائش محفل" تصنیف کی ان کتابوں کے علاوہ میر بہادر علی حسینی نے ۱۸۱۶ء میں مسٹر گلکرسٹ کی قواعد اردو کا خلاصہ لکھا اور آسام کی تاریخ بھی تصنیف کی سید حیدر بخش حیدری نے ۱۸۰۱ء میں "قصۂ مہر و ماہ" لکھا اس قصہ نے بہت مقبولیت حاصل کی اور مسٹر گلکرسٹ نے انھیں فورٹ ولیم میں بلا لیا جہاں انھوں نے امیر خسرو کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" اور ۱۸۰۱ء میں سید محمد قادری کے طوطی نامے کا ترجمہ "طوطا کہانی" کے نام سے کیا۔ ایک اور کتاب "آرائش محفل" کے نام سے تصنیف کی جس میں حاتم طائی کی کہانی لکھی۔ "بہار دانش" مصنفہ شیخ عنایت اللہ کا ترجمہ جو گلزار دانش" کے نام سے مشہور ہے۔ حیدری ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ۱۸۰۵ء میں نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر" کا جواب بھی حیدر بخش حیدری ہی نے لکھا۔ مرزا کاظم علی جواں نے ۱۸۰۱ء میں کالی داس کے مشہور ناٹک شکنتلا"

کا بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔ قرآن شریف کو بھی اردو کا لباس پہنایا۔ بہمنی خاندان کی تاریخ لکھی "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ کیا۔ ہندو مسلمانوں کے تہواروں اور ہندوستان کے موسموں پر بھی ۱۸۱۲ء میں "دستور ہند" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ نہال چند لاہوری نے فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شیخ عزت اللہ بنگالی کی فارسی کتب "گل بکاؤلی" کا ترجمہ کیا۔ مرزا لطف علی نے "گلشن ہند" کے نام سے اردو زبان کے شاعروں کا ایک تذکرہ لکھا یہ تذکرہ ۱۸۰۱ء میں شائع ہوا مولوی امانت اللہ شیدا نے ۱۸۰۵ء میں اخلاق جلالی کا ترجمہ کیا اور ۱۸۱۰ء میں اردو زبان کے قواعد پر "صرف اردو" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ نثر نسبتاً آسان صاف اور عام فہم ہو گئی تھی۔ پہلے دور کی طرح ہندی سنسکرت، بھاشا دکنی اور عربی فارسی کے مشکل الفاظ کا استعمال کم ہو گیا تھا۔ پیرایہ بیان بھی پیچ دار ہونے کی بجائے صاف ہو گیا۔ میر امن کی باغ و بہار" اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے پہلے دور میں صرف ترجموں پر اکتفا کی گئی تھی مگر اس دوسرے دور میں طبع زاد کتابیں بھی تصنیف کی گئیں۔ تاریخی اور علمی کام بھی کیا گیا۔ چنانچہ میر بہادر علی حسینی کی تاریخ اسلام، مرزا کاظم علی جوان کی بہمنی خاندان کی تاریخ اور مولوی امانت اللہ شیدا کی صرف اردو" خاص علمی و تخلیقی کارنامے ہیں۔

تیسرا دور نثر اردو کی تاریخ کا تیسرا دور ۱۸۳۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور اردو زبان میں اخبارات و رسائل کی ابتدا ہوئی (اردو صحافت" کے عنوان سے اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ اسی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے) اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے ادبی انجمنیں قائم ہونے لگیں اور دہلی میں کالج کی بنیاد پڑی۔ اردو نثر کلکتہ کے فورٹ ولیم

کالج کے حلقہ سے نکل کر دہلی میں آئی اور مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر، پروفیسر
رامچندر، مولوی امام بخش صہبائی اور مرزا غالب کے ہاتھوں پروان چڑھنے لگی۔ دلی
کالج میں ۱۸۴۳ء میں ایک ادبی انجمن قایم کی گئی۔ پروفیسر رامچند اور مولوی صہبائی
کی سرپرستی میں اس انجمن نے انگریزی اور فارسی کی بہت سی معلوماتی
اور قابل قدر کتابوں کو اردو نثر میں منتقل کیا۔ اسی دور میں مرزا غالب نے
اردو زبان میں اپنے شہرۂ آفاق خطوط لکھ کر اردو نثر کی تاریخ میں بیش قیمت اضافہ کیا اور
خطوط نویسی کے فن کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ اس عہد میں دہلی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ
نے بھی اردو نثر کی بیش از بیش خدمت کی۔ نواب فقیر محمد خاں گویا نے "انوار سہیلی"
کا ترجمہ کیا۔ رجب علی بیگ سرور نے ..... فسانہ عجائب" لکھ کر اردو
نثر میں۔ ایک اور اضافہ کیا۔ اسی دور میں قصوں کی مشہور کتاب "الف لیلیٰ" کے
بھی ترجمے کئے گئے۔

چوتھا دور نثر اردو کا چوتھا دور ایام بغاوت (۱۸۵۷ء) کے قریبی زمانہ سے شروع
ہو کر ۱۹۰۰ء تک قائم رہا۔ یہی دور تھا۔ جب سر سید نے "آثار الصنادید"
کے نام سے دہلی کی تاریخی عمارتوں کے تذکرے پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ اور اپنی دوسری
تصانیف "جلاء القلوب"، "فوائد الافکار"، "کلمۃ الحق"، "راہ سنت" اور "سلسلہ ملوک ہند"
لکھ کر اردو نثر کی بیش قیمت خدمت انجام دی۔ انھوں نے یہ ساری کتابیں ۱۸۴۲ء
اور ۱۸۵۵ء کے درمیان تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان
تاریخ بجنور اور ۱۸۵۸ء میں رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا۔ ۱۸۶۲ء میں جب وہ
بسلسلہ ملازمت غازی آباد میں تھے تو اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے پیش
نظر "سائنٹیفک سوسائٹی" قائم کی اس سوسائٹی کے زیر اہتمام فارسی اور
انگریزی سے بہت سی علمی اور تاریخی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سے

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" شائع کرنا شروع کیا۔ ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور قرآن شریف کی تفسیر لکھی۔ نواب وقار الملک نے "سرگذشت نپولین بوناپارٹ" لکھی جو ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔ نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے مذہبی موضوعات پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور قدیم قوموں کی مختصر تاریخ لکھ کر نثر اردو کے علمی حصے میں اضافہ کیا۔ سرسید کے رفیق کار مولانا حالی نے بھی اردو نظم کے ساتھ ساتھ اردو نثر کی بھی ترویج و اشاعت کی۔ ۱۸۸۶ء میں "حیات سعدی" اور ۱۸۹۶ء میں "یادگار غالب" لکھی۔ حالی وہ پہلے اہل قلم ہیں جنھوں نے اردو زبان میں "سیرت نگاری" کا شوق پیدا کیا اور اس فن پر مکمل جامع اور مبسوط تصانیف پیش کیں۔ اُس وقت اردو زبان و ادب میں تنقید پر بھی کوئی کتاب نہیں تھی شعراء کے مختلف تذکرے ضرور تھے جن میں اُن کے حالات زندگی اور کلام کے نمونے درج تھے۔ حالی وہ پہلے اہل قلم ہیں جنھوں نے "مقدمۂ شعر و شاعری" کے نام سے اپنی شہرہ آفاق کتاب لکھی اور اُردو تنقید کے لئے راستہ بنایا۔ مولانا حالی کے بعد جس اہل قلم نے گلستان نثر کی آبیاری کی وہ مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ مولانا آزاد کی تصانیف میں "آب حیات"، "نیرنگ خیال"، "سخندانِ پارس" اور "دربار اکبری" بہت مقبول اور مشہور ہیں اور بعض آج تک کورس میں شامل ہیں۔ "آب حیات" میں امیر خسرو سے لے کر میر انیس و دبیر تک تمام شعراء کے حالات زندگی، نمونہ کلام۔ ادبی مجلسوں کا حال اور شعراء کے لطائف و ظرائف شامل ہیں اور ابتداء میں اردو زبان کی ابتدا ماخذ اور ارتقا پر ایک مدلل اور مبسوط مقالہ ہے۔ "نیرنگ خیال" میں کچھ قصے ہیں جو مولانا آزاد کی قوتِ متخیلہ کی ایجاد ہیں۔ ان کا انداز بیان بہت دلچسپ اور دلنشیں ہے۔ "سخندان پارس" میں فارسی اور سنسکرت کے باہمی تعلق پر بحث کی گئی ہے اور "دربار اکبری" میں شہنشاہ اکبر اعظم اور اُس کے اراکین دربار کے

حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا آزاد کی کچھ اور تصانیف بھی ہیں۔ مولانا آزاد اردو نثر کے بہت بڑے محسن اور اس دور کے سب سے بڑے انشاپرداز تھے۔ اُن کی نثر میں بڑی بے ساختگی، بے تکلفی، برجستگی اور روانی ہے۔ وہ مرقع کھینچتے تھے واقعات اور شخصیات کی تصویریں کھینچ دیتے تھے۔ سماں باندھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کی نثر میں تکلف کا نام و نشان نہیں ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو فرش سے اٹھا کر عرش پر پہونچا دیا۔ استعاروں اور تشبیہوں کا بہت بے تکلفی سے استعمال کیا۔ اُن کی تصانیف آج بھی بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ مولانا آزاد کے بعد جس باکمال اہل قلم کا نام آتا ہے وہ ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول لکھ کر اردو نثر کی گراں قدر خدمت کی وہ پہلے اہل قلم ہیں جنھوں نے بھوتوں جنوں اور پریوں کے خیالی قصوں سے دامن بچا کر اردو نثر میں حقیقت نگاری کا عنصر داخل کیا۔ اور اپنے ناولوں میں معاشرت پر بہت بیباک اور اصلاحی تنقید کی۔ اُن کی تصانیف میں "مراۃ العروس"، بنات النعش" توبۃ النصوح" اور "ابن الوقت" خاص طور پر شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ نذیر احمد کی نثر بہت سادہ اور عام فہم ہے انھوں نے استعاروں سے اجتناب کیا عبارت میں رنگینی بھی نہیں ہے مگر اس کے باوجود بہت دلکش اور موثر ہے اُن کی زبان آب کوثر میں دھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُن بزرگوں کے علاوہ مولوی ذکاالله مولوی سید احمد دہلوی اور شبلی نعمانی نے بھی اپنی تصانیف کے ذریعہ اردو نثر کے دامن کو انمول موتیوں سے مالا مال کیا ان میں سے مولوی ذکاالله مرحوم نے سب سے زیادہ کتابیں لکھیں جن کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہونچتی ہے ان میں جغرافیہ، تاریخ، سیاسیات، ادب ریاضی، طبیعات، کیمیا اور اخلاقیات تک پر کتابیں موجود ہیں اس لحاظ سے یہ کتابیں قابل قدر ہیں اور

انھیں اُردو نثر کی بہت بڑی خدمت سمجھنا چاہیئے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے یوں تو بہت سی کتابیں لکھیں جنھیں بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور ایک کتاب "کنز الفوائد" پر انھیں حکومت ہند کی طرف سے دو سو روپیئے انعام بھی دیا گیا۔ مگر مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ جس پر اردو زبان ہمیشہ فخر کرے گی اُن کی مشہور لغت "فرہنگ آصفیہ" ہے۔ یہ لغت مولوی صاحب کی برس ہا برس کی محنت شاقہ تلاش و تحقیق اور کد و کاوش کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے تمام اُردو فارسی الفاظ اور ہماری روزمرہ گفتگو میں استعمال ہونے والے تمام محاورات کو شامل کر لیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی بھی اُردو نثر کے بہت بڑے محسن اور مصنف تھے۔ اُن کی تصانیف میں سیرت نبوی، الفاروق، شعر العجم، الکلام سوانح مولانا روم، الغزالی، المامون، تاریخ اسلام، حیات خسرو، اورنگ زیب عالم گیر اور موازنۂ انیس و دبیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ سے قطعی خالی ہے۔ کہ اپنی تصانیف اور ان کی افادیت کے اعتبار سے مولانا شبلی اپنے تمام پیش رو اہل قلم سے بازی لے گئے اُن کے ذریعہ سے نثر اُردو میں بلند پایہ علمی ادبی تاریخی اور مذہبی کتابوں کا اضافہ ہوا جن سے اُس سے پہلے اُردو کا دامن خالی تھا۔ مولانا کا اندازِ تحریر عالمانہ اور متین و سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ شگفتہ بھی ہے اور بعض تصانیف مثلاً سفر نامہ شام و روم میں تو اُن کی عبارت بہت ہی دلچسپ اور دلنشیں ہے۔ فصاحت و بلاغت اور صفائی و سادگی اُن کی نثر کے نمایاں اوصاف ہیں۔ مولانا شبلی کی نثری خدمات کا ذکر کرتے ہوئے "ندوۃ العلماء" اور "دار المصنفین" کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ندوہ کے بانی تو سید محمد علی کانپوری تھے مگر اس کو بنانے اور ندوہ کہنے کا سہرا مولانا شبلی ہی کے سر ہے یہ ادارہ ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا تھا۔ ندوۃ العلماء وہ دار العلوم ہے جس نے ہندوستان کے بڑے بڑے مصنف پیدا کئے۔ ان مصنفین نے اُردو زبان و ادب کی تقریباً ہر صنف پر نہایت اعلیٰ اور قابل ذکر کتابیں تصنیف کیں۔ ان نامور مصنفوں میں سید سلیمان ندوی، عبد السلام

ندوی، مولوی رئیس احمد جعفری اور مولانا رشید اختر ندوی[1] جیسے فاضل اور مایہ ناز اہل قلم شامل ہیں۔ دارالمصنفین" اعظم گڈھ میں ۱۹۱۳ء میں قائم ہوا اس ادارے نے بھی علم وادب اور نثر اردو کی قابل قدر خدمت کی اور بعض اعلیٰ درجے کی تصانیف پیش کیں۔

اردو نثر کے چوتھے دور کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ سرشار نے نثر نگاری کی ابتدا ایک انگریزی کتاب کے ترجمے سے کی۔ اس کے بعد انھیں منشی نولکشور نے اپنے اخبار" اودھ اخبار" میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا ہیں سے انھوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب فسانہ آزاد کی ابتداء کی اور اودھ اخبار میں باالاقساط شائع کرنا شروع کیا۔ اس سلسلہ مضامین نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ اسے ۱۸۸۰ء میں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا سرشار نے کچھ اور کتابیں بھی لکھیں جن میں "جام سرشار" کامنی" خدائی فوجدار (یہ ترجمہ ہے) اور سیر کہسار" قابل ذکر ہیں مگر ان کی شہرت کا باعث فسانہ آزاد ہی ہے جو صرف انھیں کی شہرت کا باعث نہیں ہے بلکہ اردو زبان کا بیش قیمت سرمایہ بھی ہے اس کی زبان نہایت پُر لطف، بامحاورہ اور نہایت بہار دار ہے سرشار نے "فسانہ آزاد" میں اُس عہد کی لکھنوی تہذیب و تمدن، مخصوص وضع داری مسلمان شرفاء اور رؤساء کی معاشرت اور حد یہ ہے کہ مسلمان خواتین کی بول چال اور طرز تمدن کی ایسی فنکارانہ مصوری کی ہے کہ بڑے بڑے اہل قلم دنگ رہ جاتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ انھوں نے جس طبقے کا حال بیان کیا ہے۔ اُس کی تصویر کشی کرتے ہوئے اُس کی مخصوص وضع قطع، مخصوص محاورے، اصطلاحیں اسی کی زبان سے ادا کرائی ہیں اور نقل (یا مثال) ہیا کر دکھایا ہے۔ غرض "فسانہ آزاد" اُس دور کی اردو نثر کا شاہکار اور سرشار کا لازوال کارنامہ ہے جس پر نثر اردو رہتی دنیا تک فخر کرے گی۔ سرشار کی نثر بڑی شگفتہ ہے۔ مزاح کی چاشنی لطافت اور فصاحت و

---

[1] ان لوگوں کے علاوہ مولانا حنیف ندوی، سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی وغیرہ بھی قابل ذکر اہل قلم ہیں۔

بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بلا کی روانی اور رنگینی ہے۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے بھی اپنے ناولوں اور دوسری تصانیف کے ذریعہ نثر اردو کے چوتھے دور میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے ناول بھی لکھے سوانح نگاری بھی کی اور تاریخ کے موضوع پر بھی کتابیں لکھیں اور بہت سے ماہنامے اور ہفت روزہ رسالے بھی جاری کئے جن میں سے "دلگداز" بہت مقبول و مشہور ہوا عرصہ دراز تک "اودھ اخبار" سے وابستہ رہے۔ مولانا کا پہلا ناول "دلچسپ" کے نام سے شائع ہوا اس کے بعد انکی بھی تصانیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے چند کتابوں کے انگریزی سے اردو میں ترجمے بھی کئے۔ شرر مرحوم کی نثر کا یہ نمایاں وصف ہے کہ انھوں نے انگریزی ناولوں کی خوبصورت بندشوں کو اردو کا لباس پہنایا۔ ان کا پیرایہ بیان بہت دلکش زبان نہایت صاف اور ٹکسالی ہے۔ البتہ ہر ناول کے شروع میں غیر ضروری اور طویل تمہیدیں ضرور کھٹکتی ہیں۔

اردو نثر کا تیسرا دور پچھلے دونوں ادوار کے مقابلے میں بہت حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ اس دور میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ادبی انجمنیں قائم ہوئیں۔ اخبارات کی ابتدا ہوئی۔ تالیف و تصنیف کے مراکز کھلے زبان رفتہ رفتہ تصنع آورد اور پیچیدہ مراحل سے گذر کر فصیح و بلیغ، صاف و شستہ اور ٹکسالی ہو گئی۔ علمی و ادبی تاریخی و اخلاقی اور عام معلومات پر بیش قیمت کتابیں تصنیف کی گئیں مصنفین نے خیالی حصار سے نکل کر واقعات و حقائق کی طرف توجہ دی۔ اور اردو نثر کو "مقصدیت" کے لئے استعمال کیا گیا۔ نثر کے ذریعہ سے معاشرت پر اصلاحی تنقید کی گئی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ طنز و مزاح بھی اردو نثر کے اجزاء قرار پائے۔

چوتھا دور

نثر اردو کا چوتھا دور ۱۹۲۰ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں اردو نثر نے حیرت انگیز ترقی کی اور اس کے ہر شعبہ میں نئی زندگی کے آثار

پیدا ہونے لگے۔ سیر و تاریخ، افسانہ و ڈراما ناول، تنقید، مذہب، سیاست اور صحافت غرض ہر میدان میں اعلیٰ سے اعلیٰ جواہر پاروں کا ڈھیر لگ گیا۔ اس دور کے لکھنے والوں میں مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولوی عبد الحق، سر عبد القادر، خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، نیاز فتح پوری، اور سید سلیمان ندوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے "الہلال" اور اپنی دوسری تحریروں کے ذریعہ سے اردو نثر کا معیار بہت بلند کر دیا۔ "تذکرہ" اور پھر "غبار خاطر" اُن کے بلند پایہ نثری شاہکار ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے روزنامہ زمیندار کے ذریعہ سے جس کی بنیاد اُن کے والد ماجد مولوی سراج الدین خاں نے رکھی تھی اردو نثر کی بڑھ چڑھ کر خدمت کی اور اردو نثر کو نئی نئی تراکیب سے مالا مال کیا۔ انگریزی کی قابل قدر کتابوں کے ترجمے کئے۔ "معرکۂ مذہب و سائنس"، "خیابان فارسی"، "خطبات"، "میری جلینگ" اور "جنگل میں منگل" اُن کے مشہور ترجمے ہیں اس کے علاوہ ڈرامہ "جنگ روس و جاپان" اُن کی طبع زاد تصنیف ہے۔

مولوی عبد الحق نے ۱۹۱۸ء میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی اور سیکڑوں گراں بہا تصانیف پیش کیں۔ ترجمے بھی طبع زاد بھی۔ ادب پر بھی سیاست پر بھی، معاشیات پر بھی، اخلاقیات پر بھی، سائنس پر بھی غرض نظم و نثر کے ہر شعبے میں بیش از بیش اضافہ کئے۔

سر عبد القادر مرحوم نے ۱۹۰۱ء میں اردو زبان کا بلند پایہ اور معیاری ماہنامہ مخزن جاری کیا جس کے ذریعہ سے مولانا حالی، مولانا شبلی، ابو الکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، عبد الحلیم شرر، راشد الخیری، مولانا ذکاء اللہ، اور سید وحید الدین سلیم جیسے شہرہ آفاق نثر نگاروں نے اپنے نثری شہ پارے پیش کئے۔ اس کے علاوہ سر عبد القادر نے "مقام خلافت" کے نام سے قسطنطنیہ کے حالات پر ایک کتاب بھی لکھی

خواجہ حسن نظامی نے بھی نثر کی بیسیوں کتابیں لکھیں۔ اُن کی دس بارہ کتابیں تو صرف ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر ہیں جو انھوں نے بہت موثر انداز میں لکھی ہیں، جن میں "بیگمات کے آنسو" "غدر دہلی کے افسانے" اور "بہادر ظفر کا مقدمہ" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ تاریخ اور چھوٹے چھوٹے افسانوں پر مشتمل بھی اُن کی بہت سی کتابیں ہیں۔ خواجہ صاحب کا اسلوب نگارش بہت ہی دلکش اور موثر ہے درد و تاثر کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کا عنصر بھی ہے۔ ایک معمولی سی بات میں کلیاں پھندنے لگا کر اُسے دلچسپ بنانا۔ رائی کا پہاڑ اور رسّی کو سانپ بنانے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ "دیا سلائی" اور "جھینگر کا جنازہ" اُن کے دماغ کی زرخیزی اُن کے قلم کی روانی اور زبان کے چٹخاروں کی مُنہ بولتی تصویریں ہیں۔

مولانا راشد الخیری بھی اس دور کے بہت بڑے نثر نگار تھے، انھوں نے عورتوں کے مسائل کی طرف توجہ دی اور اس موضوع پر بہت سی تصانیف پیش کیں اُن کے ناول اور مضامین نے اُردو نثر میں انقلاب برپا کر دیا۔ اُن کی کتابوں میں "حیات صالحہ"، "آمنہ کا لال" اور "سیدہ کا لال" مقبولیت اور شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہونچ گئیں۔ مولانا کی نثر میں درد و غم کا عنصر بہت زیادہ ہے اسی لئے آپ کو مصورِ غم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نیاز فتحپوری اُردو زبان و ادب کے صاحب طرز اہل قلم چوٹی کے نقاد اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور اپنے معیاری ماہنامے نگار کے ذریعہ سے اردو زبان و ادب کی آرائش و زیبائش کی۔ انھوں نے مضامین بھی لکھے۔ افسانے بھی لکھے اور اخبار نویسی بھی کی اور حقیقت یہ ہے کہ نثر کی خدمت کرنے میں بہتوں سے بازی لے گئے اُن کی تصانیف میں۔ "شہاب کی سرگزشت" "صحابیات"

"نگارستان"، "جنسیات" اور "مکتوبات نیاز" خاص طور پر قابل ذکر ہیں
اُنھیں کے ہاتھوں اُردو افسانے میں رومانی اسکول کی بنیاد پڑی - نیاز کی نثر
سب سے الگ ایک خاص انداز کی ہوتی ہے - اُن کے جملوں میں بڑی برجستگی
روانی اور چلبلاپن ہوتا ہے - انھیں اپنے قلم پر پوری قدرت حاصل ہے مزاج
کے لطیف امتزاج نے اُن کی نثر کو حد درجہ دلچسپ بنا دیا - اور اپنے مکاتیب پیش
کر کے ثابت کر دیا کہ غالب کے بعد بھی فن خط نویسی میں بہت گنجائش ہے - ان کی تصانیف
کا مطالعہ کرتے وقت دل چاہتا ہے - کہ یہ کبھی نہ ختم ہوں -

سید سلیمان ندوی بھی اس دور کے بہت بڑے فاضل اہل قلم ہیں - مولانا
شبلی کی سیرت نبوی کے باقی حصہ کو مکمل کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے - اسکے
علاوہ "سیرت عائشہ" "سیر افغانستان" اور "ارض القرآن" انکی مشہور تصانیف
ہیں - مولانا کا اسلوب نگارش بہت متین و سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ
دلچسپ بھی ہوتا ہے - گنجلک اور پیچ در پیچ عبارت سے حتی الامکان گریز کیا ہے

ان لوگوں کے علاوہ اس دور کے اور بھی بہت سے نثر نگار ہیں جن میں
سے ہر ایک کے فرداً فرداً تذکرے کی اس مختصر سی کتاب میں گنجائش نہیں ہے - البتہ
اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے ذریعہ نثر اردو روز بروز ترقی کے مراحل طے
کر رہی ہے - نئے نئے اہل قلم پیدا ہو رہے ہیں جو پرانے اہل قلم کی جگہ لے رہے
ہیں اور اردو نثر میں ایجاد و اختراع کر کے اُس کی غیر معمولی خدمت کر رہے
ہیں - بحیثیت مجموعی ہماری نثر ارتقا کی طرف گامزن ہے -

اُردو ناول

اردو ناول کا آغاز شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم کے ہاتھوں ہوا۔ اس سے پہلے ہمارے ادب میں ناول کا وجود ایک مستقل صنف کی حیثیت سے نہیں تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ ناول اپنی مخصوص ٹیکنیک کے ساتھ عالم وجود میں نہیں آیا تھا اس میں شک نہیں کہ نذیر احمد مرحوم سے پہلے ایسے عناصر ضرور موجود تھے جو ترکیب کے محتاج تھے۔ بالفاظ دیگر اردو ناول کے لئے راستہ بن چکا تھا۔ اس کی نشاندہی کی جا چکی تھی۔ داغ بیل پڑ چکی تھی۔

ابتدائی صورت

اردو نثر کی وہ تصانیف جنھوں نے اردو ناول کی ترقی کے لئے سیڑھی کا کام دیا ابتداء میں قصوں کی صورت میں موجود تھیں ان میں سے حیدر بخش حیدری کی "طوطا کہانی" میر بہادر علی حسین کی نثر بے نظیر" مرزا کاظم علی جوان کی "شکنتلا" نہال چند لاہوری کی مذہب عشق" یعنی قصہ گل بکاؤلی" اور للولال کی سنگھاسن بتیسی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھیں قصوں یا داستانوں نے ارتقا کی منازل طے کر کے ناول کا روپ دھارا۔ اس سلسلے میں اردو زبان کے مشہور شاعر سید انشاء اللہ خاں انشاء کی تصنیف "داستان رانی کیتکی" کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انشا کی اس تصنیف نے اردو ناول کی عمارت بنانے میں بنیاد کی اینٹ کا کام دیا۔ انشا کے بعد جس قابل ذکر شخصیت نے اردو ناول کی تاسیس میں حصہ لیا وہ مرزا رجب علی بیگ سرور ہیں۔ سرور نے فسانہ عجائب لکھ کر اردو ناول کو ایک قدم اور آگے بڑھایا اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی اس تصنیف میں خارق عادات واقعات

بیان کر کے اس کی حیثیت کو کم کر دیا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس امر کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس زمانے کی سوسائٹی اور تمدن و معاشرت کی تصویر کشی کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اور اونچے طبقے کی عکاسی کے ساتھ ساتھ غرباء اور عوام کے بھی ہر ہر پہلو کا عکس پیش کیا۔ اگر وہ اپنی اس تصنیف میں مقفیٰ و مسجع عبارت تصنع اور بعید از عقل واقعات کا سہارا نہ لیتے تو اسکا پایہ اور بھی بلند ہو جاتا مگر اس کے باوجود اردو ناول کے ارتقا میں اسکا بہت بڑا حصہ ہے جسے تاریخ ادب کا مؤرخ کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتا۔

اُردو ناول ۱۸۵۷ء کے بعد

۱۸۵۷ء کے ہولناک ہنگامے نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح خاک بسر کیا جس طرح ان کی جان و مال اور عزت و آبرو ہلاکت و بربادی اور رسوائی کی بھینٹ چڑھی اُس پر کسی قسم کی حاشیہ آرائی بے سود ہے جبکہ ہم میں سے ہر شخص ان واقعات و حالات سے باخبر ہے۔ یہ حالات خواہ کتنے ہی خونچکاں، روح فرسا اور ہوش رُبا تھے مگر اُن کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ قوم کے حساس لوگوں کو اصلاح احوال کا خیال پیدا ہوا دراصل یہی احساس موجودہ اُردو ناول پروان چڑھانے کا محرک ثابت ہوا چنانچہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، محصنات، اور ابن الوقت، جیسے معرکۃ الآرا ناول تصنیف کر کے نہ صرف قوم کی خدمت کی بلکہ ہمارے ناول کو ایک مستقل صنف کی حیثیت سے آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نذیر احمد مرحوم نے اول الذکر دو کتابیں مستورات کی اصلاح کے پیش نظر لکھیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مقصد میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے "توبۃ النصوح" برخود غلط قسم کے نوجوانوں کی اصلاح کے پیش نظر تصنیف کی گئی۔ اسی طرح اُن کی دوسری کتابیں بھی مقصدیت کو

سامنے رکھ کر لکھی گئیں۔ نذیر احمد مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اُردو زبان کی عام داستانوں اور قصوں کی کتابوں سے ہٹ کر حقیقت نگاری کی طرف توجہ دی ادب کو مقصدیت کے لیئے استعمال کیا۔ جنوں، پریوں، دیوں اور بھوتوں کے محیر العقول قصوں کو نظر انداز کر کے وقت کے اہم تقاضوں کو سمجھا اور انہیں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں بعض خامیاں بھی ہیں جنکا ذکر نہ کرنا ادبی بد دیانتی ہے۔ اُن کی پہلی خامی اُنکا ناصحانہ انداز بیان ہے جو بعض جگہ تو بہت بری طرح کھٹکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کے مزاج کا زہد کہیں کہیں لطافت کا خون کر دیتا ہے۔ اس قسم کے نمونے آپکو "توبۃ النصوح" میں جا بجا ملیں گے۔ اُن کی دوسری خامی کردار نگاری سے تعلق رکھتی ہے۔ ناول میں کردار نگاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک اچھے اور باکمال ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ اُس کے کردار جامد اور بے جان نہ ہوں بلکہ اُن میں زندگی ہو اور ارتقا کا پتہ چل سکے۔ نذیر احمد مرحوم کے ناولوں کے کردار بے جان تو نہیں ہیں مگر بقول علی عباس حسینی اُن کے اکثر کرداروں میں ارتقائی مدارج نہیں ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے ہمارے سامنے مکمل ہو کر آتے ہیں۔ اس سے اُنکی فنکارانہ حیثیت ضرور گھٹتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ "ان کامل کرداروں کی جیسی مرقع کشی انہوں نے کی ہے وہ آپ اپنی مثال ہے" نذیر احمد مرحوم نے اپنے ناولوں میں جہاں جہاں مکالمہ نگاری سے کام لیا ہے ان مقامات پر بھی وہ بہت بلند نظر آتے ہیں خصوصاً مستورات کے مکالموں میں انہوں نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ مگر مردوں کے مکالمے لکھتے ہوئے اُس روانی اور برجستگی میں کمی پیدا ہو گئی ہے جو عورتوں کے مکالموں میں دلفریبی کی حد تک پہونچی ہوئی ہے۔

نذیر احمد کے بعد

مولوی نذیر احمد کے بعد جن لوگوں نے اردو ناول کو زندہ رکھنے کی کوشش کی اُن میں پنڈت رتن ناتھ

سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر، حکیم محمد علی طبیب، منشی سجاد حسین، مرزا عباس حسین ہوش، مرزا محمد ہادی رسوا، مولانا راشد الخیری، نواب سید محمد آزاد اور منشی جوالا پرشاد برق، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس مختصر سے باب میں اتنی گنجائش تو نہیں ہے کہ ہر ناول نگار کی تخلیقات پر بالتفصیل گفتگو کی جائے صرف چند مشہور ناول نگاروں کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

سرشار سرشار کی تصانیف میں سے "فسانۂ آزاد"، "سیر کہسار" اور "جام سرشار" حیرت انگیز مقبولیت اور شہرت کی مالک ہیں۔ سرشار کا دلچسپ اور شگفتہ انداز بیان نہایت شیریں، صاف اور شستہ زبان، ٹکسالی اردو، ظرافت کا عنصر، مکالمہ نویسی اور کردار نگاری کا کمال اردو زبان و ادب کے ناقدوں سے ہمیشہ خراج تحسین وصول کرتے رہیں گے۔ انہیں خصوصیات کی بدولت اُن کے ناول سدابہار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کے ناولوں میں بعض خامیاں بھی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے جن مقامات پر غم و اندوہ کی کیفیت بیان کرنی چاہی ہے، یا جہاں سنجیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اکتا دینے والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور بقول علی عباس حسینی ان مقامات پر بیساختہ۔ صفحے کے صفحے پلٹ دینے کو جی چاہتا ہے۔ اُن کے ایک کردار "اللہ رکھی" کی حزنیہ داستان پڑھ لیجئے۔ آپ مندرجہ بالا دعوےٰ کی تائید کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اُن کی دوسری خامی ربط و تسلسل کی کمی ہے "فسانۂ آزاد" اور "کامنی" اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اُن کی تیسری خامی ایک کتاب کے اشعار اور روزمرہ کا دوسری کتاب میں اعادہ کر دینا ہے۔ اُن کی چوتھی خامی یہ ہے کہ اُن کے مختلف ناولوں اور کرداروں میں یکسانیت ہے اور بقول عبدالقادر ان تمام کتابوں میں ایک ہی طرح کی زندگی بیان کی گئی ہے اور کردار بھی ملتے جلتے پیش کئے گئے ہیں۔

شرر: سرشار کے بعد دوسرے قابل ذکر ناول نگار عبد الحلیم شرر ہیں۔ شرر نے دو
طرح کے ناول لکھے تاریخی اور معاشرتی۔ اُن کے تاریخی ناولوں میں "ملک العزیز ورجینا"
"شوقین ملکہ" "حسن انجلینا" "منصور موہنا" "عزیز مصر" "ظور فلورنڈا"، "فتح اندلس" "فلپانہ"
"زوال بغداد" اور "فردوس بریں" وغیرہ بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ اُن کے معاشرتی
ناولوں میں "دلچسپ" "خوفناک محبت" "دربار حرام پور" "آغا صادق" اور "بدر النساء"
قابل ذکر ہیں۔ شرر کے تاریخی ناول افادی نقطۂ نگاہ کے حامل ہیں انہوں نے مسلمانوں
کو اُن کا شان دار ماضی یاد دلا کر اُس عہد کی پستی سے نکالنے اور بلندی کی طرف لے
جانے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے اُن کا مرتبہ بلند اور اُن کا جذبہ قابل تعریف
ہے۔ انہوں نے بکثرت ناول لکھے۔ اُن کے ناولوں کی زبان نہایت شستہ اور بامحاورہ
ہے۔ اُن کے قلم میں بہت زور ہے۔ اُن کا انداز تحریر بہت موثر ہے۔ لیکن اس کے
ساتھ ساتھ اس تلخ حقیقت کا بھی اظہار کرنا پڑتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے
ناولوں میں ہر باب شروع کرنے سے پہلے جو تمہید باندھی ہے اور موسم اور مناظر
کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ بعض جگہ غیر ضروری اور اکتا دینے والی ہیں۔ اس کے ساتھ
ساتھ اُن کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں کے پلاٹ کا تسلسل قائم
رکھنے کے لئے تاریخی واقعات بلکہ مسلمات کو مسخ کر دیا ہے چنانچہ اپنے مشہور تاریخی
ناول "ماہ ملک" میں "جنگ راغ رز" کا نقشہ کھینچتے ہوئے سلطان غیاث الدین
غوری کے دو نوجوان جاں بازوں کے ہاتھوں تاج الدین یلدز کو قتل کروا دیتے ہیں،
حالانکہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ تاج الدین یلدز غیاث الدین غوری کے بعد بھی
زندہ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعہ سے بہادری کے بعض
ایسے واقعات دکھائے ہیں جنہیں عقل انسانی قبول نہیں کر سکتی اور جنہیں محیر العقول
کہنا زیادہ صحیح ہے۔ جہاں تک مکالمہ نگاری کا تعلق ہے اُس میں شرر پوری طرح

پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اُن کا مشہور ناول "فردوس بریں" اسکا زندہ ثبوت ہے۔ اگر شرر صرف یہی ناول لکھ کر ناول نگاری کے میدان سے ہٹ جاتے تو شاید ابد الآباد تک زندہ رہتے۔ فردوس بریں میں اُن کا فن پورے عروج پر ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے، منظر کشی، زبان و بیان غرض یہ ناول ہر اعتبار سے اُردو ناولوں میں امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ کاش وہ کم سے کم لکھتے اور معاشرتی ناول لکھنے کی تکلیف بالکل گوارا نہ کرتے تو اُن کی حیثیت موجودہ حیثیت سے کہیں زیادہ بلند ہوتی۔ معاشرتی ناولوں میں تو اُنہیں بڑی طرح ناکامی ہوئی ہے اور وہ ہماری معاشرت کی عکاسی کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

سجاد حسین مولانا عبدالحلیم شرر کے بعد مشہور ناول نگار منشی سجاد حسین (اودھ پنچ والے) ہیں۔ منشی سجاد حسین کا انداز تحریر ظریفانہ ہے انہوں نے اپنے ناولوں میں بھی اسی رنگ سے کام لیا اور اُردو ادب کو بعض سدا بہار قسم کے ناول دیدیئے جن میں سے حاجی بغلول "کایا پلٹ" اور احمق الدین" مشہور ناول ہیں سجاد حسین کو اپنے کرداروں کے چہرے دکھانے میں خاص طور پر کمال حاصل تھا حاجی محمد بلیغ العلی صاحب قبلہ کی دمنی ثم لکھنوئی..... "احمد" احمق الدین کے "بھولے خواب" کے چہرے اور اُنکی ہیئت کذائی پڑھنے کے قابل ہے

مرزا رسوا مرزا محمد ہادی رسوا بھی اسی عہد کے مشہور ناول نگار ہیں یوں تو انہوں نے بہت سے ناول لکھے۔ "ذاتِ شریف" اور "افشائے راز" وغیرہ مگر اُن کا زندہ جاوید کارنامہ امراؤ جان ادا ہے جسکا جواب ایک طوالف ہے۔ رسوا نے اس ناول میں طوائف کی زندگی اور معاشرت کی نہایت کامیاب تصویر کھینچی ہے۔ اس کے کردار غیر فانی اور انسانی مشاہدے کے عین مطابق ہیں خاص طور پر امراؤ جان ادا کو ہر مرزا اور خانم کے کردار حد درجہ دلچسپ ہیں اس

اس ناول میں ظرافت بھی ہے، طنز بھی ہے، عبرت بھی ہے مگر ہر چیز بڑے سلیقے سے بڑی فنکاری سے افادیت اس ناول کی بنیادی خوبی ہے۔ امراؤ جان ادا انیسویں صدی کا وہ معرکتہ الآرا اور پہلا ناول ہے جو ناول کی تکنیک پر پورا اُترتا ہے۔

راشد الخیری رسوا کے بعد جس قابل ذکر ناول نگار کا نام آتا ہے۔ وہ مولانا راشد الخیری ہیں۔ راشد الخیری کے تقریباً تمام ناول عورتوں کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس طبقے کی اصلاح کیلئے یہ مؤثر قدم اُٹھا کر جہاں عورتوں پر احسان کیا وہاں اردو ناول کو بھی بعض لازوال شاہکار دے دئے۔ اُنکے ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت دردانگیزی ہے۔ اُنکی تصانیف میں سیدہ کا لال، حیاتِ صالحہ، سیلابِ اشک، بنت الوقت، نانی عشو، شام زندگی، صبح زندگی، عروس کربلا اور ماہ عجم وغیرہ خاص طور پر مشہور و مقبول ہیں۔ مولانا کا اندازِ تحریر نہایت سادہ مگر دلکش ہے انہوں نے منظر کشی، کردار نگاری اور سیرت کے بیان میں بھی بہت کامیابی حاصل کی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں بعض خامیاں بھی ہیں۔ اُن کے پلاٹ کبھی کبھی غیر فطری ہوتے ہیں بعض جگہ مکالمہ کی بھی خامیاں نظر آتی ہیں مثال کے طور پر ماہ عجم میں مسعود کی فریاد اور بنت الوقت میں "آغا مرزا" کی تقریر قطعاً غیر فطری چیزیں ہیں

پریم چند پریم چند نئے دور کے نقیب اور جدید افسانہ نگاری کے امام کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول کی طرف بھی توجہ کی اور اپنے افسانوں کی طرح ناول کو بھی دیہاتی زندگی کی عکاسی کیلئے وقف کر دیا پریم چند کے ناولوں میں "بیوہ"، "بازارِ حسن"، "میدانِ عمل" اور "گئودان" وغیرہ بہت مشہور ناول ہیں۔ پریم چند کے ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت انسانی ہمدردی ہے دوسری خصوصیت اُن کے اسلوبِ نگارش کی سادگی و شگفتگی ہے۔ اُن کا احساس بہت نازک اور بیدار ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں جو کردار پیش کیے ہیں۔ ان کی

زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اُن کے کرداروں میں ارتقا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں بعض خلافِ واقعہ باتیں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کے مشہور ناول میدانِ عمل میں دو کردار ہیں امرکانت اور حلیم۔ یہ دونوں دہلی میونسپلٹی کے خلاف ہڑتال میں حصہ لیتے ہیں اور لکھنؤ کے جیل میں قید ہوتے ہیں۔ ناول کے واقعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے جیسے دہلی لکھنؤ کا ایک حصہ ہے اور گورنر کا صوبہ ہے۔ اسی ناول میں مینا کا قتل دکھایا گیا ہے مگر قتل کے بعد آخر تک ایک جگہ بھی قاتل کا ذکر نہیں آتا ہے ایسے اہم کردار کا یوں غائب ہو جانا اور قارئین کو اس کے انجام سے بے خبر رکھنا اس ناول کی بہت بڑی خامی ہے۔ مگر اُن کے یہاں ایسی خامیاں عام نہیں ہیں۔ اس لیئے گوارا ہیں۔

مرزا محمد سعید

پریم چند کے بعد قابلِ ذکر ناول نگار مرزا محمد سعید، نیاز فتحپوری سدرشن اور عظیم بیگ چغتائی ہیں۔ مرزا محمد سعید دو ناولوں خوابِ ہستی اور یاسمین کے مصنف ہیں مرزا صاحب کے ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سب سے پہلے اُن کی انشاء پردازی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اس کے بعد اُن کی اس خوبی کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی قوتِ مشاہدہ میں بہت گہرائی ہے۔ اُن کا پہلا ناول "خوابِ ہستی" اس اعتبار سے ذرا کمزور ہے کہ اس میں پلاٹ کی کچھ خامیاں ہیں اور کہیں کہیں کردار نگاری میں بھی سقم ہے۔ مگر دوسرے ناول "یاسمین" میں ان کا فن پورے جوبن پر ہے

نیاز فتحپوری

نیاز فتحپوری نے "شہاب کی سرگذشت" لکھ کر ناول کی دنیا میں بھی انمٹ نقوش ثبت کر دیے ہیں۔ اُن کا یہ ناول ایک اچھے اور معیاری ناول کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں ہماری معاشرت سے لیکر مناظرِ فطرت تک ہر چیز موجود ہے۔ کرداروں کے جذبات و احساسات کے بیان میں خاص طور پر بڑی دلکشی اور لطافت سے کام لیا ہے۔ اندازِ بیان کی ندرت اور شگفتگی اُن کی تحری

تحریروں کی طرح اسمیں بھی موجود ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ اس کے مکالمے کسی قدر طویل ہیں اور اُن میں کسی حد تک تکلف سے بھی کام لیا گیا ہے۔

فیاض علی — "شمیم" و "انور" کے مصنف فیاض علی بھی اس دور کے بہت مشہور ناول نگار ہیں۔ اُن کے متذکرہ ناولوں نے تو ایک زمانے میں صوبۂ متحدہ کے ہر گھر میں ناول بینی کا غلغلہ ڈال دیا تھا۔ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا ہو جس نے "شمیم" اور "انور" نہ پڑھے ہوں۔ اُن کے یہ دونوں ناول خالص رومانوی نقطۂ نگاہ کے حامل ہیں نقطۂ نگاہ اور نظریات کا اختلاف بالکل علیحدہ چیز ہے اور ممکن ہے مستقبل کا مورخ اُن پر الزام لگائے کہ انہوں نے بھوک، افلاس، فاقہ کشی اور غلامی جیسی لعنتوں کی موجودگی میں ان سے برسرپیکار ہونے کی بجائے رومان کی ٹھنڈی چھاؤں میں پناہ لی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض بجا و درست ہے۔ مگر اس سے بھی تو انکار نہیں ہو سکتا کہ عشق کا جذبہ بھی ناقابل نظر انداز ہے اور انسانی فطرت کا بہت اہم اور نازک پہلو ہے جس کی عکاسی نہ کرنا فطرتِ انسانی کی مقتضیات سے رو گردانی کرنا ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک اس جذبہ کی عکاسی کا تعلق ہے فیاض علی نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

فیاض علی بہت فاضل اور وسیع مطالعہ رکھنے والے فنکار ہیں مشرقی زبانوں کے علاوہ انگریزی ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہندوستانی کرداروں میں بھی مغرب کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ رومان کے بیان میں عریانی اور فحاشی کو قریب بھی نہیں آنے دیتے یہ اُن کا بہت بڑا کمال ہے۔ ان کے کردار زندگی اور رعنائی کی زندہ تصویریں ہیں اگر اُن کی کردار نگاری کا اندازہ کرنا ہو تو اُن کے ناول "انور" کے ایک کردار "ممتاز" کا مطالعہ کیجئے۔ اُن کی عبارت میں بڑی شگفتگی ہے زبان اور الفاظ دونوں پر اُنہیں بڑی قدرت ہے۔ اُن کے ناولوں کا مطالعہ کرنے

سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ادب و انشاء پر حکومت کر رہے ہوں۔ کاش اُن
کی نازک اور اہم مصروفیات انہیں اجازت دیتیں اور وہ اُردو زبان کو کچھ اور ناول
دے جاتے کچھ غمِ جاناں سے متعلق اور کچھ غمِ دوراں سے متعلق۔

عظیم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی اُن مصنفوں میں سے ہیں جنہیں قبولیتِ عامہ
کی سند مل چکی ہے۔ اس قبولیتِ عامہ میں اُن کی ظرافت نے
نمایاں کردار ادا کیا ہے بلکہ سارا کریڈٹ اسی کو پہونچتا ہے۔ مرزا صاحب کی تصانیف
میں "روحی"، "خانم"، "شریر بیوی"، "کولتار"، "چمکی" اور "کھرپا بہادر" خاص طور سے قابلِ
ذکر ہیں۔ ان میں سے "خانم" اور "چمکی" ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ان ناولوں کی سب سے
بڑی خصوصیت کرداروں کی جاذبیت ہے۔ اُن کے کرداروں میں بڑی زندگی ہوتی
ہے۔ جذبات نگاری میں انہیں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت
بڑے فن کار تھے۔ اُن میں ایک اچھے ناول نگار کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔

شوکت تھانوی

شوکت بھی منشی سجاد حسین اور عظیم بیگ کے زمرے میں شامل
ہیں۔ یعنی اُن کے ناول بھی ظرافت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ شوکت
کے پلاٹ کسی قدر بے جان ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنی ظرافت سے اُن میں ایسی جان پیدا کر دیتے
ہیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے "بے جان" ہو جاتا ہے۔ اُن کی تحریر میں بڑی روانی
اور شگفتگی ہے۔ اُن کے ناولوں میں ہنسی بھی ہے۔ تبسم بھی اور قہقہے بھی۔ اور حقیقت
یہ ہے کہ انہوں نے منشی سجاد حسین اور مرزا عظیم بیگ کے بنائے ہوئے راستہ
پر چل کر ایک اور راستہ بنایا ہے۔ ایسا راستہ جو انہیں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔
اُن کے ناولوں میں سے "سودیشی ریل"، "مسمہ خاتون"، "خانم خان"، "بکواس"، "بیوی"
اور "خدانخواستہ" اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اردو زبان و ادب زندہ ہے۔
مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بعد ناول نگاروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے

نئے حالات و واقعات سے گہرا اثر قبول کیا۔ دنیا کی پہلی جنگِ عظیم اور انقلاب روس کے بعد ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں نئی نئی تحریکیں جاری ہوئیں غریبوں اور مزدوروں کے حق میں آوازیں بلند ہوئیں سرمایہ اور محنت کی کشمکش شروع ہوئی۔ ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنے نظریات تبدیل کرنے پڑے ادب میں بھی نئے رجحانات نے جنم لیا اس نئے دور کے نقیبوں میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، رشید اختر ندوی، رئیس احمد جعفری، عصمت چغتائی، اُپندر ناتھ اشک، عزیز احمد قیسی رامپوری، قرۃ العین حیدر اور فضل حق قریشی، . . . . . خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اُردو ناول کی بیش از بیش خدمت کی اور ناول کے فن کو بلند سے بلند تر کیا۔ اور اسے زندگی کے تقاضوں سے روشناس کیا۔

سجاد ظہیر

سجاد ظہیر عملی اور ذہنی ہر اعتبار سے اشتراکی ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کا ناول "لندن کی ایک رات" اشتراکیت کے پراپیگنڈے کیلئے وقف ہو گیا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ پراپگنڈہ انھوں نے نہایت سلیقے سے کیا ہے اور ایک جگہ بھی فن کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے اُن میں ایک اچھے فنکار کی تمام خوبیاں ہیں۔ کاش وہ صرف فنکار ہی رہتے اور اگرچہ اور ہوتے تو صرف نظریات تک رہتے تاکہ ان کی فنکاری اردو کو چند اور لازوال ناول دیتی

کرشن چندر

"شکست" کرشن چندر کا مشہور ناول ہے انھوں نے اس ناول میں منظر نگاری کے حیرت انگیز شاہکار پیش کئے ہیں۔ جذبات کی تصویر کشی کرتے ہوئے جذبات نگاری کے اچھوتے مرقع دکھائے ہیں۔ ماحول کی کامیاب اور موثر عکاسی کی ہے۔ اسلوب نگارش میں بڑی دلکشی ہے۔ رومان اس سارے ناول پر چھایا ہوا ہے۔ بقول احتشام حسین (اس ناول میں، خیال ہے کہ میرے خیال میں اگر اسے ناول کی بجائے رپورتاژ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہے) ۔

عمل ہے اور تصادم ہے۔ اس عمل اور تصادم میں زندگی عریاں در قصاں نظر آتی ہے"
رشید اختر ندوی اس دور کے مشہور مورخ اخبار نویس بعد
رشید اختر ندوی ناول نگار ہیں۔ اُن کے مشہور ناولوں میں "ساز شکستہ"
"سوز درد دل" "سودائی" "ہرجائی" "تشنگی" "تنہیاں" "نشان راہ" "نشیمن" "اُس
نے محبت کی" "پندرہ اگست" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ رشید اختر ندوی کے
ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سب سے پہلے اُن کی زبان اور بیان کی خوبی
کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ان کے قلم میں بڑی روانی ہے۔ اُن کی زبان اور بیان
کی خوبی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اُن کے قلم میں بڑی روانی ہے۔ اُن کی زبان
میں بڑا تیکھا پن ہے۔ اُن کے یہاں زندگی ہے، جوانی ہے۔ رعنائی ہے۔ اُن میں
جذبات نگاری کا بڑا سلیقہ ہے۔ اُن کے کردار بڑے جاندار ہیں وہ خود جس
قدر مدہوش رہتے ہیں ناول نگاری میں اسی قدر ہوش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ان میں
ایک اچھے ناول نگار اور اعلیٰ درجے کے فنکار کی ساری خوبیاں موجود ہیں جنہیں
انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ سے صفحۂ قرطاس پر پھیلا دیا ہے۔ اب انہوں نے تاریخی
ناولوں کی طرف توجہ دی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں انکا پہلا تاریخی ناول "سرنگاپٹم" کے
نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ ناول ہندوستان کے مجاہدِ اعظم ٹیپو سلطان کی زندگی
کے گرد گھومتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ رشید اختر ندوی کی فنکارانہ صلاحیتوں
کی منہ بولتی تصویر ہے اور ثابت کرتی ہے کہ مصنف بلند پایہ ناول نگار ہونے کے
علاوہ ایک فاضل مورخ بھی ہے۔ جسے تاریخ کے ہر گوشہ پر پورا عبور حاصل ہے
ہمارے ناول کے سرمایہ میں رئیس احمد جعفری نے بھی قابلِ قدر
رئیس احمد جعفری اضافہ کیا ہے اُن کے مشہور ناولوں میں "باغی" "روسیاہ" "دلِ
مشکول" "عورت" اور "سیما" قابلِ ذکر ہیں اُن کی دوسری تصانیف کی طرح ان کے

ناولوں میں بھی زبان و بیان کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ انہیں اپنے قلم پر غیر معمولی قدرت ہے۔ اُن کے ناولوں کے پلاٹ بڑے جاندار ہوتے ہیں اُن کے کرداروں میں بہت زندگی ہوتی ہے اُن کے یہاں جذبات کا بہت خوبصورت بہاؤ ملتا ہے جسمیں پڑھنے والا رکنے کی ہزار کوشش کے باوجود بہہ جاتا ہے۔ ان کا ایک تاریخی ناول بھی سومنات کے نام سے شائع ہوا ہے سومنات میں ایک اچھے ناول کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں اسکی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے حقائق اصل صورت میں موجود ہیں پلاٹ بنانے کیلئے اُن کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ رئیس چوٹی کے فنکار ہیں اور ان کے ناول ان کے فن کی ضمانت ہیں۔

عزیز احمد ہمارے موجودہ ناول نگاروں میں عزیز احمد بہت بلند مقام کے مالک ہیں انکے ناول "مرمر اور خون" "ہوس" اور "گریز" زندہ رہنے والی چیزیں ہیں لیکن ان میں سے "گریز" بہت بلند پایہ ناول ہے جسمیں محبت سے لیکر نسلی اور جغرافیائی تعصبات تک ہر چیز کی بڑی کامیاب عکاسی کی گئی ہے اسکے پلاٹ میں بڑے سلیقے اور باخبری سے کام لیا گیا ہے۔ کاش عزیز احمد زبان کے معاملے میں ذرا احتیاط سے کام لیں۔

قیسی رامپوری قیسی رامپوری بھی اس دور کے مشہور ناول نگار ہیں انکی تصانیف بہت مقبول ہیں۔ ان کے ناولوں میں "دھوپ" "خطا" "خیانت" "امراؤ" اور "اپاہج" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے ناول خصوصاً "اپاہج" اور اسکا ایک کردار "کشوری" اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ بہت اونچے فنکار ہیں۔

نسیم حجازی نسیم حجازی بھی اس دور کے کامیاب اور مقبول ناول نگار ہیں شاید ہمارے ناول نگاروں میں رشید اختر ندوی کے بعد جس

ناول نگار کے ناول اس قدر کثرت سے پڑھے گئے ہیں اور اُن کے اتنے کثیر ایڈیشن چھپے ہیں وہ نسیم حجازی ہیں۔ اُن کے ناول تاریخ کے گرد گھومتے ہیں۔ اُن کی تصنیفات میں "جب خون بہہ رہا تھا" "آخری چٹان" "محمد بن قاسم" اور "یوسف بن تاشفین" وغیرہ بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ انہوں نے عبدالحلیم شرر کے لگائے ہوئے باغ کی آبیاری کی ہے اور اُس میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کا اسلوب نگارش بہت سادہ عام فہم اور شگفتگی لئے ہوئے ہے۔ انہیں اپنے قاری کو متاثر کرنے میں کمال حاصل ہے۔ جذبات نگاری اُن کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔

ایم اسلم ایم اسلم نے جس قدر کثیر تعداد میں ناول لکھے ہیں اُتنے شاید ہی کسی اردو زبان کے ناول نگار کے قلم سے نکلے ہوں۔ اُن کا نقطۂ نگاہ اصلاحی ہے وہ اپنے قارئین کے سامنے چودہ سو سال پہلے کا نقشہ پیش کر کے انھیں اس زمانے کی طرف واپس لانا چاہتے ہیں۔ اس مقصد اور جذبہ کی پاکیزگی سے تو انکار نہیں ہو سکتا اور بعض بعض جگہ انہوں نے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرنے میں بڑی فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی وہ اچھے فنکار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے قارئین میں اسلامی روح پیدا کرنے کی کوشش میں وعظ و نصیحت کا انداز اختیار کر لیا ہے۔ زندگی کے اہم ترین تقاضوں اور سماجی و طبقاتی کشمکش کو انہوں نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ بہر حال یہ خوبی بھی کچھ کم نہیں ہے کہ وہ بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ صفِ سوم کے ناول نگار ہیں۔

دیگر ناول نگار ان ناول نگاروں کے علاوہ جن پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ ہمارے یہاں کچھ اور ناول نگار بھی ہیں اور اُن میں سے بعض نے بڑے لاز وال قسم کے ناول پیش کئے ہیں۔ ان لوگوں میں سے قرۃ العین حیدر ایک کامیاب فنکار ہیں اور ان کا ناول "میرے بھی صنم خانے" اور تازہ ترین ناول کامیاب

کوششیں ہیں۔ صادق القادری کا "دوشیزۂ صحرا"، اشرف صبوحی کا "بغداد کا جوہری" اور
اے آر خاتون کا "شمع"، اردو زبان کے اچھے ناول ہیں۔

اردو ناول کا مستقبل اردو ناول کا سرسری جائزہ لینے کے بعد بھی اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ناول نے بہت ترقی کی ہے اور ہنوز ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں ایسے ناول کم ہیں جو مغربی زبانوں کے ناولوں کے مقابلے میں پیش کئے جا سکیں۔ مگر ایسے ناول ناپید نہیں ہیں۔ اگر ہمارے اہل قلم کو اقتصادی الجھنوں سے نجات مل جائے جس کی بہت کم پبلشروں سے توقع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے ناول نگار انسانی نفسیات، عمیق مشاہدہ اور وسیع تجربے سے کام لیں۔ مشرقی زبانوں کے ساتھ ساتھ مغربی زبان کا بھی مطالعہ کریں بلکہ اُن پہ پورا عبور حاصل کریں تو اردو ناول کا مستقبل بہت روشن ہو جائے گا۔

❁

ہمارا افسانوی ادب

ہماری افسانہ نگاری کا دور دراصل ڈپٹی نذیر احمد کے بعد شروع ہوتا ہے
جسے مختصر افسانہ نگاری کا دور کہنا چاہیئے۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم وہ پہلے اہل قلم ہیں جنہوں
نے خیالی داستانوں کے حصار سے نکل کر حقیقت نگاری کی طرف توجہ دی ہماری
روزمرہ کی زندگی اور گھریلو معاملات پر کڑی تنقید کی معاشرت کی خامیوں اور مجلسی
زندگی کی برائیوں پر سوچنا سکھایا۔ "توبۃ النصوح" ہماری موجودہ زنجیر احساس کی پہلی
کڑی مگر ڈپٹی نذیر احمد کی تخلیقات افسانوی ادب کے ذیل میں آتی ہیں۔ وہ ناول نگار
تھے۔ ان کی تخلیقات ناول کے ادب میں بہت اونچا مقام رکھتی ہیں اور انہیں ہمیشہ
قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن
کے بعد آنے والے اہل قلم نے انہیں کے چراغ سے اپنے چراغ جلائے اور انہیں کی تحریک (اصلاحی
تحریک) کو مختصر افسانہ نگاری کے روپ میں پیش کیا۔ ان لوگوں میں منشی پریم چند کا
نام سرفہرست ہے۔ یہیں سے ہماری مختصر افسانہ نگاری کا دور شروع ہوتا ہے۔

منشی پریم چند اردو زبان کا پہلا افسانہ نگار ہے جس نے افسانہ نگاری کو ایک
مکمل فن کی حیثیت دی۔ پریم چند سے پہلے ہمیں داستانیں ملتی ہیں۔ بالکل بیانیہ انداز
کی۔ بہت طویل اور ضخیم۔ پریم چند وہ پہلا شخص ہے جس نے سات سات جلدوں میں مشتمل
ختم ہونے والی داستانوں کو چند صفحات میں بیان کیا اور ان کے ذریعہ زندگی کے
مختلف شعبوں کی اصلاح کا کام لیا۔ عوام میں قومیت اور وطنیت کا شعور بیدار
کرنے میں پریم چند کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اس نے
راجپوتوں کی شجاعت، غیرت اور وضعداری کے واقعات یاد دلا کر ہندو عوام میں اُن

کے شان دار ماضی کی روایات قائم کرنے کی بہت ہی کامیاب کوشش کی "رانی سارندھا" اور "گناہ کا اگن کنڈ" پریم چند کے ان کامیاب ترین افسانوں میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف ہندو سوسائٹی پر ایک دیرپا اثر چھوڑا بلکہ ہندوستان کی تمام قوموں کو اپنا ماضی ٹٹول کر تابناک مستقبل کی طرف چلنے کی دعوت دی۔

پریم چند کے افسانوں میں ہندو رسم و رواج اور اچھوتوں کے مشہور کارناموں کا کثرت سے بیان دیکھ کر بعض نقاد انہیں ایک مخصوص طبقے یا سوسائٹی کا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں اور انہیں صرف ہندو مذہب کا پرچارک سمجھتے ہیں مگر ایسا کہنا پریم چند کے ساتھ زیادتی کرنے والی بات ہے۔ پریم چند کی یہی تو سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے اُن واقعات اور اُس ماحول سے فائدہ اٹھایا ہے اور انہیں کی عکاسی کی ہے جو اُن کا گہوارہ تھے۔ انہوں نے سنی سنائی باتوں یا قیاسیات سے کام لیکر خیالی عمارتیں کھڑی کرنے سے ہمیشہ نہیں تو اکثر ضرور اجتناب برتا ہے۔ اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ انہوں نے جس ماحول میں جنم لیا تھا اور جس فضا میں پروان چڑھے تھے اُسی دنیا کی رسم و رواج کے ناقد تھے۔ کیونکہ وہ اُس کی جزئیات تک سے واقف تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں حقیقت کی بہت ہی کامیاب تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ پریم چند وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جن کے ہاتھوں موجودہ افسانے کی بہت سی خصوصیات افسانہ نگاری میں داخل ہوئیں۔ ان میں سے کردار نگاری خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ پریم چند نے کرداروں کو متحرک دکھا کر انہیں جامد بنانے کی روایت کو توڑا اور بتدریج بلندی کی طرف لے جا کر ہماری افسانہ نگاری کو نہم و ادراک اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے قریب کر دیا۔ ان کے یہاں نقطۂ نگاہ کا فقدان نہیں ہے۔ بلکہ ہر

جگہ سمت مندی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ پریم چند ہمارے مختصر افسانے کے نقاش اوّل ہونے کی وجہ سے افسانہ نگاری پر سے ناول نگاری کے اثرات کو مکمل طور پر دور کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے اُن کے یہاں ایسے افسانوں کی کمی نہیں ہے جن میں انھوں نے ایک چیز کی اور خصوصاً دیہاتی زندگی کی جزئیات تک کو بلا ضرورت بڑی تفصیل سے دکھایا ہے۔ یہ انداز ناول کے لئے تو مناسب ہے مگر افسانہ غیر ضروری تفصیلات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جہاں تھوڑے وقت میں بہت سی باتیں کہنی ہوں وہاں "اشاریت" ہی سے کام لیا جا سکتا ہے۔

پریم چند کے افسانوں کی اشاعت کے بعد اُن کی زندگی ہی میں جن لوگوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ اُن میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، سدرشن، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر اور عباسی حسینی نمایاں لکھنے والوں میں شامل ہیں۔ ان میں سے سدرشن پریم چند کی روش سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور اصلاحی رنگ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے پریم چند سے زیادہ "اشاریت" سے کام لیا۔ تشبیہات اور استعارات کے معاملے میں بھی انھوں نے غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ اگر کسی کو افسانہ نگاری میں شاعری دیکھنی ہو تو وہ سدرشن کے افسانے پڑھے۔ "شاعر" ایسی ہی خصوصیات کے حامل افسانوں میں سے کامیاب ترین افسانہ ہے۔ زبان و بیان اور تصویر کشی تینوں اعتبار سے وہ پریم چند سے آگے ہیں۔

فنی اعتبار سے اُن کے یہاں ایک خامی بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کے فسانے کا ایک حصہ پڑھ کر دوسرے حصے میں پیش آنے والے واقعات اور اُن کے نتائج کا قبل از وقت اندازہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانہ ختم کرنے کے بعد قاری افسانے کا متوقع انجام دیکھ کر حیرت کا اظہار نہیں کرتا ہے۔ یہ سپاٹ پن بعض اوقات افسانے کو بہت ہی بے جان بنا دیتا ہے مگر اُن کے یہاں یہ خامی ظلم

نہیں ہے۔

پریم چند اور سدرشن کے بعد تیسرے افسانہ نگار علی عباس حسینی ہیں جن کا ہماری افسانہ نگاری کے ارتقا میں بہت بڑا حصہ ہے۔ پریم چند اور سدرشن کے افسانوں میں ایک خامی تھی اور وہ تھی کہانی میں تنظیم قصہ کی ترتیب کی کمزوری۔ جس سے کہیں کہیں او پریم چند اور سدرشن کی طرح کسی خاص واقعہ یا اُس کے ایک پہلو کو لے کر اپنے افسانے کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس کے کردار ایک ایک کرکے قاری کے سامنے سے گذرنے لگے اور پڑھنے والے پر ایسا خوشگوار اثر چھوڑ گئے جس نے پوری افادیت پیدا کردی اور قاری کے ذہن کو منتشر ہونے کی بجائے مجتمع رکھا۔

ہماری مختصر افسانہ نگاری میں جس کا دور پریم چند سے شروع ہوتا ہے۔ انسانی نفسیات سے کام لیا گیا ہے۔ پریم چند اور سدرشن کے یہاں یہ خوبی علی الترتیب ارتقا کے تدریجی درجہ میں نظر آتی ہے۔ ان کے بعد علی عباس حسینی نے اپنے افسانوں میں نفسیات سے براہ راست کام لیا ہے اور اس خوبی کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ نفسیات اور فن کے حسین امتزاج کی مثال میں ان کے دو افسانے "بھوکی ہتنی" "بوڑھا بالا" پیش کئے جا سکتے ہیں۔ افسانے کی وہ اہم ترین خصوصیت جسے "اشاریت" کہنا چاہیئے علی عباس حسینی کے افسانوں میں نہ صرف بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو بلاغت کا بہت خوبصورت نمونہ بن گئی ہے۔ اُن کی اس خوبی نے بعد کے افسانہ نگاروں کے لئے راستہ کی ایک بہت بڑی رکاوٹ کو دور کر دیا۔ حسینی کی ایک اور بہت بڑی خصوصیت جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ پریم چند کے دور کے افسانہ نگار ہیں اور پرانی قدروں کے شناسا مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے ہر قدم پر زمانے کا ساتھ دیا ہے اور وقت کے تقاضوں کے

ساتھ ساتھ اپنی افسانہ نگاری کا رُخ موڑ دیا ہے۔ حسینی کی کامیابی میں جس چیز کو سب سے زیادہ دخل ہے وہ اُن کی دردمندی ہے۔ انہوں نے انسانی فطرت کے اس سب سے زیادہ نازک جذبے سے کام لے کر اپنے افسانوں کی فضا بہت زیادہ پر تاثیر بنادی ہے اور پڑھنے والوں میں اپنے کرداروں سے بہت ہمدردی پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بعض افسانوں پر بظاہر یاس کا غلبہ نظر آتا ہے۔ مگر ایسی یاس نہیں جسے میر کی قنوطیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انہوں نے آنسوؤں سے کام لیا ہے انھیں بلاوجہ مٹی میں نہیں ملایا ہے۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں جن کے یہاں مقصدیت اور انسانیت دونوں کے بہت دلکش مرقع نظر آتے ہیں کچھ اور لوگ بھی ہیں اور یہ اعظم اور افسر میرٹھی ہیں۔

اس دور میں جب یہ مخلص افسانہ نگار معاشرے کی اصلاح اور انسانیت کی سچی خدمت میں مصروف تھے۔ افسانہ نگاروں کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو رہا تھا۔ جس نے حیاتِ انسانی کے ایک ایسے پہلو کی ترجمانی کی جو بظاہر غیر ضروری تھا اور جس میں افادیت نہیں تھی۔ یعنی افسانہ نگاری میں رومانیت۔ رومانیت میں کوئی افادیت ہے یا نہیں؟ یہ بات اپنی جگہ خود بہت کافی بحث طلب ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رومانی نقطۂ نگاہ بھی ایک ایسا نقطۂ نگاہ ہے جسے ترک کرنا زندگی کے ایک اہم تقاضے سے روگردانی کرنے کے مترادف ہے۔ مگر اس کا کثرت سے اظہار، اتنی کثرت سے کہ وہ حیاتِ انسانی کے دوسرے تمام تقاضوں پر غالب آجائے۔ یقیناً مقصدیت اور افادیت سے انحراف ہے۔ اس گروہ میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور لطیف الدین خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ سجاد حیدر دراصل مترجم تھے۔ اُن کے ذریعے سے اُردو ادب ایرانی اور ترکی افسانوں سے روشناس ہوا۔ انھوں نے کچھ طبعزاد افسانے بھی

لکھے۔ مگر ان میں سے بیشتر میں کسی نہ کسی غیر زبان کے افسانے سے ضرور مدد لی گئی ہے۔
ترکی اور ایرانی دونوں زبانوں کے ادب میں رومان انگیز داستانوں کی کثرت ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ جب سجاد حیدر نے ترجمہ کرنے کے لئے قلم اٹھایا تو ان کے سامنے وہ افسانے
تھے جو عشق و محبت کے واقعات سے لبریز تھے۔ انھوں نے نہایت بے تکلفی سے
انھیں اردو کے قالب میں ڈھال دیا۔ ترکی زبان کے وہ افسانے جنھیں انھوں نے فن کی
چابکدستی سے اردو میں منتقل کیا۔ ان کی ملکیت قرار پا چکے ہیں۔ کیونکہ ترجمے کی خوبی نے
انھیں بالکل طبع زاد بنا دیا ہے۔ انھوں نے جذبات نگاری کے جو شاہکار پیش کئے
ہیں اگر ان میں بعض ادق الفاظ اور بعض جگہ عربی کے فاضل علماء کا سا انداز نہ ہوتا تو
ہم انھیں سدرشن سے بلند درجہ دیتے میں حق بجانب تھے۔ مگر اس خامی کے باوجود جو
ان کے یہاں کہیں کہیں ہے بحیثیت مجموعی ان کے افسانے لازوال حیثیت رکھتے
ہیں۔ جن میں فن جذبات اور نفسیات تینوں کا اتصال ہے۔ "جہاں پھول کھلتے تھے"
"کلوپیٹرا" اور "ویران صنم خانے" سدا بہار سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

رومانی اسکول کے دوسرے افسانہ نگار نیاز فتحپوری ہیں۔ نیاز بنیادی طور پر
شاعر ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں ادیب بھی نقاد بھی اور افسانہ نگار بھی۔ ان کے مزاج میں
لاابالی پن ہے۔ مگر ایسا لاابالی پن ایک ایسی بے راہ روی جو راہ و رسم منزل سے
بے نیاز ہونے کے باوجود بھی اپنے لئے ایک راستہ بناتی ہے۔ عام راستے سے مختلف جو
سنہرے خوابوں کے جزیروں میں جا کر گم ہو جاتا ہے۔ نیاز کے افسانے ان کے گہرے
شعور اور نازک احساسات کا آئینہ دیتے ہیں جو صرف نازک ہی نہیں لطیف بھی ہیں
ان کی دنیا صرف اور صرف محبت ہے۔ ان کی منزل حسن اور صرف حسن تک
رسائی ہے۔ وہ اس گروہ کے سب سے بڑے اور کامیاب افسانہ نگار ہیں جسے
رومانی اسکول کہا جاتا ہے۔ ان کے انداز تحریر پر شروع سے آخر تک عورت چھائی

ہوئی ہے۔ انہوں نے عورت اور اس کے متعلقات پر اس کے فطرت اور اس کے
احساسات پر پوری طرح ڈوب کر غور کیا ہے۔ اس کے ہر ہر پہلو کو بہت قریب سے
دیکھا ہے۔ انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ انشا پردازی کے کمال اور جذبات
کی مصوری میں وہ اپنے گروہ کے لوگوں میں سب سے آگے ہیں۔ ان کے افسانوں میں
سے "زائر محبت" اور "کیوپڈ و سائکی" اس وقت تک زندہ رہیں گے جب
تک ہمارے لطیف احساسات زندہ ہیں۔

معلوم نہیں رنگ و بو اور حسن و نغمہ کا یہ سیلاب کہاں رکتا جو نیاز اور ان کے
ہم خیالوں کے ہاتھوں آیا تھا کہ دنیا کے اقتصادی حالات خراب ہو کر ایک نئے سیاسی
اور اقتصادی نظریے کو جنم دینے کا باعث ہوئے۔ یورپ سے ایک تحریک اٹھی۔
دکھوں کی چیخ و پکار اور مظلوموں کی فریاد لئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بساط عالم پر
چھا گئی۔ ہمارا ادب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کرشن چندر اور سجاد ظہیر وغیرہ کے ہاتھوں ترقی
پسند ادب کی بنیاد پڑی۔ جنھوں نے آہ و فریاد کے ہنگامے میں رباب کی تانوں اور رقاصہ
کے زاویہ ہائے رقص کی موجودگی کو بے وقت کی راگنی قرار دیا۔ ان کی نیتوں میں خلوص
تھا اور مقاصد میں بلندی۔ اس لئے اس تحریک نے بہت جلد اردو ادب میں جگہ حاصل
کر لی اور ہماری افسانہ نگاری میں بھی انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اس میں شک نہیں
کہ اردو افسانہ نگاری میں منشی پریم چند، علی عباس حسینی اور سدرشن وغیرہ کے ذریعہ
اس تحریک سے بہت پہلے انقلاب آگیا تھا۔ مگر ان کی مقصدیت ایک خاص طبقے تک
محدود تھی۔ کرشن چندر اور ان کے ساتھیوں کے ذریعہ جس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی
اس میں بہت ہمہ گیری تھی۔ ان کے مسائل کسی ایک ملک یا ایک قوم کے نہیں
تھے۔ بلکہ روئے زمین پر بسنے والے تمام غریب، مفلوک الحال اور سرمایہ داری
کے بوجھ تلے پستے ہوئے عوام ان کے افسانوں کے متحرک کردار تھے۔ کرشن چندر،

احمد علی، سردار جعفری اور ڈاکٹر رشید جہاں نے اس تحریک کے زیر اثر جو افسانے لکھے وہ اس حیثیت سے افسانہ نگاری کی تاریخ میں بہت اہم مقام رکھتے ہیں کہ ان میں غریبوں اور مظلوموں کے دکھ کو اپنا دکھ اور ان کے مسائل کو کائنات کے بنیادی مسائل قرار دیا گیا ہے۔ ان لوگوں میں سے احمد علی اور رشید جہاں کے یہاں جذبات کی شدت اور مسائل کی سیاسی نوعیت نے بعض بعض جگہ افسانہ نگاری کے فنی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا ہے "شعلے" اسی انحراف کا مکمل ثبوت ہے۔ ان افسانوں میں افسانویت سے زیادہ ایک سیاسی رہنما کی تقریر کا سا انداز ہے جو مجمع کو انگیخت کرنے کیلئے جذبات کے سیلاب میں بہائے لئے جا رہا ہے۔ مگر یہ انداز بیان زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا اور اس مکتبۂ فکر کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا سجاد ظہیر کے یہاں ہمیں مقصدیت اور افادیت کے ساتھ افسانویت بھی ملتی ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کے فن کا پورا لحاظ رکھا ہے اور اگر اسے بلند نہیں کیا تو پست بھی نہیں ہونے دیا۔

اس گروہ کے سب سے زیادہ کامیاب افسانہ نگار کرشن چندر ہیں۔ باوجودیکہ انھوں نے بھی بعض جگہ مضمون اور افسانے کے فرق کو فراموش کر دیا ہے اور سیاسی نظریات کی شدت نے کہیں کہیں انھیں ایک روزنامہ اخبار کا ایڈیٹر بنا دیا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی انھوں نے ہمارے افسانوی ادب پر بہت گہرے نقش بنائے ہیں۔ اتنے گہرے کہ پریم چند جیسا عظیم افسانہ نگار بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "کفن" اس کا زندہ ثبوت ہے۔ کرشن چندر نے زندگی کی کامیاب مصوری کی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر میں آفاقیت ہے انھوں نے رومانیت کو بھی فراموش نہیں کیا بلکہ اسے بھی مقصدیت کے لئے استعمال کیا۔ ان کے یہاں طنز ہے مگر بہت ہی بھرپور۔ "ان داتا" ان کی افسانہ نگاری

کا شاہکار ہے۔ جس میں طنز اپنے عروج پر ہے "ٹوٹے ہوئے تارے"، "ہم وحشی ہیں" اور سمندر دور ہے اُن کے لافانی شاہکار ہیں۔

کرشن چندر کے بعد اونچے درجے کے جس افسانہ نگار نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا وہ عصمت چغتائی ہیں۔ عصمت نے زیادہ تر مسلمان شرفا اور کہیں کہیں درمیانی طبقے کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ خاص طور پر صوبہ متحدہ کے مسلمان گھرانوں کی خانگی زندگی، مستورات کے غلط اور بیجان عقیدے اور جھوٹی رسمیں اُن کے تابڑ توڑ حملوں سے بلبلا اٹھیں۔ یہ صحیح ہے کہ کرشن چندر کے مقابلے میں محدود ہے۔ اور انہوں نے ایک خاص طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ انسان جس طبقے یا جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کی صحیح ترجمانی کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اسکی معمولی سے معمولی جزئیات تک سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر اپنے افسانوں میں اُن مقامات پر اکثر ٹھوکر کھاتا نظر آتا ہے۔ جہاں جہاں اُس نے سنی سنائی باتوں پر تکیہ کیا ہے۔ عصمت چغتائی نے "لحاف" لکھ کر ہماری جدید افسانہ نگاری میں ایک ایسے موضوع کو استحکام بخشا جو کیا ز اور "انگارے" کے مصنفین نے داخل کئے تھے۔ یعنی جنسیات "لحاف میں عصمت کا فن پورے عروج پر ہے اور افسانوی ٹکنیک کا پوری طرح سے احاطہ کرتا ہے۔ مگر اس میں انھوں نے جذبات کو عریاں کر کے پیش کیا ہے اور جنسیات کے نظر فریب پردے میں مقصدیت روپوش ہو گئی ہے۔ عصمت کے افسانوں کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اپنے کرداروں کے لئے جو زبان استعمال کی ہے اُس سے ہر کردار کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے بحیثیت مجموعی عصمت چوٹی کی افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا اسلوب نگارش، تندردار مکالمے، کامیاب کردار نگاری، اور کہانی

کی ترتیب یہ ایسی خصوصیات ہیں، جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

کرشن چندر، کے گروہ کے دوسرے افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، اختر اورینوی، ممتاز مفتی، انتظار حسین، بلونت سنگھ، قرۃ العین، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمارے افسانوی ادب میں قابل قدر اضافے کئے۔ افسانے کے فن کو بلند کیا اور اسے عظمت بخشی۔

ندیم اور منٹو ان دو افسانہ نگاروں نے افسانے کی ہیئت میں حیرت انگیز تبدیلی کی۔ ندیم نے اپنے افسانوں میں گاؤں کی زندگی کی بہت ہی کامیاب اور فطری تصویریں کھینچی ہیں جو اصل سے بہت زیادہ قریب بلکہ اکثر جگہوں پر اصل کی مانند ہیں۔ اُن کے کردار بولتے ہوئے کردار ہیں۔ اُن کے افسانوں کی فضا گہرے تاثر میں ڈوبی ہوئی فضا ہے۔ پریم چند نے بھی اپنے افسانوں میں گاؤں کی زندگی، کسانوں کی مشکلات، اُن کی غربت اور ان کی زندگی کے گھناؤنے پہلو دکھائے ہیں۔ ندیم کے یہاں ایک چیز اور بھی ملتی ہے جو انھیں پریم چند سے ممائز کرتی ہے۔ ندیم نے گاؤں کی غربت اور وہاں کی زندگی کے تاریک پہلو کے ساتھ ساتھ ایک روشن پہلو بھی دکھایا ہے اور وہ ہے گاؤں والوں کی فطری سادگی اور نیکی، بلند اخلاقی اور ہمدردانہ جذبہ۔ اُن کا افسانہ "گنڈاسا" انھیں خصوصیات کا کامیاب مرقع ہے۔

پریم چند اور ندیم میں ایک فرق اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پریم چند نے گاؤں کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے۔ اُس کی جزئیات تک کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش نے اُن کے افسانوں میں بعض جگہ اکتا دینے والی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مگر ندیم نے گاؤں کی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے کوئی ایک پہلو لے لیا

ہے۔ اور باقی پہلوؤں کے متعلق صرف اشارے کر دئے ہیں مگر بہت بلیغ۔ ندیم کی فطری شرافت، اُن کی نیت کا خلوص، اور مقصد کی بلندی نے انھیں عوام کا دل پسند افسانہ نگار بنا دیا ہے۔ اُن کے یہاں فن کی بلندی، زبان کی حلاوت جذبات کا اعتدال، اظہار کی قدرت اور فکر کی گہرائی کا بہت حسین امتزاج ملتا ہے۔ اور ان سب چیزوں کے وجود نے انھیں عظمت عطا کی ہے۔ اُن کا شعور بیدار، اور احساسات بہت نازک ہیں۔

ندیم کے بعد قابل ذکر افسانہ نگار سعادت حسن منٹو ہیں۔ ہمارے نئے دور کے افسانہ نگاروں میں پریم چند، کرشن چندر اور ندیم کے بعد جس افسانہ نگار نے سب سے زیادہ گہرے نقش بنائے ہیں وہ منٹو ہے۔ اُس کے اسلوب میں بہت انفرادیت ہے۔ جذبات میں شدت ہے مگر انھیں اعتدال سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اُن کا نقطۂ نظر رومانی ہے جس پر جنسیات کی بہت دبیز تہہ چڑھی ہوئی ہے اور اسی چیز نے انھیں عظمت سے محروم کر دیا ہے۔ وہ نیاز سے زیادہ بے راہ رو ہیں اُن کے یہاں مقصدیت کا فقدان ہے۔ اگر کوئی مقصدیت ہے تو وہ صرف جنسیات اور اُس کی بے راہ روی۔ اُن کا ذہن بہت اُلجھا ہوا ہے۔ "کالی شلوار" "بو" اور "ٹھنڈا گوشت" اُن کے بدنام افسانے ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان افسانوں سے سوسائٹی کو کوئی فائدہ پہونچا ہو یا نہ پہونچا ہو۔ فن کو ضرور پہونچا۔ اُن کے افسانوں میں ہلکا ہلکا طنز اور مزاح کی چاشنی اُن کے بہت سے عیوب پہ پردہ ڈال دیتی ہے۔ اُن میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لینے کی بہت صلاحیتیں ہیں۔ اگر اُن کے افسانوں میں جنسیات کی کثرت اور عریانی نہ ہوتی تو وہ بلاشبہ کرشن چندر اور ندیم کی ٹکر کے افسانہ نگار تھے۔ مگر اس کے باوجود بھی اُن کا ایک مقام ہے۔ جو بلند ہے منٹو کے افسانے پڑھنے کے بعد ذہن جو

تاثر قبول کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے انسانی نفسیات کا بہت گہرا مشاہدہ کیا ہے اور فطرت انسانی کا ہر پہلو ٹٹولا ہے۔ اسے بیان کرنے میں اچھوتے پن اور دل کشی سے کام لیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ کامیاب ہیں اور صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں۔

ندیم اور منٹو کے بعد تیسرے قابل ذکر افسانہ نگار میرزا ادیب ہیں۔ مرزا ادیب ہمارے اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھیں اردو زبان و ادب اور خصوصاً افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ اُن کی تصنیفات کے دو شاہکار "صحرانورد کے خطوط" اور "صحرانورد کے رومان" نہ صرف خاص و عام میں مشہور و مقبول ہیں بلکہ ہمارے افسانوی ادب میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ مرزا ادیب کے یہاں رومان اور حقیقت پسندی کا بہت دلکش امتزاج ملتا ہے مرزا ادیب نے ظالم سماج سے بہت دلیری سے ٹکر لی ہے۔ اُن کی بغاوت عام نعرہ بازوں کی سی نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے افسانوں کے ایک ایک نقطہ سے خلوص اور نیک نیتی ٹپکتی ہے میرزا ادیب کے افسانے اُن کی دردمندی کا پتہ دیتے ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی اور شاعرانہ تشبیہات کے نہایت عمدہ نمونے ہمیں میرزا صاحب کے حالیہ افسانوی مجموعہ "جنگل" میں ملتے ہیں۔ ان افسانوں میں انھوں نے شاعری کی وہ تاثیر پیدا کر دی ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

افسانہ نگاری کی تاریخ نامکمل رہ جائے گی اگر ان افسانہ نگاروں کا ذکر نہ کیا جائے جو طنز و مزاح کے نشتر لے کر ہمارے افسانوی ادب میں داخل ہوئے یہ شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور اور شفیق الرحمٰن ہیں۔ شوکت غیر معمولی ذہانت کے انسان ہیں۔ اُن کی ذہانت اُن کے افسانوں میں پوری طرح جھلک رہی ہے۔ ایک غیر معمولی ذہانت سے محروم آدمی سے "سودیشی ریل" اور "خدانخواستہ" کی توقع

ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی۔ شوکت صاحب نے بڑی کثرت سے افسانے لکھے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا ہر افسانہ (معدودے چند کے) قاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ دونوں کو افسانے کے فن میں پورا کمال رکھتے ہیں۔ شوکت صاحب کے بعد کنھیا لال کپور کا نام آتا ہے۔ مگر کپور شوکت کے مقابلے میں زیادہ اونچے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا طنز بھی ہے جو بہت لطیف ہے "سنگ و خشت" افسانوں کا لازوال مجموعہ ہے۔ شوکت کے افسانے پڑھ کر قاری قہقہہ لگاتا ہے لیکن کپور کے افسانے پڑھ کر کبھی دل میں ہنستا ہے اور کبھی ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم نمودار ہوتا ہے یہ بنیادی فرق ہے جو شوکت اور کپور میں نظر آتا ہے۔ شفیق الرحمان بعض جگہ شوکت اور کپور دونوں سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھیں ایک چنچل معشوق سے تشبیہ دینا غلط نہیں ہے۔ انھیں فقرے بازی کا خاص ملکہ ہے اور چلتے ہوئے بلکہ چبھتے ہوئے فقروں سے وہ ایسے ایسے کام لے لیتے ہیں جو دوسرے ضخیم تصانیف سے بھی نہیں لے سکتے۔ معاشرے کی کمزوریاں بھی اُنکے پیش نظر رہتی ہیں۔ انکا افسانہ "ساڑھے چرچے" اسی قبیل کے افسانوں میں سے ہے جس سے معاشرے کی برائیوں کو دور کرنے کا کام لیا گیا ہے اور انھیں بری طرح طنز و مزاح کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہماری افسانہ نگاری نے ایک نیا پہلو بدلا۔ ہنگامۂ تقسیم کے دوران اور اس کے چند سال بعد تک اُردو زبان کے دونوں حصے یعنی نظم و نثر تقسیم کے نتیجے میں پیش آنیوالے واقعات سے متاثر رہے۔ مگر جسطرح حصہ نظم میں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جن میں جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔ اسی طرح افسانوی ادب میں بھی ایسی تخلیقات ملتی ہیں جن میں کسی نے صرف ہندوؤں اور سکھوں کو

اور کسی نے صرف مسلمانوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ مگر ہمارے افسانوی ادب میں ایسے شہ پاروں کی بھی کمی نہیں ہے جن میں ہندو یا مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ صرف انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے سوچنے والوں میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، کنہیا لال کپور، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ کرشن چندر نے "پشاور ایکسپریس" میں ندیم نے "در و دیوار" میں کنہیا لال کپور نے "گنگو ہتھیا" میں اور ہاجرہ مسرور نے "اندھیرے اجالے" میں اور خدیجہ مستور نے "کچھ دن اور" میں کامیابی سے یہ واقعات بیان کیے ہیں جو ہندو مسلمانوں اور سکھوں کے ہاتھوں مذہب کے نام پر پیش آئے اور جن میں تینوں قومیں شریک تھیں۔

اُردو ڈراما

نقل کا مادہ انسانی فطرت میں شامل ہے چنانچہ ابتدائے عمر ہی سے اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ اور بچپن میں جب انسانی فطرت ہر قسم کے تکلفات تصنع اور حجاب سے عاری ہوتی ہے یا یوں کہیئے کہ جب انسانی فطرت اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے نقالی کا جذبہ پورے جوبن پر ہوتا ہے۔ بچہ دوسرے بچوں یا اپنے سے بڑوں کو جو حرکات کرتے دیکھتا ہے خود بھی اُن کی نقل اُتارتا ہے۔ اگر غور سے دیکھیئے تو نقل کرنے کا جذبہ ہی انسان کی ترقی کی ضمانت ہے۔ چنانچہ بچوں کا ہنسنا، بولنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، کھیلنا کودنا اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو مارنا، انھیں بُرا بھلا کہنا۔ یہ سب نقل نہیں تو اور کیا ہے۔ یہی نقل اُن کی اصل ہے۔ اس اعتبار سے ڈراما انسانی فطرت کا مقتضیٰ ہے کہ اس میں فطرتِ انسانی کے ایک اہم جذبہ کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

اُردو ڈرامے کی ابتدا کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے عناصر ترکیبی پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ اردو زبان میں ہمیں دو قسم کے ڈرامے ملتے ہیں کچھ ترجمے اور کچھ طبعزاد۔ ترجمہ کئے ہوئے ڈراموں میں جن غیر زبانوں سے مدد لی گئی ہے اُن میں سنسکرت، انگریزی یا دیگر یورپین زبانیں، فارسی زبان کی کہانیاں، ہندوستان کی زبانوں میں سے بنگلہ، مرہٹی اور ہندی زبانیں شامل ہیں۔

طبعزاد ڈراموں میں پوران اور ہندو دیو مالا، فارسی اور عربی زبانوں کی کہانیاں، ہندوستان کے پرانے قصے۔ مخصوص روایات اور موجودہ دور کے

مسائل اور حالات و واقعات سے مدد لی گئی ہے۔

اُردو ڈرامے کی ابتداء

اُردو ڈرامے کی ابتداء ۱۸۵۵ء میں نواب واجد علی شاہ اختر والیٔ سلطنت اودھ کے دور میں ہوئی اور امانت لکھنوی نے اپنا شہرۂ آفاق ڈرامہ "اندر سبھا" تصنیف کیا۔ "اندر سبھا" کا پلاٹ، اُس کے گانے، حسین و جمیل عورتوں کا جمگھٹا، زیبائش و آرائش اور دلچسپی میں اضافہ کرنے والی چیزیں مثلاً بھڑکیلے اور شوخ لباس، پر تکلف پردے غرض ان تمام چیزوں نے رنگین مزاج لوگوں کو اپنی طرف کھینچا اور بہت جلد یہ ڈرامہ مقبولیت کی معراج پر پہنچ گیا۔ اس کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ گجراتی، دیوناگری، گورمکھی زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی بعض اور زبانوں میں بھی اس کے ترجمے کئے گئے، پھر اس کی مقبولیت ہندوستان سے نکل کر یورپ تک پہونچی اور اسے جرمن زبان کے قالب میں بھی ڈھالا گیا۔ مداری لال کی اندر سبھا جو امانت کی اندر سبھا کے بعد لکھی گئی۔ پہلی اندر سبھا کی مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

تھیٹریکل کمپنیوں کا قیام

ہندوستان میں بہت عرصے سے ایسے تماشے دکھائے جاتے تھے جو ہندو دیو مالا کے بعض قصوں پر مشتمل ہوتے تھے اور لوگ ان تماشوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ عوام کی یہ دلچسپی اور ذوق و شوق دیکھ کر بعض پارسیوں کو خیال آیا کہ اپنے آبائی وطن ایران کے مشہور قصوں کو اسٹیج کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے رستم و سہراب وغیرہ کی کہانیاں اسٹیج کیں جنھیں لوگوں نے بہت پسند کیا۔ یہ دیکھ کر بعض سرمایہ دار پارسیوں نے سرمایہ لگا کر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں دہلی، بمبئی اور کلکتہ میں تھیٹریکل کمپنیاں قائم کیں۔ ان میں سے سب سے پہلے کمپنی سیٹھ پسٹن جی فرام جی نے قائم کی۔ اس کمپنی کا نام "اوریجنل تھیٹریکل کمپنی" تھا۔ اس کے اداکاروں میں خود فرام جی،

بالی والہ، کاؤس جی، سہراب جی اور جہانگیر جی شامل تھے یہ سب اپنے زمانے کے مشہور اور چوٹی کے اداکار سمجھے جاتے تھے۔ اس کمپنی کے ڈرامانگاروں میں مشہور ڈرامانگار رونق بنارسی اور میاں حسینی ظریف شامل تھے۔ رونق طبعزاد ڈرامہ نگار بھی تھے۔ اور انگریزی ڈراموں کے ترجمے بھی کرتے تھے۔ مشہور ڈرامہ "انصاف محمود شاہ" رونق بنارسی ہی کا ڈرامہ تھا۔ جو ۱۸۸۲ء میں گجراتی زبان میں شائع ہوا تھا۔ میاں حسینی ظریف نے بھی بہت سے ڈرامے لکھے جن میں سے "خدا دوست"، "چاندبی بی" وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔ اس کے بعد اردو ڈرامہ اور اردو اسٹیج چل نکلا مختلف کمپنیاں قائم ہونے لگیں جن میں سے "وکٹوریہ ناٹک کمپنی" جسے بالی والہ نے قائم کیا تھا "الفرڈ تھیٹریکل کمپنی" جس کے بانی کاؤس جی تھے "نیو الفرڈ کمپنی اور لائٹ آف انڈیا" وغیرہ قابل ذکر کمپنیوں میں سے تھیں۔

دیگر ڈرامہ نگار

امانت لکھنوی، امداد علی، لال، رونق بنارسی اور میاں حسینی ظریف اردو زبان کے ابتدائی ڈرامہ نگار تھے ان کے بعد جن لوگوں نے اردو ڈرامہ نگاری کو بحیثیت ایک فن زندہ رکھنے اور پروان چڑھانے کی کوشش کی ان میں طالب بنارسی کا نام سرِفہرست ہے۔ طالب سے پہلے جو ڈرامے تصنیف کئے گئے وہ اکثر و بیشتر (سوائے اندر سبھا کے جو لکھنؤ میں لکھی گئی) بمبئی میں تصنیف کئے گئے۔ کیونکہ پارسی سرمایہ دار جو تھیٹریکل کمپنیاں قائم کر رہے تھے۔ بمبئی ہی میں مقیم تھے۔ اور ان کمپنیوں کے لئے لکھے جانے والے ڈرامے شروع میں بمبئی یا اس کے مضافات میں اسٹیج کئے جاتے تھے۔ چونکہ ان علاقوں کے لوگ فصیح و بلیغ اور شستہ اردو نہ بول سکتے تھے اور نہ سمجھ سکتے

تھے اس لئے اس دور کے ڈراموں کی زبان زیادہ صاف اور عمدہ نہیں تھی۔
طالب بنارسی پہلا ڈرامہ نگار ہے جس نے اردو ڈرامہ کی زبان اور مضمون کی طرف توجہ دی۔ زبان کو صاف کیا۔ مضامین کو درست کیا۔ قصے کی ترتیب میں بھی اصلاح کی اور ڈرامہ نگاری کے فن کو بلند کرنا چاہا۔ طالب کے ڈراموں میں "لیل ونہار" جو لارڈ لٹن کی کتاب کا ترجمہ ہے اور دلیر دل شیر، نگاہ غفلت" ہریش چندر" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طالب بالی والا کی کمپنی" وکٹوریہ ناٹک کمپنی" سے متعلق تھے اور اس کے لئے ڈرامے لکھا کرتے تھے۔ طالب کے بعد جس قابل ذکر ڈرامہ نگار کا نام آتا ہے۔ وہ احسن لکھنوی ہیں۔
احسن لکھنوی، اردو زبان کے مشہور مثنوی گو شاعر مرزا شوق لکھنوی کے نواسے تھے اور خود بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ احسن لکھنوی نے اردو ڈرامہ کی اس حیثیت سے بہت خدمت کی کہ زبان کو اور زیادہ صاف کیا۔ چنانچہ اُن کے لکھے ہوئے ڈراموں کی زبان نہایت فصیح و بلیغ نہایت شستہ اور بامحاورہ ہے۔ اُن کے ڈراموں میں سے "فیروز گلنار"، "دلفروش" "بھول بھلیاں" اور "چلتا پرزہ" بہت مقبول ڈرامے ہیں۔
احسن لکھنوی کاؤس جی کی قائم کردہ "الفرڈ تھیٹریکل" کمپنی سے متعلق تھے اور اسی کمپنی کے لئے ڈرامے لکھا کرتے تھے۔
احسن لکھنوی کے بعد جس قابل ذکر ڈرامہ نگار کا نام آتا ہے وہ بیتاب دہلوی ہیں۔ بیتاب کے ڈراموں میں "قتل نظیر"، "مہابھارت"، "فریب محبت"، "گورکھ دھندا" اور "کرشن سداما" خاص طور سے مشہور و مقبول ہوئے۔ بیتاب دہلوی نے اردو ڈرامہ کی منظر کشی کو بہت ترقی دی، اُن کے گیت اور دوہوں نے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بیتاب ہندی اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں رامائن اور

مہابھارت وغیرہ پر پوری طرح عبور رکھتے تھے اور ان کتابوں میں سے مشہور اور موثر قصوں کو انتخاب کر کے اپنے کمال فن سے ڈرامے کی صورت میں ترتیب دے دیتے تھے ان کے جذبات میں گہرائی ہے اور انکے کردار بہت جان دار ہوتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے زبان کی طرف بہت کم توجہ دی، کہیں سنسکرت، کہیں ہندی اور کہیں عربی و فارسی کے مشکل اور بعض جگہ بھونڈے الفاظ استعمال کئے۔ اس کے علاوہ انکے یہاں اشعار میں مکالموں کا طریق بھی بعض جگہ بہت بھدا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے ڈرامہ کے فن کو آگے بڑھانے میں بہت مدد دی۔ بیتاب دہلوی بھی کاؤس جی کی "الفرڈ تھیٹریکل" کمپنی سے متعلق تھے۔

بیتاب کے بعد اردو ڈرامہ کی۔۔ دنیا میں جس عظیم شخصیت کا نام آتا ہے وہ مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری ہیں۔ آغا حشر کاشمیری نے ڈرامہ نگاری کے فن کو بہت آگے بڑھایا اور یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اُن کے ہاتھوں اردو ڈرامہ نگاری دنیا کی کسی صنفِ ڈرامہ سے پیچھے نہیں رہی۔ چونکہ وہ ایک شیوا بیان شاعر بھی تھے اس لئے ان کے ڈرامے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بہت معیاری ہیں۔ آغا حشر کے ڈراموں میں جو چیز سب سے زیادہ جاذب توجہ ہے وہ ان کی مکالمہ نگاری ہے جس میں ان کا زور بیان معراج کمال پر پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب ان کی ترتیب اور جذبات نگاری میں انہوں نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔ ان کے یہاں بہت گہرائی ہے اور تاثر انتہائی شدید ہے ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے ڈراموں پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ ان میں جذبات کی اس قدر شدت ہوتی ہے کہ نازک احساس رکھنے والی طبیعتیں گھبرا اٹھتی ہیں۔ جس چیز کا نام توازن اور اعتدال ہے وہ ان کے یہاں ناپید ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اس اعتراض کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ کیونکہ نہ صرف ڈرامہ میں بلکہ ہر صنف نظم و نثر میں ایسے مقامات آتے ہیں

جہاں شدت جذبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان مقامات پر شدت جذبات سے کام نہ لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ زور ختم ہو جاتا ہے بلکہ بعض قبیحتیں کی محسوس کرتی ہیں اور وہ سین خاص طور پر بے مزہ ہو جاتے ہیں۔ آغا حشر نے جن جن مقامات پہ جذبات کی شدت دکھائی ہے وہاں اس کی انتہائی ضرورت تھی۔ البتہ اُن کے ڈراموں پر یہ اعتراض صحیح ہے کہ وہ ایک ہی ڈرامہ میں دو مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں۔ اس سے خیالات منتشر ہو جاتے ہیں۔ ان کی دوسری خامی یہ ہے کہ بعض جگہ جنسی مذاق کے بازاری انداز بیان سے لطافت کا خون ہو جاتا ہے اشعار کی کثرت بھی بعض مواقع پر کھل جاتی ہے۔ مگر ان معمولی خامیوں سے قطع نظر وہ اردو ڈرامہ کے محسن اعظم تھے۔ انہوں نے اس صنف کو زندہ رکھنے میں اپنا خون جگر صرف کیا اور ایسے ایسے بے مثال ڈرامے تصنیف کیے۔ "شہید ناز" "اسیر حرص" "خوبصورت بلا" "ترکی حور" "سفید خون" "اور رستم وسہراب"۔ انہوں نے کچھ ہندی ڈرامے بھی لکھے تھے۔ جن میں سے "سور داس" اور "سیتا بن باس" خاص طور سے مشہور ہیں۔ آغا حشر نیو الفرڈ کمپنی سے متعلق تھے۔ اس کمپنی سے قطع تعلق کے بعد انہوں نے "شکسپیر تھیٹریکل" کمپنی کے نام سے اپنی کمپنی بھی کھولی تھی۔ مگر اس میں انہیں نقصان ہوا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد بند کرنی پڑی آغا حشر ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلےٰ درجے کے اداکار بھی تھے۔ عرصے تک کلکتہ میں میڈن کے یہاں اداکار کی حیثیت سے ملازم رہے تھے۔ ان مشہور ڈرامہ نگاروں کے علاوہ کچھ اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ جنہوں نے اس صنف کی قابل قدر خدمت کی۔ ان میں سے حافظ محمد عبداللہ مصنف "جشن پرستان" اور "انجام ستم" وغیرہ، مرزا نظر بیگ مصنف "نل دمن" اور بہار عشق" وغیرہ۔ غلام حسین ظریف مصنف "انجام سخاوت" فقیر محمد تیغ مصنف "انجام الفت" "اور بے نظیر وبدر منیر"۔ یہ وہ ڈرامہ نگار ہیں جنہیں انیسویں صدی کے ڈرامہ نگار کہنا چاہیئے۔

بیسویں صدی کے ڈرامہ نگاروں میں منشی علی دیوانہ مصنف "تائید یزدانی" محشر انبالوی مصنف "نگاہِ ناز" اور "خود پرست" منشی رحمت علی مصنف "دردِ جگر" اور "باونا قاتل" دوارکا پرشاد افق مصنف "رام ناٹک" آغا شاعر دہلوی مصنف "حورِ جنت" حکیم احمد شجاع مصنف "بھارت کا لال" اور "باپ کا گناہ" سید امتیاز علی تاج مصنف "انارکلی" اور "دلہن" خاں احمد حسین مصنف "حسن کا بازار" سید عابد علی عابد مصنف "آتش نمرود" وغیرہ، مرزا ادیب بھی اس دور کے مشہور ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے اکثر براڈکاسٹ ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب کے ڈراموں کا مجموعہ "لہو اور قالین" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ جو اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کا غماز ہے۔

ادبی اور اصلاحی ڈرامے

ان ڈراموں کے علاوہ اردو زبان میں کچھ ادبی اور اصلاحی ڈرامے بھی تصنیف کئے گئے۔

ادبی ڈراموں میں شوق قدوائی کا "قاسم و زہرہ" مولانا عبدالحکیم شرر کا "شہیدِ وفا" مولانا ظفر علی خاں کا "ڈرامہ روس و جاپان"۔ ان کے علاوہ کچھ ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ جن میں سے منشی جوالا پرشاد برق دہلوی کا "معشوقہ فرنگ" جو شکسپیر کے "رومیو جیولٹ" کا منظوم ترجمہ ہے۔ منشی محمد عمر اور منشی نور الٰہی نے بھی بعض یورپی ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا جن میں سے "جانِ ظرافت" جو فرانس کے ڈرامہ نگار مولیر کی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی مصنف مولیر کی ایک اور کتاب "بگڑے دل" کے نام سے ترجمہ کی گئی ہے۔

اصلاحی ڈراموں میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا ڈرامہ "زود پشیمان" اور پنڈت برج موہن کیفی دہلوی کا "راج دلاری" خاص طور پر مشہور و مقبول ہیں اور انہیں کامیاب کوششیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

اُردو ڈرامہ کا ایک سرسری جائزہ

اردو ڈرامہ نگاری کی ابتدا کسی قدر یاوس کن تھی خصوصاً۔ قصوں کی ترتیب، مکالمے اور اشعار کا موقع بموقع استعمال لطیف اور نازک طبائع پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تھیٹریکل کمپنیوں کے پارسی مالک اردو ادب اور زبان سے نابلد تھے۔ اور جو واقف تھے وہ اس کے حسن و قبح کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے تھے جس طرح اردو زبان کا ادیب یا شاعر سمجھ سکتا ہے۔ عموماً قاعدہ یہی تھا کہ کمپنی کے مالک کسی ڈرامہ نگار کی خدمات حاصل کر لیتا تھا۔ اور اس کے سامنے کوئی واقعہ بیان کر کے یا کسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے ڈرامہ تصنیف کرنے کی فرمائش کر دیتا تھا۔ ڈرامہ نگار کو تصنیف کے لئے وقت بھی بہت کم دیا جاتا تھا۔ پھر سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ڈرامہ لکھنے والوں میں سے اکثر کم تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے جو ہندو دیومالاؤں کی بعض کہانیوں کو یا انگریزی ڈراموں کے سُنے سنائے قصوں کو توڑ مروڑ کر ڈرامے کا لباس پہنا دیتے تھے۔ ابتدا میں ڈرامہ دیکھنے والوں میں معمولی لوگوں کی اکثریت ہوتی تھی جو غیر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادنٰے درجے کے لوگ ہوتے تھے۔ جن کے مزاجوں میں لطافت کا نام تک نہیں ہوتا تھا۔ بازاری مذاق، بوس و کنار اور پھکڑ پن کو بہت پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکان کی زیر ہدایت ابتدا میں اس قسم کے ڈرامے لکھے گئے جن میں انتہا درجے کی بازاریت اور عریانی ہوتی تھی اشعار میں مکالمے یاوہ گوئی اور فحش کلامی اُس دور کے ڈراموں کا طرۂ امتیاز ہے حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کے ڈرامے مقبول بھی ہوتے تھے اور کمپنی کے مالکان سینکڑوں خرچ کر کے ہزاروں کماتے تھے۔ آغا حشر کاشمیری وہ پہلے ڈرامہ نگار ہیں جنہوں نے اس طرف توجہ دی۔ اور ایسے ڈرامے تصنیف کئے جن میں مندرجہ بالا خرابیوں کی اصلاح ہوگئی۔ انہوں نے عریانی، یاوہ گوئی اور بازاریت سے بہت حد تک دامن بچا لیا۔

جذبات میں گہرائی پیدا کی۔ زبان و بیان کو بھی نہایت صاف اور شیشہ کیا اور ڈرامے
کو اعلیٰ درجے کے لوگوں کے دیکھنے کی چیز بنایا۔ مگر اشعار سے وہ بھی دامن نہ بچا سکے
آغا حشر کے بعد برجموہن کیفی، عبدالماجد دریابادی سید امتیاز علی تاج نے اُردو
ڈرامے کو اور بھی بلند کیا بلکہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اسے اُردو
ادب کی ایک پاکیزہ صنف بنایا۔ اُردو ڈرامہ اپنے ابتداء میں جس قدر پست اور گھٹیا
تھا ان ڈرامہ نگار حضرات کے ہاتھوں وہ اتنا ہی بلند اور اعلیٰ درجے کی صنف ہو گیا۔

اُردو ڈرامے کا مستقبل

اُردو ڈرامے کی عہد بہ عہد ترقی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مستقبل
بہت روشن ہے اور اس کی مزید ترقی کے امکانات ہیں۔ مگر دوسری طرف ہمارے یہاں
اسٹیج کی کمی، لوگوں کا سینما سے ذوق و شوق جو شیفتگی کی حد تک پہنچا ہوا ہے اور اہل
ثروت کی بے توجہی جب ان حالات پر نظر ڈالی جائے تو کہنا پڑتا ہے۔ کہ اردو ڈرامہ
کی ادبی حیثیت ترقی کرتی رہے گی۔ تصنیفی اعتبار سے وہ آگے کی طرف قدم بڑھاتا رہے
گا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ڈرامہ لکھے جائیں گے مگر وہ کتابوں میں محفوظ رہیں گے یا رسائل کے
کے اوراق ان کے محافظ ہوں گے۔ ان کو اسٹیج کرنے کے امکانات بظاہر تاریک
ہیں۔ کاش کوئی اہل دل اٹھے اور آغا حشر کا نام لے کر ایک گراں قدر رقم خرچ کر
دے، پوری طرز پر اسٹیج آراستہ کر کے، اعلیٰ درجے کے اداکار فراہم کرے
کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ صنف عملی طور پر زندہ نہ رہ سکے۔

اُردو صحافت

اُردو صحافت کو اگر تین ادوار میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کی تاریخ کا جائزہ لینے میں بہت حد تک آسانی ہو جائے گی۔ پہلا دور ١٨٢٢ء سے ١٨٥٧ء تک دوسرا دور ١٨٥٧ء یعنی بغاوت سے ١٩٠٠ء تک تیسرا دور ١٩٠١ء سے موجودہ عہد تک اب ہر دور کا ایک مختصر اور سرسری سا جائزہ لے لیجئے۔

پہلا دور ہماری صحافت کا پہلا دور ١٨٢٢ء سے شروع ہوتا ہے یہی وہ سال ہے جب اردو صحافت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس سال فارسی زبان کے اخبار "جام جہاں نما" نے جو کلکتہ سے نکلتا تھا ایک اردو ضمیمہ جاری کیا۔ یہ ضمیمہ دو ورق پر مشتمل ہوتا تھا۔ ٢٩ر دسمبر ١٨٢٢ء وہ تاریخی دن تھا جب "جام جہاں نما" کا پہلا اردو ضمیمہ جاری ہوا۔ مگر یہ اخبار کم اور مجموعہ مضامین زیادہ تھا کیونکہ اس میں تاریخ اور جنگی کارناموں پر مضامین ہوتے تھے۔ خبریں بہت کم ہوتی تھیں۔

اس کے بارہ سال بعد یعنی ١٨٣٦ء میں اردو زبان کے مشہور انشا پرداز مولانا محمد حسین آزاد کے والد ماجد مولوی باقر حسین نے "اردو اخبار" کے نام سے دلی سے اپنا اخبار جاری کیا۔ "اردو اخبار" میں بھی خبروں کو مرکزی حیثیت تو حاصل نہیں تھی مگر پھر بھی ضروری اور اہم خبریں درج کر دی جاتی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خبروں پر غیر جانبدارانہ تبصرے کئے جاتے تھے۔ برطانوی حکومت کی کارگزاریوں پر نڈر ہو کر نہایت بیباکی سے تنقید کی جاتی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اردو صحافت اپنے ابتدائی دور میں بھی حکومت وقت کی کاسہ لیسی ہی کو مقصد عظیم نہیں سمجھتی تھی۔ اور صحافیوں کا قلم مصلحتوں اور خطرات کی پرواہ کئے بغیر حقیقت کے چہرے سے نقاب

کشائی کرنے میں بہت بیباک تھا۔ "اردو اخبار" میں بھی خبروں سے زیادہ مضامین کو اہمیت حاصل تھی اور یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اس میں ادبیت کا عنصر غالب تھا۔ زبان و محاورہ کی بحث اور غالب و ذوق کی غزلیں بڑے اہتمام سے اس کے اوراق کی زینت ہوتی تھیں۔ اسے اخبار کہا جائے یا ادبی صحیفہ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "اردو اخبار" نے عوام و خواص میں اخبار بینی کا شوق ضرور پیدا کیا اور اپنی بیباک تنقید سے بعد کے اخبار نویسوں کو ایسی ڈگر پر ڈال دیا جس پر چل کر انہوں نے معاشرے اور حکومت وقت پر غیر جانبدارانہ اور تعمیری تنقید کو صحافت کا بنیادی اصول بنایا۔ یہ بھی اسی اخبار کی برکت تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں نئے نئے اخبار جاری ہونے لگے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں مرحوم کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۷ء میں "سید الاخبار" کے نام سے ایک اردو اخبار جاری کیا۔ ۱۸۴۰ء میں مدراس سے "جامع الاخبار" کے نام سے ایک اور ہفت روزہ اخبار جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر رحمت اللہ صاحب تھے۔ اس میں مدراس ارکاٹ اور حیدرآباد کی خبریں درج ہوتی تھیں۔ اس زمانے کی جنگوں کے حالات، حکام کے تبادلے اور تقرر کی اطلاعات بھی دی جاتی تھیں۔ اس اخبار کے سولہ صفحات اور ہر صفحے میں دو کالم ہوتے تھے۔ یہ اردو زبان کا تیسرا اخبار تھا۔ جو کسی حد تک اخبار کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں "فوائد الناظرین" کے نام سے دہلی سے ایک پندرہ روزہ اخبار جاری ہوا۔ ماسٹر رام چندر اور اشرف علی واسطی اس کے مالک تھے۔ اس میں ہندوستان اور بیرون ہند کی خبریں بھی درج کی جاتی تھیں۔ نقشہ جات، آلات اور مشاہیر کی تصاویر بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ہر صفحے میں دو کالم ہوتے تھے اس کا چندہ چار آنہ مہینہ تھا۔

۱۸۴۸ء میں مدراس سے "اعظم الاخبار" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری

ہوا۔ اس اخبار میں خبروں کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اس میں ہندوستان کی خبروں کے ساتھ بیرون ہند کی خبریں بھی درج ہوتی تھیں، اور ان پر بہت دلچسپ انداز میں تبصرے کئے جاتے تھے۔ اس کا چندہ ماہانہ ایک روپیہ اور سالانہ دس روپیہ تھا۔

۱۸۴۹ء میں اندور سے "مالوہ" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ یہ ہر شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ یہ اردو اور مرہٹی دو زبانوں میں چھپتا تھا۔ اس میں آٹھ صفحات ہوتے تھے اور ہر صفحہ میں دو کالم۔ ایک کالم اردو زبان میں اور دوسرا مرہٹی زبان میں ہوتا تھا۔ دھرم نارائن بھاسکر اور شیخ قمرالدین اس کے مالک تھے۔

پنجاب کا پہلا اخبار

۱۸۵۰ء میں لاہور سے "کوہ نور" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ منشی ہرسکھ رائے اس کے مالک تھے۔ منشی نولکشور جنہوں نے بعد کو اپنا مشہور اخبار "اودھ اخبار" جاری کیا پہلے کوہ نور کے عملہ ادارت میں شامل تھے۔ کوہ نور پنجاب کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ اس اخبار نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی اور ہفتہ میں تین بار شائع ہونے لگا۔ ریاستوں کے فرماں رواؤں، امراء و رؤساء انگریز حکام اور عوام غرض اسے ہر طبقے میں یکساں شہرت اور ہردلعزیزی حاصل تھی۔ اس کا انداز تحریر بہت عام فہم اور صاف ہوتا تھا۔ "کوہ نور" کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی دیکھا دیکھی پنجاب سے بہت سے اخبار نکلے مگر شاید ہی کوئی اخبار ایسا ہو جس نے اس اخبار کے نام کے آخری حصے "نور" کو اپنے نام کا جزو نہ بنایا ہو۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں لدھیانہ سے "نور علیٰ نور" امرتسر سے "باغ نور" اور ملتان سے "ریاض نور" جاری ہوئے۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان آگرہ گورنمنٹ کی طرف سے "آگرہ گورنمنٹ گزٹ" اور بنارس سے "سدھاکر اخبار"، "باغ و بہار" اور "پندرہ روزہ زائرین ہند" کا اجرا ہوا۔

دوسرا دور ہماری صحافت کا دوسرا دور سانحۂ بغاوت کے بعد ۱۸۵۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہی وہ سال ہے جس میں اردو زبان کا مشہور و معروف اور ایک اچھے اخبار کی بیشتر خصوصیات رکھنے والا اخبار "اودھ اخبار" جاری ہوا "کوہ نور" لاہور کے عملۂ ادارت کے ایک رکن منشی نولکشور اس کے مالک تھے۔ اس کے عملۂ ادارت میں اُس وقت کی فاضل ترین ہستیاں شامل تھیں، جن میں سے پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا حیرت دہلوی اور مولانا جالب مرحوم کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر ۱۸۷۷ء میں اسے روزنامہ کر دیا گیا۔ اس کی خبروں کا معیار نہایت اچھا تھا۔ اس کی خبریں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی ہوتی تھیں اسے نہ صرف صوبہ متحدہ کا بلکہ ہندوستان کا سب سے بہتر اور معیاری اخبار سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۵۹ء میں "شمس الاخبار" کا اجراء ہوا۔ یہ پہلے دس روزہ تھا۔ پھر ہفت روزہ ہو گیا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر عبدالستار سنین تھے۔ بعد کو محمد نصیرالدین گھٹالہ جو عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس اخبار نے ترکوں اور روس کے درمیان ہونے والی جنگ میں ترکوں کی زبردست حمایت کی اور ان کے لئے چندے کی بھی اپیل کی۔ اور اسی اخبار کی کوششوں سے ایک گراں قدر رقم جمع کر کے ترکی بھیجی گئی۔ سلطان عبدالحمید خاں والی ترکی نے اعتراف احسان اور شکریہ کے طور پر اسے ترکی کا سب سے بڑا اعزاز "تمغۂ مجیدیہ" عطا فرمایا جو اس کے پہلے صفحہ پر چھپا کرتا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا بہت مقبول اخبار تھا۔ اور بڑی کثرت سے چھپتا تھا

ان اخبارات کے علاوہ ۱۸۶۱ء میں میرٹھ سے "اخبار عالم"، آگرہ سے "آفتاب عالمتاب"، "حیدری" اور "حسینی"، بمبئی سے ہفتہ وارہ کشف الاخبار" جاری ہوئے

۱۸۶۲ء میں بریلی سے پندرہ "روہیل کھنڈ اخبار"، ۱۸۶۳ء میں میرٹھ سے ہفت روزہ "نجم الاخبار"، ۱۸۶۵ء میں بلند شہر سے ہفتہ وار "نور نظر"، رڑکی سے "مظہر العجائب" اور لاہور سے "پنجابی" جاری ہوئے۔

۱۸۶۶ء میں سرسید احمد خاں نے علی گڑھ سے "سائنٹیفک سوسائٹی" کے نام سے پندرہ روزہ اخبار جاری کیا جو بعد کو ہفت روزہ اور پھر سہ روزہ ہوگیا۔ اس اخبار نے ہندوستانی عوام اور خاص طور پر مسلمانوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس کا طرز تحریر نہایت شستہ، شگفتہ اور صاف ہوتا تھا۔ حکومت پر تنقید کرنے میں بہت بیباک تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں مغربی علوم کا شوق عام کرنا اور حکومت وقت سے اپنی قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنا اس اخبار کے بنیادی مقاصد تھے۔ ۱۸۶۹ء میں اردو زبان کے مشہور شاعر ریاض خیر آبادی نے خیرآباد سے "ریاض الاخبار" جاری کیا۔

۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خاں نے اپنا شہرہ آفاق اخبار ہفتہ وار "تہذیب الاخلاق" نکالا جس نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد کی اصلاح اور تہذیب و تمدن و معاشرت میں مفید تبدیلی کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور اس میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوا۔ اس دور کے مشہور اہل قلم میں سے شاید ہی کوئی ہو جس کے علمی و ادبی جواہر پاروں سے اس اخبار کے کالم مزین نہ ہوتے ہوں۔ مسلمانوں کا شعور بیدار کرنے میں "سائنٹیفک سوسائٹی" اور "تہذیب الاخلاق" کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

۱۸۷۱ء میں لاہور سے "اخبار عام" جاری ہوا۔ یہ پہلے ہفت روزہ تھا پھر سہ روزہ ہوا اور آخر میں روزانہ ہوگیا۔ اس کے مالک پنڈت مکند رام تھے جو پہلے "کوہ نور" سے وابستہ تھے۔ "اخبار عام" ہندوستان کے ان چند اخباروں میں سے تھا جو عوام و خواص دونوں میں بہت مقبول تھے۔ چونکہ حکومت وقت کی ہاں میں

ہاں ملانا ہی اس کی پالیسی تھی۔ اس لئے حکومت اس پر نگاہ کرم رکھتی تھی۔ پنجاب کے مدارس میں بکثرت پڑھا جاتا تھا۔

۱۸۷۲ء میں ریاست رام پور سے "دبدبۂ سکندری" جاری ہوا خبروں کی صحت اور واقعات کی صداقت کے اعتبار سے اس کا معیار بہت بلند تھا۔ اسے ہندوستان کا مستند ترین اخبار سمجھا جاتا تھا۔ یہ کسی پر تنقید کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ اس کی بیباکی بہت مشہور تھی اپنے بعض معاصرین سے اس کے خوب خوب معرکے رہا کرتے تھے۔ جھوٹی خبریں شائع کرنے والے اخبار اس کی زد میں اگر پناہ مانگا کرتے تھے۔

۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۷ء کے درمیان "لدھیانہ سے" نور افشاں" لاہور سے "آفتاب پنجاب" اور "دہلی سے" خیر خواہ ہند" جاری ہوئے۔ ۱۸۷۷ء وہ مشہور سال ہے جب اردو صحافت طنز و مزاح کے نشتروں سے مسلح ہو کر میدان میں اُتری اور منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے "اودھ پنچ" جاری کیا۔ اودھ پنچ اپنے زمانے کا مقبول ترین اخبار تھا اور ضخامت کے اعتبار سے شاید کوئی بھی اس کا ثانی نہ ہو۔ اسے پنڈت رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، احمد علی شوق، منشی جوالا پرشاد برق، نواب سید محمد آزاد اور مرزا مچھو بیگ ستم ظریف جیسے باکمال اہل قلم کا تعاون حاصل تھا۔ اپنی ظریفانہ طرز تحریر کی وجہ سے بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ ایک زمانہ تو ایسا تھا جب شاید ہی کوئی اخبار اس کی ہمسری کا دعویٰ کرتا۔ ۱۸۷۸ء میں مدراس سے ہفت روزہ "مظہر العجائب" جاری ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں محرم علی چشتی نے لاہور سے "رفیق ہند" نکالا۔

خواتین کا پہلا اخبار

۱۸۸۴ء ہی میں "فرہنگ آصفیہ" والے مولوی سید احمد دہلوی نے "اخبار النساء" کے نام سے

ایک اخبار نکالا جو خواتین کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ یہ عورتوں کا پہلا اخبار تھا۔
۱۸۸۷ء میں منشی محبوب عالم نے لاہور سے "پیسہ اخبار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ چونکہ اس کی قیمت صرف ایک پیسہ تھی اس لئے اسے بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں حیدر آباد سے "نیر آصفی" جاری ہوا۔ اسد العین احمد اس کے مالک تھے۔

تیسرا دور اردو صحافت کا تیسرا دور ۱۹۰۰ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں صحافت نے حیرت انگیز ترقی کی اور اپنے آپ کو حقیقی معنیٰ میں عوام کا ترجمان ثابت کیا۔ اس دور کے مشہور اخبارات میں لاہور سے "زمیندار" (ابتداء میں دس سال تک ہفت روزہ کی صورت میں کرم آباد ضلع گوجرانوالہ سے نکلتا تھا) کلکتہ سے "الہلال" دہلی سے "ہمدرد" بمبئی سے "خلافت" دہلی سے "منادی" لاہور سے "انقلاب" بجنور سے "مدینہ" لکھنؤ سے "صدق جدید"۔ لاہور سے "سیاست" لکھنؤ سے "قومی آواز" کلکتہ سے "عصر جدید" دہلی سے "الامان"، "انجام"، "جنگ" اور "تیج"۔ لاہور سے "ملاپ"، "ویر بھارت"، "پرتاب"۔ "نوائے وقت"، "امروز"، "آفاق"، "غالب"، "شہباز"، (آج کل پشاور سے نکلتا ہے) "مغربی پاکستان"، "تسنیم" اور "ملت" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے اخبار نویسوں میں مولانا ظفر علیخاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، سید جالب مرحوم، میر محفوظ علی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مرتضےٰ احمد خاں میکش مولانا چراغ حسن حسرت، علامہ تاجور نجیب آبادی، سید حبیب مرحوم، مقبول انور داؤدی، نصر اللہ خاں عزیز، باری علیگ، مولانا رشید اختر ندوی، مولوی رئیس احمد جعفری، ابوسعید بزمی، حمید نظامی، احمد ندیم قاسمی، مظفر احسانی، وقار انبالوی، حاجی لق لق، اظہر امرتسری، شبلی بی کام، شورش کاشمیری، م ش (میاں محمد شفیع) اور شمیم محمد

اختر، خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ اخبار نویس ہیں، جنہوں نے شب و روز محنت سے اخبار نویس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دی۔ اِدھر اُدھر سے نقل کرنے کی بجائے خبروں کی بڑی بڑی ایجنسیوں کی خدمات حاصل کیں اور اپنے قارئین کو ہر صبح نئی اور تازہ خبریں دینے کا بندوبست کیا۔ خبروں کی ترتیب اور سرخیوں کے تعین میں انگریزی صحافت سے استفادہ کیا اور اسے زیادہ سے زیادہ ترقی پسندانہ اصولوں پر منضبط کیا۔ اخبارات میں مستقل عنوانات قائم کیئے۔ فکاہی کالم، دلچسپ معلومات، شخصیات بساطِ عالم، رفتارِ زمانہ، افکار و حوادث، پس منظر، امروز و فردا اور حرف و حکایت کے عنوانات قائم کر کے اخبارات کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور پُر از معلومات بنایا۔ علمی و ادبی ایڈیشنوں کے ذریعہ سے اخبارات کی علمی و ادبی حیثیت قائم کی اور اسے خبروں کے ذخیرے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا خزینہ بھی بنایا۔

رسائل

اس دور میں روزناموں کے ساتھ ساتھ ہفت روزہ اور ماہنامہ بھی جاری ہوئے۔ جن میں لکھنؤ کا ماہنامہ "دل گداز" جو مولوی عبدالحلیم شرر نے جاری کیا تھا۔ کانپور کا "زمانہ" جس کے مالک و مدیر منشی دیا نرائن نگم تھے، علی گڑھ کا "اردوئے معلّیٰ" جسے مولانا حسرت موہانی نے جاری کیا تھا۔ سر عبدالقادر مرحوم کا "مخزن" جو لاہور سے نکلتا تھا۔ نیاز فتحپوری کا "نگار"، حیدرآباد کا "سب رس"، لاہور کا "نیرنگِ خیال" (آج کل راولپنڈی سے نکلتا ہے) "ہمایوں"، "ادبِ لطیف"، "نقوش"، مولانا تاجور نجیب آبادی کا "ادبی دنیا" (آج کل مولانا صلاح الدین اس کے ایڈیٹر ہیں) شاہکار، آگرہ کا "شاعر"، دہلی کا "ساقی" (آج کل کراچی سے نکلتا ہے) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں ماہنامے ہندوستان اور پاکستان سے جاری ہیں۔

ہفت روزہ پرچوں میں دہلی سے "ریاست" "پیام مشرق"، لاہور سے "قندیل"

"چٹان"، "اقدام"۔ پشاور سے "تنویر"۔ کراچی سے "ساغر" اور "شیرازہ" قابل ذکر ہیں

عورتوں اور بچوں کے لئے بھی بہت سے ہفت روزہ اور ماہنامے جاری ہوئے جن میں سے بعض اب بھی نکلتے ہیں۔ "پیام"، "نونہال"، "بھائی جان" اور ننھے منّے بچوں کے لئے ہیں۔ "عصمت"، "تہذیب نسواں"، "خاتون مشرق"، "حور"، "حرم" اور "زیب النساء" عورتوں کے مسائل میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اردو صحافت کا مستقبل بہت روشن ہے اور وہ حیرت انگیز طور پر ترقی کے مراحل طے کر رہی ہے۔

تحریک پاکستان اور اس کا پس منظر

مسلمانان ہند کی سیاسی جدوجہد کا آغاز دراصل اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب سے ان کی سلطنت انحطاط پذیر ہوئی تھی۔ نواب حیدر علی، سلطان ٹیپو، حافظ رحمت خاں والیٔ روہیل کھنڈ اور سید احمد شہید وغیرہ کی انگریزوں اور دیگر غیر مسلم طاقتوں کے خلاف فوجی اور سیاسی جدوجہد اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر مصائب کے دوہرے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایک تو انگریزی افواج کے ہاتھوں انہیں بے اندازہ جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ہندوستان کے غیر مسلموں نے بغاوت کی ساری ذمہ داری ان کے سر ڈال دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاتعداد مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ انگریزی حکومت کی نظر میں ہمیشہ کے لئے باغی قرار دے دئے گئے۔ انگریزی حکومت کا اعتبار ان پر سے اُٹھ گیا۔ اور سرکاری ملازمتوں اور اعلے عہدوں کے تمام دروازے ان پر بند کر کے ہندوؤں پر کھول دئے گئے جس کا نتیجہ ان کی پس ماندگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

آزادی کی طرف پہلا قدم

مسلمانوں کی یہ زبوں حالی اور بیچارگی دیکھ کر ایک نازک اور درد مند دل بیقرار ہو گیا اور اس نے مسلمانوں کو تباہی اور ہلاکت سے بچانے کیلئے عملی میدان میں قدم رکھا۔ اگر سرسید مرحوم کی مساعی جمیلہ آڑے نہ آجاتیں تو شاید مسلمان اس برِ عظیم سے ہمیشہ کے لئے مٹا دئے گئے ہوتے۔ سرسید نے "رسالہ اسباب بغاوتِ ہند" لکھ کر اور اپنے اثر و رسوخ کو

استعمال کر کے انگریزوں کے دل سے یہ خیال زائل کیا کہ بغاوت کی تمام تر ذمہ داری صرف مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے لئے گنجائش پیدا کرنے کے بعد سرسید نے اپنی اصل تحریک کا آغاز کیا۔ ان کی دوربین آنکھ اندازہ کر چکی تھی کہ ہندوستان کی قوموں میں کوئی بلند مقام حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو کثرت سے پھیلایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ہزاروں حوصلہ شکن رکاوٹوں کے باوجود اپنی تحریک جاری کر دی۔ اور ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ دی۔ اور پھر اس کے استحکام اور نوجوانوں کو اس میں بکثرت داخل ہونے کی تلقین کرنے کے لئے انہوں نے دن رات ایک کر دیا۔ ملک کے کونے کونے میں پہنچ کر مسلمانوں کو تحریک کی کہ تمہارا شاندار مستقبل تعلیم اور خاص طور پر انگریزی تعلیم کے حصول سے وابستہ ہے — آزادی کی منزل کی طرف مسلمانوں کا یہ پہلا قدم تھا۔

ایک اور دانشمندانہ قدم

چند انگریزوں کی سرپرستی میں ۱۸۸۵ء میں بمبئی کے مقام پر انڈین نیشنل کانگرس کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی۔ یہ جماعت خالص ہندو مفادات کے تحفظ کے پیش نظر قائم کی گئی تھی اس کی باگ ڈور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور مسلمانوں کو بھی اصرار کر کے اس میں شمولیت کی دعوت دی جا رہی تھی۔ یہ بڑا نازک موقع تھا۔ مسلمان تعلیمی اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلے میں صفر کی حیثیت رکھتے تھے اگر اس وقت وہ من حیث القوم اس جماعت میں شامل ہو جاتے تو اس کے دو نتائج ہوتے پہلا یہ کہ مسلمانوں کی توجہ حصول تعلیم سے ہٹ کر سیاسیات کی طرف مبذول ہو جاتی۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ چونکہ کانگرس کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اس لئے مسلمانوں کی حیثیت

اُس گلّے کی بھیڑوں کی سی ہوتی جسے ہوشیار چرواہا جدھر چاہتا ہانک لیجاتا۔ سر سید احمد خاں نے اپنی دانائی اور فراست سے اس تحریک میں مسلمانوں کی شمولیت کے نتائج و عواقب کا اندازہ کر لیا اور پوری قوت سے مسلمانوں کو اس تحریک میں شامل ہونے سے باز رکھا۔ مسلمانوں پر سر سید کا یہ بہت بڑا احسان ہے جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکینگے

تقسیم بنگال ہندوستان کے مدبر وائسرائے لارڈ کرزن نے انتظامی سہولتوں کے پیش نظر ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کا وہ حصہ جہاں مسلمان اکثریت میں تھے دوسرے حصے سے الگ ہو گیا۔ اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں مسلمانوں کی واضح اکثریت کے باوجود جو پس ماندگی تھی وہ ختم ہو گئی۔ چونکہ اس تقسیم سے بنگال کے مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی فائدہ پہونچ رہا تھا اس لئے ہندوؤں نے وسیع پیمانے پر ہنگامے برپا کر دئے اور اس تقسیم کے خلاف طوفان بے تمیزی مچا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب ہندو مسلم اتحاد کے نعرہ لگانے والے ہندو بے نقاب ہو کر سامنے آگئے اور مسلمانوں کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے کوئی آئینی قدم اٹھائیں

مسلم لیگ کا قیام چنانچہ ہندوؤں کی یہ منافقانہ اور مسلم آزاد پالیسی دیکھ کر مسلمانوں کی سربرآوردہ شخصیتوں نے ڈھاکہ میں جمع ہو کر ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک جماعت قائم کی اس کے پہلے اجلاس کی صدارت نواب وقار الملک نے کی۔ نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ، مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خاں وغیرہم ۔۔۔۔۔ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے پیش پیش تھے۔ آزادی کی منزل کی طرف یہ مسلمانوں کا دوسرا قدم تھا

تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کے مسلسل احتجاج اور دہشت پسندی سے مجبور ہو کر حکومت اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور ہو گئی اور ۱۹۱۱ء میں دربار شاہی کے

فلک بوس گنبد سے تنسیخ تقسیم کی صدا گونجی اور مسلمانوں پر بجلی بن کر گر پڑی۔
بظاہر اس تقسیم کی تنسیخ نے مسلمانوں کو نقصان پہونچایا اور مخالفوں کو شادیانے بجانے
کا موقع دیا۔ مگر درحقیقت مخالفین کی یہی خوشی اُن کے .... ابدی غم کا باعث
ہوئی۔ کیونکہ اب مسلمانوں کی آنکھیں کھُل گئیں تھیں اور انھوں نے اپنی تنظیم کی
طرف توجہ دینی شروع کردی تھی مگر اس کے باوجود وہ سیاسی اعتبار سے اب بھی ہندوؤں
کے ساتھ مل کر ہی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے رہے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کا بیدار
مغز رہنما مسٹر محمد علی جناح جو جو آئندہ چل کر تاریخ عالم میں "قائد اعظم" کے پر عظمت نام
سے پکارا جانے والا تھا ابھی تک ہندوؤں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا اور
کانگریس کے ہی پلیٹ فارم سے آزادی حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔

میثاق لکھنؤ

یورپ میں جنگ عظیم اوّل شروع ہو چکی تھی۔ اور اس کا اثر ہندوستان
پر بھی پڑ رہا تھا۔ حکومت ہندوستانیوں سے کامل تعاون کی
بھیک مانگ رہی تھی اور ہندوستانی اپنے تمام اختلافات بالائے طاق رکھ کر سرکار انگلشیہ
کی فتح کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔ ہندوستانیوں سے اس امداد کے صلے
میں حقوق دینے کے وعدے کئے جا رہے تھے۔ ہر طرف جدید اصلاحات کے چرچے تھے۔
مگر ہندو چاہتے تھے کہ یہ حقوق صرف انھیں کو دئے جائیں اور مسلمان اُن سے فائدہ
نہ حاصل کر سکیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے علم بردار قائد اعظم محمد علی جناح
جو اب تک کانگریس سے وابستہ تھے نہ صرف وابستہ تھے بلکہ اس کے چوٹی کے
لیڈر تھے ہندوؤں کی روش دیکھ کر محسوس کر رہے تھے کہ اُن کے ہاتھوں مسلمانوں کی
قومی انفرادیت خطرے میں ہے۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرنے کیلئے
تیار تھے مگر قوم کا مستقبل غیروں کے ہاتھ میں دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ انھوں
نے ہندو ذہنیت کو مسلمانوں کے حق میں حد درجہ خطرناک دیکھ کر ۲۱ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ کو لکھنؤ میں

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایک جامع قرارداد منظور کی جسے انھیں کے سیاسی تدبر نے ترتیب دیا تھا۔ اس قرارداد کے موٹے موٹے خدوخال یہ ہیں۔

(۱) مجالس آئین ساز میں ہندوستانیوں کی نمایاں اکثریت۔ (۲) مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ۔ ان کے لئے علیحدہ نشستیں مخصوص کردی جائیں جن کا اصول یہ ہو کہ پنجاب میں پچاس فیصدی، بنگال میں چالیس فیصدی، بہار میں انتیس فیصدی .... (۳) اگر کسی اقلیت کے ۳/۴ منتخب ارکان کسی تجویز کی اپنے ملی مفاد و داعیات قومی کے پیش نظر مخالفت کریں تو ایسی تجویز کو پیش نہیں کیا جائے گا۔ (۴) ہر صوبے کے گورنر کی مجلس شورہ میں نصف ارکان ہندوستانی ہونے چاہئیں جو مجلس آئین ساز کے منتخب ممبروں میں سے ہوں گے۔ ان کی میعاد عہدہ پانچ سال ہوگی۔

(۵) گورنر جنرل کی مجلس وزراء میں نصف ارکان ہندوستانی ہونگے۔ حتی الامکان سول سروس کے ارکان کا کابینہ کے عہدوں پر تقرر نہیں کیا جائے گا ـــــ یہ آزادی کی منزل کیطرف مسلمانوں کا تیسرا قدم تھا۔

اس اسکیم کو کانگرس نے بھی اپنے سالانہ اجلاس میں منظور کر لیا۔ اس اسکیم نے قائد اعظم کو عوام سے بہت زیادہ قریب کر دیا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں تو وہ پہلے ہی مقبول تھے۔ اس اسکیم نے انھیں درمیانی طبقے میں بھی ہر دلعزیز بنا دیا یہ پہلی اسکیم تھی جس نے مسلمانوں کے لئے بہت دور تک راستہ صاف کر دیا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ جو مسلمانوں کو پہونچا وہ اُن کی جداگانہ حیثیت کا تحفظ تھا۔ اور بقول کئی فرقہ پرست ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے کانگرس کا مسلم لیگ کی اس میثاق کو قبول کر لینا اپنے قتل کے محضر نامہ پر دستخط کرنیکے مترادف تھا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میثاق سے خود مسلمانوں کو بھی بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریت والے صوبوں میں ان کی حیثیت اقلیت یا اس کے قریب کی سی ہو کر رہ گئی۔ گو اس کے مقابلہ میں یوپی، سی پی، بہار، مدراس اور بمبئی میں انھیں اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں مل گئیں تھیں مگر پھر بھی وہ ان صوبوں میں اقلیت ہی میں تھے۔ نشستوں کی زیادتی انھیں بظاہر کوئی فائدہ نہیں پہونچا رہی تھی۔ مگر فراخ دل مسلمانوں کے فراخ دل رہنما قائد اعظم نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر یہ نقصان عظیم بھی گوارا کر لیا تھا۔

تحریک خلافت اور ترک تعاون

جنگ عظیم میں ترک برمنی کا ساتھ دے رہے تھے۔ ہندوستان کی پٹھان اور پنجابی مسلمان فوجیں اپنے ترک بھائیوں پر بے دریغ گولیاں چلا رہی تھیں۔ عرب جو اب تک ترکی حکومت کا ایک جزو تھا، شریف مکہ کی غرض پرستی اور غداری کی وجہ سے الگ ہو کر ترکوں کے خلاف برسر پیکار تھا۔ اور یہ سارا کھیل انگریزوں کی عیاری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔ انگریزی فوجوں کی گولیاں اسلامی ممالک میں خون کی ندیاں بہا رہی تھیں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کی اس تباہی و بربادی پر ہندوستان کے ایک مسلمان کا دل تو اتنے زور سے دھڑکا کہ اس کی دھڑکنوں سے قصر حکومت بھی متزلزل ہو گیا۔ دل رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کا تھا۔ خلافت کمیٹی تو اسی زمانے میں قائم ہو چکی تھی جب انگریزی فوجوں نے ترکوں پر حملہ کر دیا تھا۔ مگر ترکوں کی شکست اور ان کے ساتھ انگریزوں کے ذلت آمیز سلوک نے خلافت کمیٹی میں گویا از سر نو جان ڈال دی۔ ۹ر جون ۱۹۲۰ء کو الہ آباد میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی اور تمام شرکائے اجلاس نے متفقہ طور پر ترک تعاون کا اصول پاس کر دیا۔ ۲۲ر جون کو مسلمانوں نے وائسرائے کو پیغام بھیجا کہ اگر یکم اگست

۱۹۲۰ء پہلے پہلے ترکوں کی شکایت رفع نہ ہوئیں تو تحریک ترک تعاون شروع کردی جائے گی۔ ۳۰ جون ۱۹۲۰ء کو الٰہ آباد میں خلافت کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اور طے پایا کہ وائسرائے کو ایک مہینہ کا نوٹس دے کر ترک تعاون کا پروگرام شروع کر دیا جائے۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو نوٹس دیا گیا۔ اور ۳۱ اگست ۱۹۲۰ء کو تحریک ترک تعاون شروع کردی گئی۔ گاندھی جی جو ایسے موقعوں کے منتظر رہتے تھے فوراً میدان میں آ گئے اور مسلمانوں کی قیادت کا روپ دھار کر انھیں تباہی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس نازک موقع پر ہندو مسلمانوں کو متحد کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا گاندھی جی کو باپو FATHER OF NATION کا خطاب دلوایا۔ انھیں بڑے بڑے شہروں میں لے جا کر جامع مساجد کے منبروں پر چڑھا کر تقریریں کروائیں اور اُن کی اور ہندوؤں کی خاطر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے طعنے برداشت کئے۔ غرض ایک بار پھر مسلمان ہندوؤں کیساتھ مل کر ایک ہندو لیڈر کی قیادت میں آزادی کی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیل خانوں کو رونق بخشی گئی۔ پھانسی کے رسول کو بوسے دئے گئے۔ اسکول اور کالج بند کر دئے گئے۔ دفاتر میں تالے پڑ گئے۔ ہجرت کی تحریک شروع ہو گئی۔ بیس ہزار مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر اپنی جائدادیں اور مال و متاع ہندوؤں کے ہاتھ کوڑیوں میں فروخت کر کے افغانستان اور ایران کی طرف روانہ ہو گئے کچھ راستہ کی تکالیف کا شکار ہو گئے۔ کچھ لوٹ مار کی نذر ہو گئے اور باقی روتے دھوتے خالی ہاتھ اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

لیکن جب یہاں آئے تو برادرانِ وطن کی آنکھیں بدلی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہندو اُن کی ملازمتوں پر قابض ہو چکے تھے۔ مسلم یونیورسٹی ترک تعاون کا ساتھ دے کر آخری سانسیں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی مگر ہندو یونیورسٹی

میں ویسے ہی بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ "منافرت" کے آثار نظر آ رہے تھے۔ سوامی شردھانند
کی سرکردگی میں مسلمانوں کو "شدھ" کرنے کی اسکیم جاری ہو گئی تھی اور ملکانہ کے
ہزاروں مسلمان ہندو بنا لئے گئے تھے۔ "گئو رکھشا" کے نام پر مسلمانوں کو بے دریغ
ذبح کیا جا رہا تھا۔ غرض اس طرح ہندو مسلم اتحاد اور وقتی طور پر ناکام بھی ہو گئی ہو۔ مگر
اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریز یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو گئے کہ اگر ہندوستانیوں
کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو ہم اطمینان سے حکومت نہیں کر سکیں گے۔ اور یہ اسی
تحریک کا نتیجہ تھا کہ گولیوں کا خوف اور پھانسی کے تختے کی دہشت ہندوستانیوں
کے دل سے نکل گئی۔ یہ آزادی کی منزل کی طرف مسلمانوں کا چوتھا قدم تھا۔

سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ

ہندوستان کی افراتفری اور بدنظمی نے انگریزی حکومت کے اوسان خطا کر دیئے اور برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان
کو اصلاحات دینے پر غور و خوض کرنے لگی چنانچہ ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی
زیر قیادت ایک کمیشن ہندوستان بھیجا گیا تاکہ وہ ہندوستان کے حالات
کا جائزہ لے کر اور ہندوستانی رہنماؤں سے مل کر ایسی سفارشات مرتب
کرے جن کی بنیاد پر ہندوستان کو اصلاحات دی جائیں۔ مگر اس کمیشن میں
کسی ہندوستانی کو شریک نہیں کیا گیا۔ اس لئے ہندوستان کی دونوں بڑی
جماعتوں کانگرس اور مسلم لیگ نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ اس کمیشن کی آمد
سے ایک بار پھر ہندو مسلم اتحاد کیلئے فضا سازگار ہو گئی۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے
رہنماؤں نے اپنی اپنی جگہ ایسے اصول وضع کرنے پر غور کرنا شروع کیا جس کے
نتیجے میں دونوں قومیں متحد ہو کر حکومت برطانیہ کے سامنے آزادی کا

پروگرام پیش کر سکیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم محمد علی جناح نے چودہ نکات کے نام سے ایک قرار داد مرتب کی ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلم زعماء کے اجتماع میں یہ نکات منظور کر لئے گئے۔ ان نکات کو عام مسلمانوں تک پہونچ کر اُن کے سامنے یہ نکات رکھے اور اُن سے اعتراف کروا لیا کہ اس سے زیادہ معقول اور رواداراَنہ اُصول اور نہیں ہو سکتے۔ مگر فرقہ پرست ہندو جو آزادی کے ہر مرحلے پر سنگِ راہ ثابت ہوتے تھے۔ اس موقع پر بھی اپنی تنگ نظری اور مسلم دشمنی کا مظاہرہ کرنے لگے اور انہوں نے سوائے مخلوط انتخاب کے مسلمانوں کا ہر مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر حسنِ اتفاق سے اُن دنوں ہندوؤں میں سب سے زیادہ غیر متعصب اور فراخ دل ہندو مسٹر سری نواس آئینگر کانگرس کے صدر تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم محمد علی جناح کی متفقہ کوششوں سے مسٹر آئینگر نے کانگرس سے یہ نکات منظور کروا لئے مگر کانگرس کے مہاتما نے اس بار بھی اپنی مہاتمائی شخصیت کا اثر ڈال کر نئے نکات مرتب کروائے اور پنڈت موتی لال نہرو نے کانگرس کے اجلاس میں ایک نئی رپورٹ پیش کی۔ جسے "نہرو رپورٹ" کے نام سے یاد کرتے ہیں اس رپورٹ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ برادران وطن کے دلوں میں مسلمانوں کے لئے بالکل جگہ نہیں ہے۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں کے سارے مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اور اُن کی ہستی مٹا دینے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اور پھر ستم یہ کہ اسے تمام قوموں کی متحدہ رپورٹ کا نام دیا گیا تھا۔ اس رپورٹ سے مسلمان بہت برہم ہوئے اور چند ناعاقبت اندیش مسلمانوں کے سوا تمام قوم نے اس سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس رپورٹ پر نہایت سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے کہا کہ آپکا بنایا ہوا یہ دستور

ہرگز متحدہ نہیں ہے۔ مسلمان قطعاً اس سے متفق نہیں ہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہے کہ آپ
مسلمانوں کو اپنے ساتھ سمجھ رہے ہیں" مولانا محمد علی جوہر نے طنز کے نشتر چلاتے ہوئے
ان الفاظ میں نہرو رپورٹ کے پرخچے اُڑائے کہ" جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے
میں پکارنے والے راستوں میں اس طرح پکارتے تھے کہ "خلق خدا کی، ملک ملکہ کا حکم
کمپنی بہادر کا" اس طرح نہرو رپورٹ کے تجویز کردہ دور میں منادی والے پکارا
کریں گے کہ "خلق خدا کی ملک انگریزوں کا اور حکم مہاسبھائیوں کا" آخرکار حکومت
نے یہ رپورٹ ردی کردی۔

یہ آزادی کی منزل کی طرف مسلمانوں کا پانچواں قدم تھا۔ کیونکہ اگر مسلمان بھی
نہرو رپورٹ منظور کرلیتے تو ایک تو وہ ہندوؤں کے دست نگر اور اُن کے غلام
ہوکر رہ جاتے دوسرے حکومت برطانیہ کو بھی یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ یہ رپورٹ
یقیناً ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ رپورٹ ہے اور پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سر
زمین ہندوستان پر آباد مسلمان کس قدر ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتے۔

اس رپورٹ کے رد ہونے پر کانگریسی حلقوں میں زبردست احتجاج کیا گیا۔
سول نافرمانی اور قانون شکنی کے ہنگامے برپا ہوگئے مگر مولانا محمد علی جوہر اور
قائداعظم محمد علی جناح کی زیر ہدایت اس بار مسلمان اس تحریک سے علیحدہ رہے
کیونکہ یہ تحریک درحقیقت مسلمانوں کے خلاف تھی۔ اس نکتہ کو مسلمان رہنما بہت
اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

گول میز کانفرنس

ہندوستان کی بدامنی اور خلفشار سے متاثر ہوکر برطانوی پارلیمنٹ
نے ۱۳ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں ہندوستان کے رہنماؤں کی
ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور کانگرس کو نظرانداز کرکے دوسری غیر مسلم
اور مسلم جماعتوں کے رہنماؤں کو دعوت نامے بھیجے۔ مگر چونکہ اس کانفرنس میں

کانگرس کی طرف سے کوئی نمائندہ شریک نہیں ہوا سوائے مہاسبھائی اور ان جیسی ذہنیت کے چند لیڈروں کے جنہوں نے کانگرس سے بھی زیادہ دل آزار رویہ دکھایا۔ آخر یہ کانفرنس بھی ناکام ہو گئی۔ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو لارڈ کرزن وائسرائے ہند اور مسٹر گاندھی میں ایک معاہدہ ہوا اور کانگرس کی تحریک سول نافرمانی ختم کر دی گئی اور دوسری گول میز کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں مسٹر گاندھی اور ان کے رفقائے کار نے شرکت کی مگر اس بار ان لوگوں نے اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے مسئلے کو خارج از بحث قرار دے دیا۔ مگر مسلمانوں نے یہاں تک فراخ دلی دکھائی کہ وہ مخلوط انتخاب تک ماننے کو تیار ہو گئے۔ آخرکار یہ کانفرنس بھی ناکام ثابت ہوئی۔ کانگریسی لیڈروں اور خاص طور پر مہاسبھائیوں نے سارے ہندوستان میں وسیع پیمانے پر ہندو مسلم فسادات شروع کر دئے اور اپنی شکست کا سارا غصہ بے گناہ مسلمانوں پر اتارا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۳ء تک فسادات کا یہ سلسلہ جاری رہا جس میں مسلمانوں کو بہت بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اور بعض شہروں میں تو ان کے خون سے ندیاں بہنے لگیں۔

صوبائی وزارتوں کا قیام

۱۹۳۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے انڈیا ایکٹ کے تحت نئی اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ جن کی رو سے صوبوں کو مجالس آئین ساز کی شکل میں حق خود اختیاری دیا جانے والا تھا۔ اس طرح ایک بار پھر سکون کی فضا قائم ہو گئی۔ صوبائی انتخاب کی گہما گہمی شروع ہو گئی اور مسلمانوں نے پھر ہندوؤں کی جانب دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ اور غیر مشروط طور پر کانگرس کی حمایت کرتے ہوئے اس کے نمائندوں کو ہر جگہ کامیاب بنایا۔ اس کامیابی کے نشے میں کانگرس اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی اور

صدر کانگرس پنڈت جواہر لال نہرو نے نعرہ لگایا کہ "اب ملک میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگرس اور دوسری حکومت برطانیہ"۔ ہندوؤں کی اس احسان فراموشی نے مسلمانوں کے دل توڑ دئے اور ساتھ ہی انھیں خبردار بھی کر دیا۔ اور پنڈت نہرو کا یہی نعرہ اس نئی مملکت کو معرض وجود میں لانے کا آخری محرک ثابت ہوا جسے تاریخ عالم میں "پاکستان" کے نام موسوم کیا گیا . . . . مسٹر محمد علی جناح نے جنھیں اب تاریخ قائد اعظم کے پُر جلال نام سے پکارنے والی تھی نہایت ہی گرجدار آواز سے للکارا کہ

"تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ حکومت اور کانگرس کے علاوہ یہاں ایک تیسری جماعت بھی موجود ہے جو آٹھ کروڑ مسلمانوں کی ناقابل نظر انداز طاقت ہے یہ جماعت اپنا مکمل ضابطۂ حیات رکھتی ہے"

انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وزارتیں بنانے کا مسئلہ پیش ہوا۔ کانگرس چاہتی تھی کہ ہماری وزارتیں بالکل آزاد ہوں اور گورنر کسی معاملے میں دخل نہ دے مگر حکومت یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس طرح کانگرس اور حکومت کے درمیان ایک بار پھر چپقلش شروع ہو گئی۔ اگر مسلم لیگ چاہتی تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی وزارتیں بنا سکتی تھی کیونکہ کانگرس کے بعد وہی سب سے بڑی جماعت تھی۔ مگر مسلم لیگ نے کسی ایک صوبے میں بھی وزارت بنانے کی پیشکش نہیں کی اور اسطرح اپنی شرافت کا ثبوت دیکر ایک بار پھر مسلمان قوم کا کیریکٹر نہایت اعلیٰ، بے داغ اور پاکیزہ ثابت کر دیا۔

جب حکومت نے کانگرس کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تو مجبور ہو کر کانگرس نے وزارتیں مرتب کرنی شروع کر دیں۔ اب ہندوؤں کے کیریکٹر کے مظاہرے کا وقت تھا مگر نہایت افسوس ہے کہ کانگرس نے اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے

ہندو قوم کے کردار کو نہایت ہی پست اور گھناؤنا بنا کر پیش کیا۔ چنانچہ سب سے پہلی شرط تو یہ لگائی کہ کانگریس وزارت میں وہی مسلمان شامل ہو سکتے ہیں۔ جو مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر کلی طور پر کانگریس میں شامل ہو جائیں گے۔ (لیکن انتخابات میں امداد کے وقت یہ قید نہیں تھی کہ وہی مسلمان ہماری امداد کر سکتے ہیں جو مسلم لیگ سے کلی طور پر علیحدہ ہو کر کانگریس میں آجائیں گے۔ یا ہم غیر کانگریسی مسلمانوں کی امداد قبول نہیں کریں گے) بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے کانگریسی وزارتوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اور ترنگے کے سائے میں مسلمانوں پر جو گذری وہ بڑی زہرہ گداز داستان ہے سب سے پہلے اردو کو مظالم کا نشانہ بنایا گیا اور ہندوستانی کا نام دے کر ایک ایسی زبان رائج کی گئی جس سے خود بہت سے ہندو نفرت کرتے تھے اور بیشتر اسے سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اُن کی مذہبی تعلیم کے خلاف گاندھی جی کی مورتی پوجنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اُن سے کہا گیا کہ حمد و ثنا کی بجائے روز صبح کو "بندے ماترم" کا ترانہ گایا کریں۔ گؤکشی کی ممانعت کر دی گئی۔ تجارت میں مسلمانوں کا مقاطعہ کر دیا گیا۔ ملازمتوں میں اُن کا تناسب کم کر دیا گیا۔ مسلمان کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔ سی۔ پی۔ کے (ایک ہندو وزیر صاحب) کا اپنے موٹر ڈرائیور کے ذریعہ ایک مسلمان نابالغ لڑکی کو اغوا کرنا اور پھر دونوں کا اُس کی عصمت دری کرنا ۔۔۔ ایسے دردناک اور انسانیت سوز واقعات سے کانگریسی راج کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

یہ حالات تھے جنہوں نے ایک بار پھر مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہمیں اپنی جان و مال، عزت و آبرو، تہذیب و تمدن اور مذہبی و ثقافتی سرمائے کو محفوظ کرنے کیلئے کیا کرنا چاہیئے چنانچہ مسلمانوں کے مدبر رہنما قائد اعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ

کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا اعلان کیا۔ مسلم لیگ کو از سر نو منظم کیا اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو اس جماعت کے پلیٹ فارم پر متحد ہونے کی تلقین کی۔ اور انھیں بتایا کہ وہ اسلام انسان کے لئے ایک ایسی فضا پیدا کرتا ہے جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہ فضا اسلامی نظام یعنی حکومت الٰہی کے قیام سے پیدا ہوتی ہے...... دور حاضر کی اصلاح میں اسی قسم کی فضا کو اسلامی کلچر کہا جائیگا جو دنیا کی ہر فضا سے الگ اور ہر کلچر سے جدا ہے اگر حالات کی نامساعدت سے کبھی ایسا وقت آجائے کہ یہ فضا مکدر ہو جائے تو مرد مومن پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ یا تو اس فضا کو پھر سے سازگار بنائے اور اگر ایسا ہونا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو تو کسی دوسری جگہ سازگار فضا کی طرف منتقل ہو جائے فضائے نامساعد میں قناعت سے زندگی بسر کرنا۔ اپنے آپ کو غیر فطری زندگی سے مانوس کر لینا مومن کے لئے جائز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ اس کی فطرت صالحہ مسخ ہو چکی ہے۔"

قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کو چودہ سو سال پہلے کا بھولا ہوا سبق یاد دلا کر دراصل ایک بہت ہی بلیغ اشارہ فرمایا تھا۔ یہ رہنمائی تھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اسلامی حکومت کی طرف یہ اُسی تصور کی نشان دہی تھی جو علامہ اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ "میری آرزو ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد (اسلامی) ریاست قائم کی جائے۔" غرض مسلم لیگ کا اجلاس منعقدہ لکھنؤ مسلمانوں کیلئے بہت ہی حیات آفریں ثابت ہوا اور ہندوستان کے منتشر مسلمان قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہونے لگے۔ یہ آزادی کی منزل کی طرف مسلمانوں کا چھٹا قدم تھا۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے جنگ کے شعلے بھڑکا دئے اور نہایت برق رفتاری سے یورپ کی حکومتوں کو پامال کرتا ہوا جزائر برطانیہ تک پہونچ گیا اس وقت انگریزوں کی حالت بہت نازک تھی وہ جنگ کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ اور انتہائی سراسیمگی کے عالم میں ہندوستان سے امداد طلب کر رہے تھے۔ اُن کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر کانگرس نے حکومت برطانیہ کے سامنے مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ مگر انگریزوں نے ان نازک حالات میں ہندوستان کو آزادی دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر کانگرس روٹھ گئی اور اُس نے اپنی وزارتوں کو مستعفی ہو جانے کا حکم دیدیا۔ کانگرسی دور حکومت میں مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے تھے اُن کی داستانیں ابھی لوگوں کی زبانوں پر تھیں۔ ناقابل اندمال زخم ابھی ہرے تھے۔ کہ کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ یہ دن ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے لئے بہت مبارک دن تھا۔ کہ اس روز مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظالمانہ راج سے نجات ملی تھی۔ چنانچہ قائداعظم محمد علی جناح کے حکم سے ۲۲ دسمبر کو اسی خوشی میں سارے ہندوستان میں یوم نجات منایا گیا اور ملک کی دوسری اقلیتوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر کانگریسی حکومت کے خلاف نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا۔

قرارداد پاکستان

اب وقت آچکا تھا۔ کہ قائداعظم مسلمانوں کے لئے اُس واضح منزل کا تعین کرتے جس کی طرف وہ لکھنؤ کے اجلاس میں ایک بلیغ اشارہ کر چکے تھے۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی شہر میں اس مرد آہن نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں کو نئی روشنی دکھائی۔ انھیں حیات نو کا پیغام دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ "آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس نے نہایت غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ کوئی دستوری

منصوبہ اُس وقت تک اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مرتب نہ کیا جائے ؛

جو جغرافیائی اعتبار سے ملی ہوئی وحدتوں کی حد بندی منطقوں کی شکل میں کردی جائے اور آنکو اراضی کی ضروری کمی بیشی کے ساتھ اس طرح تشکیل دیا جائے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے ۔ جیساکہ ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی منطقوں میں ہے ان کو یکجا کر کے مسلمانوں کے آزاد قومی وطن کی حیثیت سے آزاد مملکتیں قائم کردی جائیں ۔ جن کو تشکیل دینے والی وحدتیں خود مختار اور بااقتدار رہیں ۔

یہ آزادی کی منزل کی طرف مسلمانوں کا ساتواں قدم تھا ـــــ قائداعظم کی پیش کردہ اس قرارداد پر ہندوؤں اور انگریزوں دونوں نے بہت ناک بھوں چڑھائی ۔ ابتدا میں اس کا مذاق اُڑایا ۔ پھر جھنجلائے ۔ مسلمانوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا ۔ اعتراضات کی بارش کی ۔ مگر مسلمانوں کا شیر دل بہنا اور بیباک قائد اپنے موقف پر ڈٹا رہا ۔ آخر ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کو اس کے آستانے پر جھکنا پڑا ۔ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان تقسیم کر کے پاکستان کی آزاد اسلامی حکومت قائم کردی گئی ۔ مگر ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان کا مطالبہ بخوشی منظور نہیں کیا تھا ۔ بالفاظ دیگر انھیں شکست ہوئی تھی ۔ وہ جھنجلا رہے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ہندوستان گیر فسادات شروع کردئے ۔ جو ایک سوچی سمجھی اسکیم اور منظم سازش کا نتیجہ تھے ۔ لاتعداد مسلمان مولی اور گاجر کی طرح کاٹ دئے گئے ۔ ہزاروں عفت مآب مسلمان خواتین اغوا کرلی گئیں ۔ مسلمانوں کے مال و اموال کو نذرِ آتش کردیا گیا ۔ ہندو اور سکھ ریاستوں کی مسلح فوج اور پولس نہتے اور بے گناہ مسلمانوں کا شیرازۂ حیات بکھیرنے لگی ۔ اُن کے گاؤں کے گاؤں خاک سیاہ کردئے گئے ۔

شہروں میں اُن کی آبادیاں ویران کردی گئیں اور انھیں ہندوستان سے جبراً بیدخل ہونے پر مجبور کردیا گیا۔ مدافعت کے طور پر یا انتقاماً اس قسم کے چند واقعات مسلمانوں کے ہاتھوں بھی آئے۔ مگر وہ ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کے مقابلے میں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتے تھے۔

غرض ان ہوش ربا اور خونچکاں حالات میں پاکستان کا قیام معرض وجود میں آیا۔ ابتدا میں بہت کم لوگوں کو یقین تھا کہ پاکستان قائم بھی رہ سکے گا۔ مگر مسلمانوں کے صبر و ضبط اور قائد اعظم کی مخلصانہ اور مدبرانہ کوششوں سے نہ صرف پاکستان قائم رہا۔ بلکہ شب و روز ترقی کے مراحل طے کرنے لگا۔ اور تادمِ تحریر اسی راستے پر گامزن ہے۔

بیروزگاری اور اس کا انسداد

بیروزگاری کسی ملک کے لئے سب سے بڑی لعنت ہوتی ہے اور ملک و ملت کو تباہی کی طرف لے جانے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ ایک پیمانہ ہے جس سے کسی ملک کی اقتصادی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جو ملک خوشحال ہوگا جس ملک کے عوام فارغ البال ہوں گے جہاں معاش اور اس کے حصول کے ذرائع غیر محدود ہوں گے۔ اس ملک میں بے روزگاری کا گذر ناممکن امر ہے۔ لیکن جو ملک اپنی کفالت کرنے سے معذور ہوگا جہاں وسائل پیداوار اور حصول معاش کے ذرائع محدود ہوں گے وہاں بیروزگاری عام ہوگی۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کوئی ملک اس وقت تک ترقی کے مراحل طے نہیں کر سکتا جب تک اسکے عوام برسر روزگار اور معاش کی طرف سے مطمئن نہ ہوں۔ عوام کی خوشحالی اور ان کی فارغ البالی ہی میں ملک کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

حصول معاش کے عام طور پر چار ہی ذرائع ہیں۔ کاشتکاری، تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمت۔ جس ملک میں یہ چاروں ذرائع موجود ہوں وہاں بیروزگاری کا وجود ناممکن ہے۔ جب یہ ذرائع محدود ہو جاتے ہیں تو عوام بیروزگاری کا شکار ہو کر ملک کی پشت پر سرطان کا پھوڑا بن جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں عام طور پر زمینوں کا بہت بڑا حصہ چند بڑے بڑے زمینداروں یا مٹھی بھر جاگیرداروں کی ملکیت ہے یہ زمیندار اور جاگیردار غریب کاشتکاروں سے دن رات کی سخت محنت لے کر انھیں بمشکل اتنا دیتے ہیں کہ وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھر سکیں۔ ان حالات میں آئندہ کے لئے کچھ پس انداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب کسی

معمولی سی بات پر بہ ظالم اور مغرور زمیندار اور جاگیردار اپنے مزارعوں کو بیدخل کر دیتے ہیں تو اُن کے لئے بڑی دشواری پیش آتی ہے اور وہ وہاں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ دنوں بلکہ کبھی کبھی مہینوں تلاش معاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ بیروزگار ہوکر ملک کی بیروزگاری میں اضافہ کا باعث بن جاتے ہیں۔

بیروزگاری کی دوسری صورت تجارت کی سرد بازاری سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تجارت کی گرم بازاری ملک کی معاشی حالت سنوارنے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انگریز، جرمن، فرانس اور پرتگالی یورپ کی ان چار قوموں نے تجارت کی طرف توجہ دی دُنیا کے تقریباً ہر ملک میں تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ ممالک غیر سے خام مال خرید لاتے اپنے ملک میں لے جاکر انسانی ضرورتوں کی نفیس اور پائدار اشیاء بنا کر انھیں ملکوں میں فروخت کر دیا اس کے علاوہ اپنے ملک میں پیدا ہونے والی اشیاء کی بھی غیر ممالک سے تجارت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ممالک کا زر کثیر اُن کے ملکوں میں چلا گیا۔ انکے یہاں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی برسر روزگار ہو گئے۔ ملک ترقی کرنے لگا اور پھر ایک زمانہ ایسا آیا جب وہ دنیا کے بیشتر حصے پر حکومت کرنے لگے۔ لیکن جن ممالک کے لوگوں نے تجارت کی طرف توجہ نہیں دی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے ملک کا روپیہ غیر ممالک میں گیا۔ ملک کی اقتصادی حالت خراب ہوگئی۔ بیروزگاری عام ہونے لگی اور رفتہ رفتہ وہ غلامی کی آغوش میں جاکر ذلت کی نیند سو گئے۔ گویا تجارت سے قطع تعلق بیروزگاری کا دوسرا سبب ہوتا ہے۔

صنعت و حرفت کی کمی بیروزگاری کی تیسری وجہ ہے۔ جب ہماری زبان پر صنعت و حرفت کے الفاظ آتے ہیں تو اس سے مراد وہ صنعتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں گھریلو کہنا چاہیئے اور وہ صنعتیں بھی جو بڑی بڑی فیکٹریوں سے متعلق ہوتی ہیں۔

صنعتیں خواہ گھریلو ہوں یا فیکٹریوں سے متعلق، بیروزگاری کو دور کرنے میں بہت نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ گھریلو صنعتیں تو صرف ایک گھر کے چند افراد کے روزگار کا سبب ہوتی ہیں اور فیکٹریوں سے متعلق صنعتیں سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کے لئے روزگار مہیا کرتی ہیں۔ ملک میں زیادہ سے زیادہ فیکٹریوں یا کارخانوں کا وجود عوام کے لئے زیادہ سے زیادہ روزگار مہیا کرتا ہے۔ ان فیکٹریوں میں جہاں سیکڑوں کاریگر کام کرتے ہیں وہاں اُن سے متعلق کلرکوں، چپراسیوں، قلیوں اور افسروں کے لئے بھی روزگار مہیا ہوجاتا ہے اور ملکی مصنوعات کی کثرت ملک کو غیر ملکی مصنوعات سے بے نیاز کر دیتی ہے اس طرح ملک کا روپیہ ملک ہی میں رہتا ہے اور عوام خوش حال و فارغ البال ہو جاتے ہیں۔ مگر جس ملک میں صنعت و حرفت کا وجود نہ ہو یا برائے نام ہو وہاں بے روزگاری کا عام ہوجانا ایک لازمی امر ہے۔

بیروزگاری کی چوتھی وجہ ملازمتوں کا فقدان ہے۔ شاید ہی دُنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جہاں کے عوام کا ایک اچھا خاصا حصّہ ملازمت پر زندگی نہ گزارتا ہو۔ مگر جب ملازمتیں ناپید ہو جائیں تو ملازم پیشہ لوگوں کے لئے بیروزگاری کی خوفناک وادی میں ٹامک ٹوئیے مارنا یقینی بات ہے۔ ملازمتوں کا تعلق بھی بہت کچھ تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ سے ہے۔ ہر تجارتی و صنعتی ادارے کے ساتھ کلرک، چپراسی، قلی اور نگراں ہوتے ہیں جس قدر ان اداروں کی کثرت ہوگی اسی قدر لوگ ملازمت سے فائدہ اٹھائیں گے۔ مگر جب تجارت اور صنعت و حرفت سے متعلق ادارے کم ہونگے تو ملازمتیں بھی کم ہو جائیں گی جس کا لازمی نتیجہ عوام کی بیروزگاری کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

ان وجوہ کے علاوہ بیروزگاری کی چند وجوہ اور بھی ہیں اُن میں سے تعلیم کی کمی ایک بڑی وجہ ہے۔ آج ہمارے ملک کو اچھے انجینیروں لائق ڈاکٹروں فاضل اساتذہ

پروفیسروں کی ضرورت ہے مگر ہمارے ملک میں تعلیم کی کمی اچھے کلرک اور اکاؤنٹنٹ پیدا کرنے سے معذور ہے۔ کجا یہ کہ ڈاکٹروں، انجنیروں اور پروفیسروں کی معقول تعداد کو پیدا کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا ملک ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ جو ڈاکٹر، انجنیر اور پروفیسر کی حیثیت سے ملک کی خدمت کر رہے ہیں مگر ابھی ضرورت ہے کہ بکثرت لوگ اس طرف توجہ دیں۔ اس صورت میں جہاں ملک سے بیروزگاری دور ہو جائے گی وہاں ملک ان شعبہ جات میں فاضل اور ماہر لوگوں کی خدمات حاصل کر کے ترقی کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ پھر تعلیم خود ایسے راستے نکالے گی جن پر عمل کر بیروزگاروں کا خاتمہ کیا جائے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص جب تجارت کی طرف توجہ دے گا تو لازمی امر ہے کہ اسے نئے ڈھنگ سے چلائے گا۔ اس کا تعلیم یافتہ دماغ ترقی کے نئے راستے تلاش کرے گا۔ اس صورت میں جہاں اس کی تجارت ترقی کرے گی وہاں بہت سے بیروزگار لوگوں کے لئے روزگار مہیا ہو جائے گی۔ اسی طرح جو تعلیم یافتہ افراد صنعت و حرفت کے میدان میں قدم رکھیں گے وہ صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے نئی نئی راہیں نکالیں گے۔ ایک اصول اور سوچے سمجھے ہوئے طریق کے مطابق کام کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اُن کی صنعتیں ترقی کریں گی اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے کام مہیا ہو جائے گا۔

ہمارے یہاں اوّل تو تعلیم کی بہت کمی ہے پھر مشکل یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والوں کی اکثریت میٹرک پاس کرنے کے بعد اسکولوں کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔ اور اُن کا مطمح نظر کسی دفتر میں جا کر کلرکی کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک میں کلرک کی اتنی آسامیاں نہیں ہو سکتی ہیں جو تمام میٹرک پاس کرنے والوں کو ملازمت دے سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پریشان پھرتے ہیں اور بیروزگاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ کہلانے کی وجہ سے کوئی ایسا کام کرنا اپنی شان کے خلاف

سمجھتے ہیں جس میں اُن کے لباس کی نفاست اور مزاج کی لطافت مجروح ہو۔ اگر محکمۂ
تعلیم ہر اسکول میں ایسے فنون کی تربیت کا بھی انتظام کر دے جو اسکولوں سے سند لیکر
نکلنے والے نوجوانوں کے لئے معاش کی کفالت کر سکیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ چونکہ
وہ اسکول کی چہار دیواری میں رہ کر حصول تعلیم کے دوران میں یہ فنون حاصل کرنے
کے عادی ہو چکے ہوں گے اس لئے اسکول سے نکل کر انھیں ذریعہ معاش بنانے میں
کوئی حجاب محسوس نہیں کریں گے اور ملک کی بیروزگاری میں بھی کمی ہو جائیگی۔

بیروزگاری کی ایک وجہ بیجا شرم و حیا بھی ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اونچے
خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر گردشِ حالات نے انھیں بلندی سے پستی کی طرف
پھینک دیا۔ ناز و نعم میں پلے ہوئے لوگ جو دوسروں سے خدمتیں لیتے تھے خراب
حال ہو کر دوسروں کی خدمت کرنا عار سمجھتے ہیں۔ اگر اُن سے کہا جائے کہ اپنی زندگی
گذارنے کیلئے کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لو یا سڑک کے کنارے خوانچہ لگا کر ہی بیٹھ جاؤ
تو وہ اسے کسی حالت میں پسند نہیں کریں گے خواہ اُس جھوٹی وضع داری کے ہاتھوں
وہ فاقہ کشی ہی پر کیوں نہ مجبور ہو جائیں۔ ایسے لوگ جن میں غریب ہو کر بھی امارت
کی بو باس باقی ہے جینے سے تنگ پھر رہے ہیں اور بیروزگاری میں اضافہ کر رہے ہیں

ان وجوہ کے علاوہ دولت کی غلط تقسیم بیروزگاری کا بنیادی سبب ہے
مٹھی بھر امراء رؤسا اور زمیندار و جاگیردار دنیا کی دولت کا بہت بڑا حصّہ غصب
کئے بیٹھے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی آبادی کا بڑا حصّہ اُن کا دست نگر ہے
اور ایک حصّہ بیروزگار پھر رہا ہے۔ اگر دولت کی یہ غلط تفریق مٹ جائے ہر شخص
کے پاس مساوی دولت ہو۔ حکومت بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں
۔ اُن کی زمینیں لے لے انھیں قسطوں میں اُن کا معاوضہ ادا کر دیا جائے۔ اور
جن لوگوں کو زمینیں دی جائیں اُن کے ذمہ ایک رقم مقرر کر دی جائے جو وہ

بالاقساط دیتے رہیں۔ اس طرح نہ زمینداروں اور جاگیرداروں کو تکلیف ہوگی اور نہ عوام بیروزگاری کے ہاتھوں جینے سے تنگ آجائیں گے۔

ہمارے ملک میں زمینوں کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو ابھی تک غیر آباد پڑا ہے۔ اگر حکومت اس حصے کو اُن کے مالکوں سے لے کر بیروزگار لوگوں میں تقسیم کر دے اور انھیں کاشت کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دے تو اس طرح جہاں بہت سے لوگ برسرِ روزگار ہو جائیں گے وہاں زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا ہوگا اور ملک میں زرعی زمینوں کی کثرت ہو جائے گی اور ہمارا ملک حقیقی معنی میں فاضل غلہ پیدا کرنیوالا ملک بن جائے گا۔ اس طرح ہم اپنے یہاں کا فاضل غلہ دوسرے ممالک میں بھیج کر اپنی ملکی دولت میں اضافہ کر سکیں گے۔

فرض اور اُس کا احساس

دُنیا میں باعزت زندگی گذارنے بلکہ حقیقی معنیٰ میں زندہ رہنے کے لئے فرائض سے عہدہ برآ ہونا انتہائی ضروری ہے۔ نظامِ کائنات پر غور کیجئے اور اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالئے ہر فرد اور ہر چیز اپنے مخصوص فرائض کی ادائیگی میں مصروف ملے گی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نظامِ عالم کا انحصار اور اُس کی بقا کا دارو مدار فرض کی ادائیگی ہی پر ہے۔ جس وقت اسے نظر انداز کر دیا جائے نظامِ کائنات درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

مثال دیکھئے۔ سورج ایک وقت مقرر پر مشرق کی طرف سے طلوع ہوتا ہے یہ اُس کا فرض ہے۔ مخصوص راستوں سے گردش کرتا ہوا دوپہر کے وقت ٹھیک ہمارے سروں پر چمکتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ نیچے اترتا ہوا شام کو مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ یہ سورج کے فرائض ہیں جنہیں وہ ابتدائے آفرینش سے ادا کر رہا ہے۔ اگر ایک روز بھی وہ اس فرض کی ادائیگی سے غافل ہو جائے تو کائنات کا سارا نظام ابتر ہو جائے۔ اسی طرح چاند اور ستاروں کا حال ہے اور یہی کیفیت موسموں کی ہے کہ ایک مدت معیّنہ گذارنے کے بعد ایک موسم رخصت ہو جاتا ہے اور دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔ سردی، گرمی، برسات ہر موسم اپنے اپنے وقت پر آتا ہے اور اپنے فرائض ادا کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ اگر سردی کی جگہ لینے کے لئے گرمی اور گرمی کی جگہ لینے کے لئے برسات آ کر اپنے فرائض ادا نہ کریں تو جانداروں کی زندگی ناممکن ہو جائے۔

دور کیوں جائیے۔ اپنے جسم پر نگاہ ڈالئے۔ ہاتھ پیر، آنکھ، ناک کان، زبان، دماغ، معدہ غرض آپ کے جسم کے ہر حصّے کا ایک مخصوص فرض ہے اگر یہ سارے

حصّے یا ان میں سے کوئی ایک حصّہ اپنے فرض کو نظر انداز کردے تو آپ کی زندگی
موت کی آغوش میں سو جائے۔

انسان کے فرائض

بالکل اسی طرح ہر انسان کے ذمہ کچھ فرائض ہیں جن کی ادائگی نہ صرف اس کی ذات کیلئے بلکہ بحیثیت مجموعی پوری کائنات کی بقا کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ فرائض کی کئی قسمیں ہیں۔ کچھ فرائض اپنے اہل عیال کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ کچھ فرائض والدین کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ کچھ پڑوسیوں کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ کچھ فرائض قوم اور ملک کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ جب تک ہر انسان ان تمام عائد شدہ فرائض سے عہدہ برآ نہ ہو وہ ایک نیک اور سعادت مند بٹیا یا بیٹی، ایک شفیق ماں، یا باپ، ایک ذمہ دار شوہر، ایک ہمدرد پڑوسی۔ ایک معزز شہری اور قوم و وطن کا سچّا خادم نہیں کہلا سکتا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد ایک بچّے کا فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کے احکام کی تعمیل کرے۔ اگر اسے تعلیم کے لئے مکتب یا اسکول میں داخل کیا گیا ہے تو پوری توجہ اور محنت سے تعلیم حاصل کرے۔ اگر اسے دستکار بنانے کے لئے کسی صنعتی ادارے میں داخل کیا گیا ہے یا کسی دستکار کی دکان پہ بٹھایا گیا ہے تو وہ پوری دلچسپی اور محنت سے اس فن کی تربیت حاصل کرے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو نظر انداز کرکے اپنی عمر کا یہ عزیز ترین حصّہ ضائع کردے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جاہل رہ جائیگا عمر کا باقی حصّہ رو رو کر گزارے گا اس طرح نہ صرف اپنے خاندان اور اہل عیال کی تکلیف کا موجب ہوگا بلکہ ملک و قوم اور زمین کے لئے بھی بار ہوگا۔

والدین پر اپنی اولاد کی تربیت کے فرائض عائد ہوتے ہیں اگر والدین ان سے غافل ہو جائیں اپنی اولاد کی غور و پرداخت، اُن کی تعلیم، غذا، لباس اور صحت وغیرہ کا خیال نہ رکھیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اولاد جاہل، بے ہنر، کمزور اور عادات و اطوار

کے اعتبار سے قابل نفریں ثابت ہو گی۔

ہر ذمہ دار آدمی کا فرض ہے کہ اپنے اہل محلہ اور خاص طور پر پڑوسیوں سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ اگر کوئی شخص اپنے پڑوسی کی مصیبت میں اس کی امداد نہیں کرتا ہے۔ اس کی شادی یا غمی میں شریک نہیں ہوتا ہے اس سے خوشگوار تعلقات قائم نہیں رکھتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اس کے اہل محلہ اور پڑوسی اسے نظر انداز کر دیں گے اور وہ دوسروں سے بے تعلق ہو جائے گا۔ اس طرح ایک محلے کے رہنے والوں میں یگانگت، محبت، ہمدردی اور حسن سلوک کا فقدان محلے کو میدان جنگ میں تبدیل کر دے گا جہاں نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور کوئی شخص کسی کا ساتھ نہیں دے گا۔ اس طرح لوگ اجتماعی زندگی کی ساری برکتوں سے محروم ہو جائیں گے۔

ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوم اور ملک کی ترقی و بہتری کے لئے کوشاں رہے اور جب ضرورت پیش آئے تو کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ فرض کیجئے۔ ایک ملک پر غنیم چڑھ دوڑا۔ اگر اس ملک کے باشندے اپنی قوم اور ملک کی حفاظت کے لئے باہمی تعاون، اشتراک عمل اور پوری ہمت و شجاعت سے دشمن کا مقابلہ نہ کریں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم غلام ہو جائے گی، ملک برباد ہو جائے گا اور لوگ ذلت کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ان مثالوں سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ فرض کی کیا اہمیت ہے اور اس کی ادائیگی کے بغیر انسان کے لئے عزت کی زندگی گذارنا کتنا مشکل ہے۔ گویا ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ہم پر مختلف حیثیتوں سے جو فرض عائد ہوتے ہیں انھیں پوری مستعدی اور دیانت داری سے ادا کریں اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگیاں عزت و آرام اور اطمینان و سکون سے گذریں۔ آج یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے صرف

چھوٹے چھوٹے چند جزیروں کے رہنے والی قوم انگریز ہی کو دیکھ لیجئے۔ یہ مٹھی بھر لوگ دنیا کے بہت بڑے حصّے پر چھا گئے اور کئی سو سال تک اپنی سطوت و شوکت کے ڈنکے بجاتے رہے۔ اُن کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ صرف اس لئے کہ اُن میں فرض کی اہمیت اور اُس کا احساس موجود تھا وہ اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری، مستعدی اور دیانت سے ادا کرتے تھے۔ ہم جو کہ ہم ایک نوزائیدہ مملکت کے رہنے والے ہیں بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں اور وہ ہمیں اپنی ادائیگی کے لئے پکار رہے ہیں۔ اگر ہم بھی اپنے ملک اور اپنی قوم کو سرفراز اور دنیا میں ممتاز بنانا چاہتے ہیں تو فرض کی اہمیت کو سمجھیں اور اُس کی ادائیگی میں جان تک دینے سے دریغ نہ کریں تاکہ ہم دنیا میں مظفر و منصور اور نیک نام کہلائیں۔

گداگری اور اس کا انسداد

سبب ہر انسان کی لاتعداد ضرورتیں ہوتی ہیں۔ جنھیں پورا کرنا اُس کی زندگی کی بقا کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ صاحب استطاعت لوگ اپنی دولت کے بل پر ہر ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔ مگر مفلس اور تہی دست لوگ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کی استطاعت سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لئے مجبوراً دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ اس طرح گداگری کی ابتدا ہوتی ہے۔

گداگری کی اقسام گداگری کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جو اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر جن کا وقت بگڑ جاتا ہے۔ جن کی خاندانی نجابت و شرافت انھیں سڑکوں کے کنارے کھڑے ہو کر بھیک مانگنے سے منع کرتی ہے وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے اپنے رشتہ داروں سے قرض مانگتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی گداگری ہی کی ایک قسم ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گداگری کی ابتدائی صورت ہے۔ یا مہذب شکل ہے۔

دوسری صورت۔ مگر وہ لوگ جو نیچے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ماضی درخشاں اور تابناک نہیں ہوتا ہے وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر سڑک کے کنارے ہاتھ پھیلا کر یا چادر بچھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی صورت تو سائل کی سی بنا لیتے ہیں۔ مگر زبان سے بھیک نہیں مانگتے ہیں۔ بعض بلکہ بکثرت ایسے ہوتے ہیں جو راگیروں کو دعائیں دے دے کر یا خدا کا نام لے لے کر اور اس کے غضب سے ڈرا ڈرا کر بھیک مانگتے ہیں۔ گداگروں کی موخر الذکر قسم ہمارے ملک میں عام ہے۔

گداگری کے نقصانات

سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا ایک فقیر جو آواز لگا لگا کر بھیک مانگ رہا ہوتا ہے بظاہر ہمیں یا ہمارے معاشرے کو کوئی نقصان نہیں پہونچاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمیں اور ہمارے ملک کو گھن کی طرح کھا رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے عمل سے یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ اگر تمہاری ضرورتیں پوری نہ ہو سکتی ہوں۔ تو آؤ اور میری صف میں شامل ہو جاؤ۔ اس طرح ایک برا نمونہ دکھا کر وہ دوسروں کو بھی اس مذموم فعل پر اکساتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ گداگروں کی زیادتی کسی ملک کی اقتصادی بدحالی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ غیر ملکی سیاح کسی ملک میں جانے کے بعد جن چیزوں سے اُس ملک کی معاشی حالت اور عوام کی آسودگی یا غیر آسودگی کا اندازہ لگاتے ہیں اُن میں عوام کے لباس۔ اُن کا رہن سہن، اُن کے مکانات، اُن کی غذا اور اُس ملک میں گداگروں کی تعداد خاص طور پر شامل ہے۔ اس طرح گویا گداگروں کا وجود غیر ملک کے لوگوں کی نظروں میں اپنے ملک کو حقیر بنا دیتا ہے۔ گداگری ایک بہت بڑی لعنت ہے جو انسانی ذہن اور دل و دماغ کو انتہائی پست سطح پر لے آتی ہے غیرت اور حمیت جن کا انسانی کردار بنانے میں بہت بڑا حصہ ہوتا ہے نہ صرف رخصت ہو جاتی ہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے مر جاتی ہیں۔ گداگر کا معاشرے میں انتہائی پست مقام ہوتا ہے۔ لوگ بھنگی اور چمار کو بھی اُس سے اچھا سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے قوت بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ ہر با حمیت اور غیرت دار انسان گداگر سے نفرت کرتا ہے۔ گداگر ہمارے معاشرے کا وہ فرد ہے جسے اکثر لوگوں کی دھتکاریں سننی پڑتی ہیں۔ جو زمین کا بوجھ ہوتا ہے۔ بوجھ بھی وہ جسے کوئی سہارنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔

گداگری کے مسئلے کو جب اس پہلو سے دیکھتے تو اور بھی افسوسناک معلوم

ہوگا کہ ہر معاشرے اور ہر ملک کے لوگ باہمی اور مشترکہ جدوجہد سے زندگی کے مراحل طے کرتے ہیں۔ انفرادی یا اجتماعی حیثیتوں سے روزی کماتے ہیں مگر کتنے رنج کی بات ہے کہ اس معاشرے اور اسی ملک کا ایک طبقہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے زندگی کی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں اہل معاشرہ اور اہل ملک کا ذرہ برابر ہاتھ نہیں بٹاتا ہے۔ حصول معاش کے لئے مطلق ہاتھ پیر نہیں ہلاتا ہے۔ مگر جب کھانے کا وقت آتا ہے تو سب سے آگے ہوتا ہے یا کم از کم سب کے برابر بیٹھ کر کھاتا ہے۔ حالانکہ اصولاً کھانے کا بھی اسی کو حق ہے جو کمانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتا ہے۔ اس طرح وہ مفت کی روٹیاں توڑتا ہے اور شب و روز کی محنت سے کمانے والوں کی جیبیں خالی کر لیتا ہے۔

گداگری کا انسداد

ان حالات میں ایک باوقار اور معزز ملک کے عوام کیلئے ضروری ہے کہ انھیں جتنی جلد ہو سکے گداگری کی لعنت سے نجات دلائی جائے اور گداگروں کو بھی باعزت زندگی سے ہمکنار کیا جائے۔ اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری ارباب حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ایک ذمہ دار ملک کی سچی خادم اور حساس حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شہری کے لئے باوقار روزگار مہیا کرے اور جو لوگ بالکل اپاہج اور معذور ہوں اُن کے لئے محتاج خانے قائم کرے۔ اسلامی حکومت کی تاریخ میں ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگ خیرات دینے کے لئے نکلتے تھے اور خیرات لینے والے نظر نہیں آتے تھے۔ تاریخ اسلامی ایسے مسلمان بادشاہوں کے نام بھی بتاتی ہے جنھوں نے اپنی سلطنت کے معذوروں کے روزینے مقرر کر دئے تھے۔ ایسے اپاہج خانوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں اپاہجوں کی خورد و نوش اُن کے لباس اور آرام و آسائش کا پورا لحاظ رکھا جاتا۔

تھا۔ اُن کی خدمت کرنے کے لئے خدمت گزار متعین کردئے گئے تھے۔ موجودہ زمانہ جو گزشتہ زمانوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے جب ہر قسم کے ذرائع غیر محدود ہیں کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ اپاہجوں اور لاچاروں کے لئے روزینہ مقرر کئے جائیں اور انھیں محتاج خانوں میں پناہ دی جائے۔

گداگروں میں سے وہ لوگ جو اپاہج نہیں ہیں بلکہ روزگار نہ ہونے کی وجہ سے یہ ذلیل حرکت کرتے ہیں۔ یا وہ گداگر جو اس کے عادی ہو چکے ہیں حکومت کی ذراسی توجہ سے باعزت زندگی گذار سکتے ہیں۔ اگر ہر بڑے شہر میں تھوڑا سا بھی سرمایہ لگا کر ایسے سرکاری ادارے قائم کردئے جائیں جو ان گداگروں کو مختلف قسم کی دستکاریاں سکھائیں۔ مثلاً ترکھان کا کام، موچی کا کام، کپڑا بننے کا کام ان تربیت یافتہ لوگوں کو انھی اداروں میں بھی کام دلوایا جاسکتا ہے۔ اور انھیں تربیتی اداروں کو وسیع کرکے کارخانوں کی صورت دی جاسکتی ہے۔ بہتر بھی یہی ہے کہ اسی ادارے کے تربیت یافتہ اسی کارخانے میں کام کریں۔ اس طرح گداگری کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اور ملک کی مصنوعات میں بھی روز بروز اضافہ ہوگا۔

تعلیم نسواں

تعلیم ہر انسان کے لئے یکساں ضروری ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اس
میں شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں مرد پیش پیش
ہیں۔ خواتین کے لئے حصولِ تعلیم بظاہر ضروری معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر غور سے دیکھئے
تو معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تعلیم نسواں کے مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا
ہے کہ جب حصولِ معاش کے فرائض مردوں کے ذمہ ہیں تو عورتوں کو تعلیم دلوانے کی
کیا ضرورت ہے؟ مگر یہ اعتراض کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ تعلیم صرف حصول
معاش کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حصول معاش زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے
مگر وہ لوگ بھی تو زندہ ہیں جو دستخط کرنا بھی نہیں جانتے ہیں بلکہ بہت سے تعلیم
یافتہ لوگوں سے کہیں بہتر ہیں۔ معمولی دستکاروں سے لے کر لکھ پتی تجارت پیشہ لوگوں
تک ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو انگریزی تو درکنار اردو لکھنے پڑھنے کی سعادت سے
بھی محروم ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک زندگی گذارنے کا تعلق
ہے۔ وہ بغیر حصول تعلیم کے بھی گذاری جا سکتی ہے۔ علم کا مقام اس سے کہیں زیادہ
بلند ہے علم تو دراصل انسان کے ذہن و دماغ کو جلا بخشتا ہے۔ علم ایک مشعل ہے
جس کی روشنی میں زندگی کے نشیب و فراز طے کئے جاتے ہیں۔ علم کائنات میں انسان
کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ علم انسان میں خود آگاہی و خودنگری
پیدا کرتا ہے۔ علم کی ان تعریفوں کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں ہے کہ اس
کی ضرورت ہر شخص کے لئے یکساں ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ بلکہ مجھے کہنے دیجئے
کہ مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے لئے تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ پوچھیں گے،

وہ کیسے؟ تو سنئے۔

اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ بچے کی پرورش اور تربیت ماں کی آغوش ہی میں ہوتی ہے اور باپ کے مقابلہ میں ماں کے ساتھ اس کا تعلق زیادہ قریبی اور گہرا ہوتا ہے۔ اگر کسی بچے کی ماں تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہو گی تو وہ بچے کی پرورش اور تربیت کسی اصول کے تحت کرے گی۔ ابتدا ہی سے اسے ایسی ڈگر پر ڈالے گی جس پر چل کر اس کا مستقبل نہایت روشن اور تابناک ہو گا۔ لیکن ایک جاہل ماں اپنے بچے کی پرورش اور تربیت کسی اصول کے تحت کرنے سے معذور ہو گی۔ جس کے دماغ میں علم کی ایک ہلکی سی کرن کا بھی گذر نہیں ہو سکا اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت اس ڈھب سے کرے گی کہ وہ جدید تقاضوں پر پورے اتر سکیں۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آخر پچھلے زمانوں میں بھی تو دنیا آباد تھی اور جاہل ماؤں کی گود میں تربیت پانے والے بچے بڑے بڑے مناصب پر پہونچتے تھے۔ پھر اب ایسی کونسی تبدیلی پیدا ہو گئی کہ صرف تعلیم یافتہ ماؤں کے بچے ہی ترقی کر سکتے ہیں۔ اور غیر تعلیم ماؤں کے بچوں کو زندگی میں کوئی اعلی مقام نہیں مل سکتا۔ مگر اس زاویہ سے سوچنا صحت مند فکر کی علامت نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے کہ جب غیر تعلیم یافتہ ماؤں کی آغوش میں تربیت پانے والے بچے ترقی کے بلند ترین مدارج حاصل کر لیتے تھے۔ مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ اس زمانے میں تعلیم اس قدر عام نہیں تھی۔ درس گاہوں اور اعلی تعلیم کے اداروں کی اتنی کثرت نہیں تھی۔ وہ دنیا موجودہ دور کی حیران کن ایجادات سے روشناس نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے کی ضرورتیں موجودہ دور کی ضرورتوں سے مختلف تھیں چونکہ تعلیم کا تناسب عام طور سے بہت کم تھا یہی وجہ تھی کہ خواتین کی تعلیم پر بھی

بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ مگر موجودہ دور جو گذشتہ زمانوں سے یکسر مختلف ہے
جدید تقاضے اور نئی ضرورتیں لے کر آیا ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کہ نئی
پود کی تربیت و نگرانی نئے اصولوں پر ہو اور یہ تربیت و نگرانی ماں سے زیادہ بہتر
طریقے سے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اگر ماں تعلیم یافتہ ہوگی تو بچوں کی تربیت پر بھی
خوشگوار اثر پڑے گا۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ بچپن میں انسانی ذہن آئینہ کیطرح صاف ہوتا ہے
وہ ہر [illegible] اثرات کو نہایت آسانی سے قبول کر لیتا ہے عمر کے اس دور میں اسے
جس قسم کی تربیت دی جائے گی وہ اس کے ذہن کے پردے پر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے
گی ابتدائے عمر کے نقش بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ ماں اس عمر
میں بچے کی نہایت عمدہ تربیت کر سکتی ہے۔ جس کی ایک غیر تعلیم یافتہ ماں سے توقع
نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس پہلو سے ہٹ کر اگر آپ یوں سوچیں کہ بچوں کو تربیت دینے کے علاوہ
بعض اور مرحلوں پر بھی خواتین کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے۔ ہم اور آپ سب
جانتے ہیں کہ بیماری انسانی زندگی کا لازمہ ہے جس کے تدارک کے لئے علاج
انتہائی ضروری ہے۔ بیمار مردوں کا علاج تو مرد طبیب اور ڈاکٹر کر سکتے ہیں۔ لیکن
اگر کوئی خاتون بیمار ہو جائے اور پردہ دار ہو تو اُس کا علاج کون کرے گا۔ اگر
خواتین کو تعلیم کے میدان میں جانے سے روک دیا جائے تو وہ لیڈی ڈاکٹر جو ہماری
ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کا علاج کرتی ہیں کہاں سے آئیں گی۔ شاید کوئی شخص
یہ کہے کہ بیماری کے ایام میں مرد ڈاکٹر کے سامنے جانا از روئے شریعت گناہ نہیں
ہے تو یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ مستورات بعض ایسے امراض میں بھی
مبتلا ہو جاتی ہیں جن کا علاج صرف لیڈی ڈاکٹر ہی کر سکتی ہے۔ ایک حیادار عورت
خواہ کتنی ہی شدید تکلیف میں مبتلا ہو وہ اپنے جسم کے بعض حصوں کا معائنہ کسی طرح

مرد ڈاکٹر سے کروانے کیلئے تیار نہیں ہوگی۔ پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اگر مستورات کو حصول تعلیم سے روک دیا گیا تو ہسپتالوں کے زنانہ وارڈ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیں گے جہاں سینکڑوں ڈاکٹرنیاں اور نرسیں ہماری مستورات کی تیمارداری اور خدمت کرکے انہیں صحت کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔

اس مسئلے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ دو انسانوں کو شریک حیات کی حیثیت سے زندگی گذارنے کیلئے ضروری ہے کہ دونوں کی ذہنی سطح تقریباً برابر ہو۔ غور فرمایئے کہ ایک نوجوان تو گریجویٹ ہے۔ اور جس لڑکی کے ساتھ اُس کی شادی کی جاتی ہے وہ حروف تہجی کی شناخت بھی نہیں کرسکتی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا اُن دونوں کی زندگی خوشگوار ماحول میں بسر ہو سکے گی۔ ایک تعلیم یافتہ مرد اُس وقت تک صحیح معنوں میں ذہنی آسودگی حاصل نہیں کرسکتا جب تک اُس کی رفیقہ حیات بھی زیور تعلیم سے آراستہ نہ ہو۔ اُس مرد کو کس قدر دکھ ہوگا۔ جب وہ گھر میں آکر اپنی بیوی سے دُنیا کے اہم مسائل پر گفتگو کرنا چاہیئے گا۔ مگر بیوی اپنی جہالت کی وجہ سے بت بنی بیٹھی رہے گی یا اوٹ پٹانگ اور بے تکے جواب دے گی۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ علم انسان کے ذہن میں نفاست پیدا کرتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت اپنی نشست و برخاست، اپنی گفتگو اپنے رہن سہن اور گھر گرہستی میں جس صفائی اور نفاست کا اظہار کر سکتی ہے اُسکی ایک غیر تعلیم یافتہ عورت سے توقع نہیں ہو سکتی۔ ہر مرد یہ چاہتا ہے کہ اُس کی شریک حیات امور خانہ داری کو ایسی خوش اسلوبی سے انجام دے کہ اُسکا گھر جنت کا نمونہ بن جائے۔ جب اسے اپنے گھر میں یہ نفاست اور قرینہ نظر نہیں آتا تو وہ برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اور ایسی بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے جو اچھے خاصے گھر کو جہنم

نزار بنا دیتی ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی تعلیم کی نعمتوں سے بہرہ یاب کیا جائے۔ اور کم از کم اردو لکھنے پڑھنے اور امور خانہ داری کی اتنی تعلیم ضروری جائے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں کسی کی محتاج نہ ہوں۔ خط و کتابت کر سکیں اور گھریلو معاملات کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ اس کے بعد مزید تعلیم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جو حالات، ضروریات اور فطری مناسبت کے مطابق حل کیا جا سکتا ہے۔

دیہاتی زندگی

دیہات ہماری معاشرتی زندگی کی ابتدائی کڑیاں ہیں۔ جب انسانوں نے مل جل کر رہنے کی ضرورت محسوس کی تو ایک خاندان یا آپس میں تعلقات رکھنے والے چند خاندان نے کسی ایسے قطعہ زمین کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا۔ جہاں پینے کیلئے پانی۔ جانوروں کیلئے چارہ اور کھیتی باڑی کرنے کیلئے مناسب جگہ مہیا ہو سکے اس طرح انسان نے اپنی مشترک ضروریات کے پیش نظر دنیا کے مختلف حصوں میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں قائم کر لیں۔ ان میں سے جو آبادیاں شاہراہوں کے قریب واقع تھیں۔ جہاں سے ملک کے مختلف حصوں کو آنے جانے والے قافلے گذرتے تھے انھوں نے ترقی کرتے کرتے شہروں کی صورت اختیار کر لی۔ اور جو آبادیاں ترقی نہ کر سکیں اور اپنی پرانی وضع قطع پر قائم رہیں وہ آج بھی دیہات کہلاتی ہیں۔

عادات و اطوار

دیہات کے لوگ شہریوں کے بہ نسبت زیادہ سادگی پسند مہمان نواز اور متواضع ہوتے ہیں۔ تصنع اور تکلف جو بہت کچھ تعلیم اور نئی تہذیب کا رہین منت ہے۔ دیہات کے لوگ اُس سے کوسوں دور ہوتے ہیں چونکہ اُن کی حصول معاش کے ذرائع محنت طلب ہوتے ہیں۔ شہروں کے لوگوں کیطرح دفاتر میں کلرکی، چپراس گیری۔ پنکھا کشی، اور وسیع پیمانے پر تجارت اُن کی معاش کے ذریعہ نہیں ہوتے ہیں۔ وہ کڑکڑاتے جاڑے میں ایک پہر رات سے بیدار ہوتے ہیں اور اپنے ہل اور بیل لے کر کھیتوں میں نکل جاتے ہیں۔ جس وقت شہر کے لوگ ناشتہ کر رہے ہوتے ہیں اُس وقت وہ اپنے کھیتوں میں ہل چلا چکے ہیں گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر میں وہ اپنے کھیتوں میں مٹی کے ڈھیلے پھوڑ رہے ہوتے

ہیں۔ جب شہر کے رہنے والے خس کی ٹٹیوں یا بجلی کے پنکھوں کے نیچے بہت آرام
سے مصروف کار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شہریوں کی بہ نسبت بہت زیادہ
محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ اور اُن کی صحت قابل رشک ہوتی ہے۔ بہادری اُن کا
نمایاں جوہر ہوتا ہے۔ ڈر اور خوف سے اُنھیں کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

تہذیب و تمدن اور نئی تعلیم لوگوں میں تصنع اور تکلف پیدا کر دیتی ہے مزاج
کی لطافت لباس کی نفاست اور نشست و برخاست کا تکلف شہریوں کو سست
اور آرام طلب بنا دیتا ہے۔ مگر گاؤں کے لوگ جو اس نئی روشنی اور دنیاوی
تہذیب سے "نابلد" ہوتے ہیں اس قسم کے تکلفات سے پاک ہوتے ہیں یہی وجہ
ہے کہ وہ شہریوں کی بہ نسبت سادگی پسند اور متواضع ہوتے ہیں۔ جب کسی شہری
کے یہاں کوئی مہمان آجاتا ہے تو وہ اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ اور تکلفات کی وجہ سے اُسکی
خاطر مدارات میں بھی تکلفات برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اُس کا بستر میلا یا پھٹا
ہوا ہے تو کسی پڑوسی کے پاس جا کر بستر کی بھیک مانگتا ہے خود شرمندہ ہوتا ہے اور
اُسے بھی شرمندہ کرتا ہے اگر اس میں مہمان کی تواضع کے لئے پر تکلفات کھانوں
کی استطاعت نہیں ہے تو قرض ادھار کر کے اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتا
ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقروض ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے سامنے
نادم ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب شہریوں کے یہاں مہمان آجاتے ہیں۔
تو وہ عجیب ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور مہمانوں کا زیادہ دن ٹھہر
جانا تو اُن کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے۔ مگر برعکس اس کے دیہات
کے لوگ بہت سادہ ہوتے ہیں۔ جب اُن کے یہاں کوئی مہمان آتا ہے تو وہ
تصنع اور تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر پوری فراخ دلی سے اُس کی آؤ بھگت
کرتے ہیں۔ اور جو کچھ اُن کے پاس ہوتا ہے وہ مہمان کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں

جیسا وہ خود کھاتے ہیں ویسا ہی مہمان کو کھلاتے ہیں۔ جیسا بستر وہ خود استعمال کرتے ہیں بغیر کسی تکلف کے ویسا ہی مہمان کو دیتے ہیں۔ بلکہ اگر کسی دیہاتی کے یہاں مہمان آجائے تو سارا گاؤں اسے اپنا مہمان تصور کرتا ہے۔ اور اس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں مثلاً گھی، دودھ غلہ اور سبزیاں گاؤں میں بافراط ہوتی ہیں اور تقریباً گاؤں میں رہنے والا ہر شخص گائے بھینس پالتا ہے۔ غلہ اور سبزیوں کی کاشت کرتا ہے۔ مہمان کے آنے پر انھیں کوئی چیز باہر سے نہیں خریدنی پڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ مہمانوں کی آمد اُنکے لئے کسی تکلیف کا باعث نہیں ہوتی ہے بلکہ اگر ان کے یہاں مہینہ دو مہینہ بھی کوئی مہمان ٹھیر جائے تو بھی وہ کسی قسم کی فکر یا تکلیف محسوس نہیں کرتے ہیں

شہریوں کے مقابلے میں عموماً وہ بہت زیادہ صاف گو ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مصلحت اور زمانہ سازی سے جو شہریوں کا زیور ہوتے ہیں گاؤں کے لوگ پاک ہوتے ہیں۔ وہ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ہم جس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں اسکے کیا نتائج ہونگے سیدھے سادے الفاظ میں اظہار حقیقت کر دیتے ہیں۔

وضع قطع بیجا اور غیر ضروری شرم اُن کی فطرت میں نام کو بھی نہیں ہوتی ہے اس لئے وہ سادہ لباس اور سادہ وضع قطع میں مگن رہتے ہیں گاڑھے یا کسی اور موٹے جھوٹے کپڑے کی تہبند۔ اسی قسم کے موٹے اور سستے کپڑے کا کرتہ بھاری سی پگڑی۔ موٹے اور بھدے چمڑے کا پرانی وضع کا جوتا اور ہاتھ میں لاٹھی یہ اُن کی وضع ہوتی ہے۔ وہ اسی وضع سے بلا تکلف اپنے رشتہ داروں میں جاتے ہیں۔ اور اسی وضع سے شہروں میں آتے ہیں۔

چوپال کی اہمیت گاؤں کی زندگی میں چوپال کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے جو بظاہر مٹی کی موٹی موٹی دیواروں اور پھوس کے چھپر سے

ڈھکی ہوئی ایک پرانی وضع کی وسیع عمارت ہوتی ہے۔ جس میں مٹی کا چراغ غریبوں کے تیل سے روشن ہوتا ہے۔ مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بغیر اس فرسودہ عمارت کے گاؤں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دن بھر کے تھکے ماندے دیہاتی اپنے اپنے حقے لے کر شام کے وقت یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ ہل، بیل، بیج، فصل، موسم اور پانی اُن کے محبوب موضوع ہوتے ہیں۔ گاؤں کے اہم واقعات شہروں سے آئی ہوئی تازہ خبریں اور غلے کے نرخ چوپال میں خاصی گرمی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہیں لین دین بیاہ شادی اور جھگڑے فساد کے معاملات پیش ہوتے ہیں۔ اُن پر رائے زنی ہوتی ہے اور یہیں اُن کے فیصلے ہوتے ہیں۔ گاؤں کے معمر لوگوں کو اس چوپال میں بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے اور گاؤں کے نوجوان اور ادھیڑ عمر کے لوگ عام طور پر اُن کے رائے اور فیصلے کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اکثر و بیشتر اُن پر عمل کرتے ہیں۔

طبقاتی زندگی

گاؤں میں عموماً چار طبقوں کے لوگ آباد ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بڑی بڑی زمینوں کے مالک ہوتے ہیں۔ جن کا لباس دیہات کے عام لوگوں سے زیادہ صاف ستھرا اور قیمتی ہوتا ہے۔ جن کے خدمت کو نوکر اور سواری کیلئے اعلیٰ نسل کے گھوڑے، ٹم ٹم، تانگے اور بعض جگہ کاریں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ عموماً نشۂ امارت میں مغرور ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو گاؤں کی عام سطح سے بلند سمجھتے ہیں۔ دوسروں کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر زندگی گذارتے ہیں اور انھیں کو مظالم کا نشانہ بناتے ہیں۔ کام کرنے میں انتہائی سست اور لگان وغلہ وصول کرنے میں بہت تیز اور چست ہوتے ہیں۔ گاؤں کی آبادی ان کے ہاتھوں بہت پریشان اور مضطرب رہتی ہے۔

دوسرا طبقہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جنھیں متوسط طبقے کے لوگ کہنا چاہئے

ان کے پاس تھوڑی زمنیں ہوتی ہیں جن پر کاشت کر کے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تیسرے طبقے میں وہ لوگ شامل ہیں جو خود زمینوں کے مالک نہیں ہوتے ہیں بلکہ بڑے بڑے زمینداروں کی زمینوں پر کاشت کرتے ہیں سردی کی راتوں اور گرمی کی دوپہر میں سخت سے سخت تکلیفیں اُٹھاتے ہیں۔ دھرتی کا سینہ چیر کر سونا اگلتے ہیں۔ جن کی محنت کی بدولت امیروں کے چہرے سرخ ہوتے ہیں مگر یہ لوگ دو وقت کی روٹی کے لئے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ ان کے لباس پھٹے ہوتے ہیں اور قرض کا بوجھ ان کی کمر کو دوہرا کر دیتا ہے بڑے زمینداروں کا ڈنڈا الگ ان کی جان کنی کے لئے تیار رہتا ہے چوتھا طبقہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے۔ جو بڑے بڑے زمینداروں کی خدمت کرتا ہے۔ جس میں نائی۔ دھوبی۔ موچی جلاہے اور چھوٹے چھوٹے دوکاندار بھی شامل ہیں۔ یہ طبقہ عموماً غریب اور مفلوک الحال ہوتا ہے۔

ت مناظر قدرت

گاؤں کا محل وقوع ماحول اور ارد گرد کا منظر بڑا سہانا ہوتا ہے سرسبز وشاداب اور لہلہاتے ہوئے کھیت۔ سرسوں کے زرد زرد پھول حد نظر تک پھیلے ہوئے وسیع میدان، کہیں نہریں، کہیں دریا۔ صبح کا سہانا سماں، شام کا جھٹ ٹپا۔ شفق کی سرخی۔ چڑیوں کا چہچہانا۔ گاؤں والوں کے رسیلے گیت علی الصبح چکیوں کی گھوں گھوں۔ بیلوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں۔ غرض یہ ساری چیزیں مل کر انسان کے دل ودماغ اور نظر پر نہایت لطیف اور مست کن اثر ڈالتی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت تمام حجابات الٹ کر سامنے آگئی ہے۔

اصلاح کی ضرورت

ان تمام باتوں کے باوجود ایک بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام طور سے گاؤں کی اندرونی فضا کسی قدر

گندی ہوتی ہے۔ راستے ناہموار ہوتے ہیں جہاں بارش کے دنوں میں پانی جمع
ہو جاتا ہے۔ نالیاں کچی اور گندی رہتی ہیں۔ پانی کے نکاس کا معقول انتظام نہیں
ہوتا ہے۔ روشنی اور صفائی بھی نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے ملیریا اور بعض
دوسری بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں جو وہاں کے لوگوں کی صحت پر خراب اثر ڈالتی
ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے۔ کہ گاؤں کے راستوں کو وسیع اور ہموار بنایا جائے
پانی کے نکاس کا انتظام کیا جائے۔ پختہ اور نشیب دار نالیاں بنوائی جائیں۔
صفائی کا انتظام کیا جائے۔ گاؤں کی آبادی کے باہر کوئی ایک جگہ مقرر کر دی جائے
جہاں گاؤں بھر کا کوڑا کرکٹ اور گوبر وغیرہ جمع کر دیا کریں۔ اس سے دو فائدے
ہوں گے ایک تو گاؤں صاف رہے گا دوسرے کوڑا کرکٹ اور گوبر وغیرہ ایک جگہ
جمع کر دینے سے کھیتوں کے لئے اچھے قسم کی کھاد مل جایا کرے گی۔ بہتر ہے کہ
اس کوڑے کرکٹ اور گوبر وغیرہ کو ایک گہرا اور چوڑا گڑھا کھود کر اس میں جمع کر
دیا جائے۔ بعد جب وہ گڑھا بھر جائے تو اسے مٹی ڈال کر بند کر دیا جائے اور
پھر دوسرا گڑھا کھود لیا جائے۔

ہر گاؤں کے ساتھ ایک چھوٹی سی ڈسپنسری اور ایک کمپونڈر کا ہونا بھی
ضروری ہے تاکہ حسب ضرورت ابتدائی طبی امداد مہیا ہو سکے۔ ہر گاؤں میں
ایک صفائی کا نگراں اسسٹنٹ سینیٹری انسپکٹر یا کم از کم چند بھنگی اور ان کا
ایک انچارج جسے جمعدار کہنا چاہئے ہونا ضروری ہے تاکہ وہ گاؤں کی صفائی کا
ذمہ دار ہو۔ روشنی کا ناکافی انتظام بھی گاؤں والوں کیلئے طرح طرح کی مشکلات پیدا کر دیتا
ہے۔ اب تو حکومت کا شعبہ برقیات گاؤں میں بھی بجلی سپلائی کرنے کی کوشش کر
رہا ہے۔ مگر جب تک بجلی نہیں آتی ہے اس وقت تک کم از کم ہر تیس قدم کے
فاصلے پر ایک تیز روشنی والا بڑا لیمپ ہونا ضروری ہے جسطرح بعض شہروں میں مونسپل

بورڈ کی طرف لالٹین نصب ہوتی ہیں۔ گاؤں والوں کے مکانات عموماً تنگ و تاریک ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں جدید طرز کے مطابق صحت کے نقطۂ نگاہ سے بنایا جائے۔ جس میں ہوا اور روشنی کے لئے روشن دان ہوں۔ اُن کا رُخ ہوا اور سورج کی طرف ہو تاکہ روشنی اور تازہ ہوا آسکے۔ مکانوں کے وہ حصے جہاں گائے، بیل اور بھینسیں باندھی جاتی ہیں عموماً بہت گندے رہتے ہیں ایسے حصوں کو اگر پختہ بنایا جائے۔ فرش ہموار اور ایک طرف کو نشیب دار رکھا جائے اور فرش سیمنٹڈ ہو تو صفائی کا خاطر خواہ انتظام ہو سکتا ہے۔ گاؤں کی نالیوں میں اور جانور باندھنے کی جگہ پر چونا اور فنائل کا استعمال بھی اہل دیہات کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اگر اس قسم کی اصلاحات جاری کردی جائیں تو گاؤں کے لوگ بھی زندگی کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔

وطن کی محبت

انسان جس جگہ رہتا بستا ہے اُسے اُس جگہ سے محبت ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے اُن سے اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔ جن گلیوں اور سڑکوں سے گذرتا ہے وہ اُس کے دل میں سما جاتی ہیں۔ یہی چیز وسیع ہو کر وطن کی محبت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

وطن کا تصور عام معنٰی میں وطن سے مراد وہ قصبہ یا شہر ہوتا ہے جہاں کوئی شخص پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ وطن کی ادنیٰ تعریف ہے۔ حقیقی معنٰی میں وطن کا تصور بہت وسیع ہے ایک قصبہ یا شہر، کمشنری یا صوبہ نہیں بلکہ پورا ملک انسان کا وطن ہوتا ہے۔ جس سے ہر انسان کو محبت ہونی چاہیئے۔ اور صرف اپنے قصبہ یا شہر کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مفاد عزیز رکھنا چاہیئے۔

مختلف اقسام مختلف لوگ اپنے وطن سے مختلف حیثیتوں سے محبت کرتے ہیں بعض اس حیثیت سے کہ چونکہ وہ اس شہر یا ملک میں پیدا ہوتے ہیں انھیں اس جگہ سے نسبت ہوتی ہے اور جس چیز یا جگہ سے کسی انسان کو نسبت ہو وہ اُسے ہر حال میں عزیز رکھتا ہے۔ بعض لوگ کسی شہر یا ملک سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ اُس کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، کچھ روایات ہوتی ہیں۔ جن پر انھیں فخر ہوتا ہے۔ وہ اُن خصوصیات اور روایات کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور کسی چیز یا روایت کی اُس وقت تک حفاظت نہیں ہو سکتی جب تک اُس سے حقیقی معنٰی میں محبت نہ ہو اور انسان اسے عزیز نہ رکھتا ہو۔ بعض لوگ اپنے وطن سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ انھیں غیر جگہ کے

مقابلے میں اپنے وطن میں آرام ملتا ہے۔ اُن کے دوست، عزیز اور رشتہ دار اُن کی نظر کے سامنے ہوتے ہیں۔ اپنے وطن میں اُن کا ایک مقام ہوتا ہے۔ اُن کے دکھ درد میں ساتھ دینے والے ہوتے ہیں۔ غرض وہ تمام آسانیاں حاصل ہوتی ہیں جو شہر یا غیر ملک میں مل سکتیں۔

وطن کے حقوق انسان جس شہر یا ملک میں پیدا ہوتا ہے اُسکے کچھ حقوق ہوتے ہیں جسطرح ایک شریف انسان اپنے محسن کی عزت کرتا ہے اُس کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرتا ہے۔ اپنی ماں اور باپ کا ہمیشہ احسانمند رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اُن سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ وہی اس کی پرورش کرتے ہیں۔ اُسکے دکھ درد کا خیال رکھتے ہیں۔ اُس کی تربیت کرتے ہیں لکھاتے پڑھاتے ہیں اور اس قابل کرتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نیک طینت شریف النفس اور سعادت مند انسان اپنے والدین کے احسانات ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ اور کوشش کرتا ہے کہ جن لوگوں نے میری خدمت کی مجھے کسی قابل بنایا میں بھی اُن کی زیادہ سے زیادہ خدمت کروں اور اُن کے آرام و آسائش کا خیال رکھوں۔ بالکل اسطرح ہر انسان کو اُس کے وطن سے بے شمار فائدے پہونچتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کی سرزمین پر پیدا ہوتا ہے۔ وطن کی آب و ہوا میں پرورش پاتا ہے۔ اپنے ملک کے دریاؤں، نہروں، درختوں، سبزیوں اور پھلوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اپنے وطن سے ہر قسم کا آرام اٹھاتا ہے۔ یہیں کھیل کود کر جوان ہوتا ہے۔ یہیں جوانی کی بہاریں لوٹتا ہے۔ یہیں تجربہ حاصل کرتا ہے اور یہیں بوڑھا ہو کر دوسروں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ایک شریف النفس انسان کی حیثیت سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ جس سرزمین سے فائدہ اُٹھا چکا ہے جب کسی قابل ہو تو اسے بھی فائدہ پہونچائے۔ اسے بنانے سنوارنے، اسے ترقی دینے اور اس کی حفاظت

کرنے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک صرف کر دے۔

حب وطن کی اہمیت وطن دوستی یا حب وطن کا جذبہ نہایت قابل قدر اور واجب الاحترام ہے ہر شخص کا فرض ہے کہ اس جذبہ کو زیادہ سے زیادہ ابھارے کیونکہ جس ملک کے رہنے والوں میں یہ جذبہ مفقود ہوگا وہ ملک کبھی ترقی نہیں کر سکے گا۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حب وطن کے بغیر حقیقی ترقی کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ترقی ہو۔ اگر ہم اپنے ملک سے حقیقی معنی میں محبت کرینگے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہم اپنے ملک کی ترقی کیلئے شب و روز محنت اور مستعدی سے کام کرینگے اور پھر ایک دن ایسا آجائیگا جب ہمارا ملک دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ ترقی کر جائیگا اور لوگ اسے رشک کی نظروں سے دیکھیں گے اور پھر ہماری تقلید کرنے کی کوشش کریں گے دوسرے الفاظ میں ہم دوسرے ممالک کیلئے قابل نمونہ ٹھیریں گے اگر ہمیں اپنے وطن سے حقیقی معنی میں محبت ہوگی تو ہم اس کی حفاظت کیلئے اپنی عزیز سے عزیز چیز قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرینگے۔ اگر کوئی دشمن ہمارے وطن کی پاک سرزمین کو پامال کرنے کیلئے بڑھیں گے ہم انہیں توڑ کر رکھدیں۔ اور جب دنیا کو معلوم ہوگا کہ اس ملک کے رہنے والے اپنے وطن عزیز سے بے اندازہ محبت کرتے ہیں تو وہ نہ صرف اپنے بد ارادے ترک کر دینگے بلکہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے اسطرح ہم وہ حقوق ادا کر دینگے جو وطن کی طرف سے ہم عائد ہوتے ہیں اور حقوق کی ادائیگی ہر ذمہ دار اور معزز آدمی کیلئے سب سے بڑا افتخار اور اعزاز ہے۔

جذبہ وطنیت کی پرورش

ان کو الفیہ پر نظر ڈالنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ حب وطن کا جذبہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور

ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ پرورش کریں
اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ فرض سب سے پہلے ماؤں پر عائد
ہوتا ہے۔ بچوں کا ذہن ابتدا میں آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے۔ اور بہت
آسانی سے ہر نقش اور عکس کو قبول کر لیتا ہے۔ اس لئے ماؤں کو چاہئیے
کہ وہ اپنے بچوں کو ایسے گیت، نظمیں اور کہانیاں سنائیں جو زیادہ
سے زیادہ حب وطن کا مادہ پیدا کر سکیں۔ اس کے بعد دوسرا فرض
ہمارے اہل قلم پر عائد ہوتا ہے۔ وہ اپنے ملک کے نونہالوں کیلئے
ایسی سبق آموز مگر دلچسپ کہانیاں اور کتابیں تصنیف کریں جنہیں
پڑھنے کے بعد ہمارے نونہال حب وطن کے مقدس جذبے سے سرشار
ہو جائیں۔ اور عملی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اپنے وطن کی حقیقی
معنی میں خدمت کر سکیں۔